روداد

کل ہند کانفرنس قانون

اجلاس اول

حیدرآباد - دکن

سنہ ۱۹۴۴ م

نظام ساور جوبلی پریس

۶ - ۱۹۴۵ف / ۵ - ۱۳۶۳

پتہ :- دفتر کل ہند کانفرنس قانون
بزم قانون جامعۂ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

فہرست مضامین

حصۂ اوّل

مضمون		صفحہ
۱- خطبۂ استقبالیہ۔	نواب عالم یار جنگ بہادر	۱
۲- خطبۂ افتتاحیہ و پیام شاہانہ۔	نواب سعید الملک بہادر	۵
۳- خطبۂ صدارت۔	سر عبد القادر	۱۱
۴- قرار داد عقیدت بحضور شاہانہ۔	کانفرنس	۲۴
۵- خطبہ۔	سر موریس گایر	۲۵
۶- خطبۂ صدارت۔	نواب میر اکبر علی خاں	۴۱
۷- تقریر	سر تیج بہادر سپرو	۴۷
۸- عدل گستری کے بنیادی اصولوں کا ارتقاء	مولوی محمد غوث	۵۱
- اسلامی قانون اور مملکت حیدر آباد	جسٹس میر باسط علی خاں	۷۷
- کوٹلیا کی ارتھ شاستر میں وزیر اعظم کے فرائض۔	پنڈت گنڈے راؤ	۱۰۱
- بلدی قوانین حیدر آباد کا ارتقا۔	مولوی محمد فاروق	۱۲۱
- ہندو قانون کی ماہیت۔	مولوی شیخ حیدر	۱۳۷
۱- رسم و رواج اور قانون۔	مولوی محمود عبد القدیر	۱۴۵
۱- نظام قانون میں فقہا کا مقام۔	ڈاکٹر میر سیادت علی خاں	۱۵۱

حصۂ دوم

مضمون		صفحہ
۱۵- روئداد کانفرنس۔	معتمد مقامی	۱۶۹
۱۶- اساسی قواعد و ضوابط کانفرنس۔	"	۱۷۷
۱۷- مجالس منتخب شدہ۔	"	۱۷۹
۱۸- قرار دادہائے منظورۂ کانفرنس۔	"	۱۸۰
۱۹- مجالس ذیلی	"	۱۸۳

حصۂ سوم

مضمون		صفحہ
۲۰- نمائش قانون۔	معتمد مقامی	۱۸۵

حصۂ چہارم

انگریزی — ۱۹۲ کے بعد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبۂ استقبالیہ کا اردو ترجمہ

(از آنریبل نواب عالم یار جنگ بہادر صدر المہام عدالت و امور مذہبی صدر مجلس استقبالیہ کل ہند کانفرنس قانون)

یور اکسلنسی - جناب صدر - اراکین کانفرنس و حضرات!

یہ امر میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ میں جامعۂ عثمانیہ کی جانب سے کل ہند قانون کانفرنس کے اراکین کا خیر مقدم کروں - میں نواب سر احمد سعید خاں کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کانفرنس کا افتتاح کرنے پر آمادگی ظاہر فرمائی اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کا دلی خیر مقدم کر کے میں آپ کے جذبات کی بھی ترجمانی کر رہا ہوں -

قانون پیشہ افراد نے امور عامہ میں جو نمایاں حصہ لیا ہے، اس سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی اسے بجائے خود اتنی اہمیت حاصل ہے کہ اب تک کل ہند اساس پر کسی کانفرنس کے منعقد کرنے کی کوشش نہ ہونا حیرت انگیز ہے - گزشتہ چار پانچ سال کے دوران میں برطانوی ہند میں اساتذۂ قانون یا وکلاء کی کانفرنسیں منعقد کرنے کی کوششیں کی گئیں ۔ ۱۹۲۹ء کے اوائل میں ہماری جامعہ کی بزم قانون نے معمولی پیمانے پر ایک مقامی قانون کانفرنس کے انعقاد کا ارادہ کیا تھا اور اس کا یہ مقصد تھا کہ اسے بہ تدریج ترقی دے کر ایک کل ہند ادارے کی حیثیت دیدی جائے چنانچہ پروگرام کی تفصیلیں تک طے ہو گئی تھیں لیکن یہ خیال اب تک عملی جامہ نہ پہن سکا -

ہم تاریخ عالم کے ایک نہایت نازک دور سے گزر رہے ہیں اور قانونی پیشے سے تعلق رکھنے والے اشخاص مختلف طریقوں سے اس میں جو حصہ لے چکے ہیں [illegible] بالکل

درست ہے کہ آیندہ کے لئے ایک بہتر عالمی نظام کی تشکیل میں بھی وہ معقول حصہ لیں۔ اس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ ہے کہ مقننہ، درسگاہ، عدالت اور وکلاء سب کے لئے متحدہ اور جداگانہ کوششوں کے یکساں مواقع فراہم کئے جائیں چنانچہ یہ سب جس قدر زیادہ مواقع پر مجتمع ہوسکینگے اتنا ہی سب کے حق میں مفید ثابت ہوگا۔

سرزمین دکن بڑے بڑے قانون دانوں اور مقننوں کا گہوارہ رہی ہے اور ہندو دور، مُسلم دور اور جدید دور ہر عہد میں اس کی یہ خصوصیت کم رہی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں صرف متاکشرا اور تاتارخانیہ کے مصنفوں کا میں نام لینا ہی کافی سمجھتا ہوں۔ ہمیں اس اعتبار سے بھی تمام ہندوستان پر فوقیت حاصل ہے کہ حکومت سرکار عالی نے ادنیٰ ترین عدالتوں سے لے کر اعلیٰ ترین عدالتوں تک عدلیہ کو عاملہ سے بالکل علیحدہ کر دیا ہے۔ ہماری جامعہ میں قانون کے مطالعے کی پوری طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ہندوستان کی اہم ترین زبان میں قانونی لٹریچر فراہم کیا جا رہا ہے جو قانون کے مطالعے کو عام کرنے کی جدوجہد میں بُنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ دائرۃ المعارف کی جانب سے قانونی کتابوں کے قدیم اور نادر قلمی نسخے شائع کئے جا رہے ہیں جنہیں تمام دُنیا کے مستشرقین نے قابل قدر تسلیم کیا ہے۔ اور مجلس احیاء المعارف النعمانیہ نے بھی اس اعتبار سے کافی شہرت حاصل کر لی ہے کہ وہ مسلمان ماہرین قانون کی ایسی کمیاب کتابیں جمع اور ایڈٹ کر رہی ہے جو ایک مدت سے تمام دُنیا میں نایاب خیال کی جاتی تھیں۔

یہ کانفرنس اس اعتبار سے بہت خوش قسمت ہے کہ اسے ابتدا ہی سے پشاور، لاہور، بغداد الجدید، کراچی، بمبئی، دہلی، الہ آباد، پٹنہ، کلکتہ، ڈھاکہ، ناگپور، مدراس اور ٹریونڈرم کے ممتاز قانون دانوں کی تائید حاصل رہی اور سر موریس گایر، سر سی پی راماسوامی ایر، سر عبدالقادر اور سر تیج بہادر سپرو جیسے سر برآوردہ اصحاب ازراہ عنایت اس میں حصہ لے رہے ہیں۔ اور ان کے علاوہ ایسے اشخاص بھی کثیر تعداد میں ہیں جنہوں نے اس کانفرنس کے انعقاد کے خیال کو پسند کیا اور ہر طرح سے حوصلہ افزائی فرمائی۔ اہم غیر متوقعہ مصروفیات کی بنا پر بعض حضرات اس کانفرنس میں

شریک نہیں ہوسکے ہیں چنانچہ ہمیں سر موریس گایر اور سر سی پی راما سوامی ایر کی عدم شرکت کا خاص طور پر افسوس ہے۔ سر موریس گایر تو اس کانفرنس میں افتتاحی تقریر بھی فرمانے والے تھے لیکن علالت کی وجہ سے مجبور ہو گئے۔ تاہم ان کا خطبہ ہمارے پاس آگیا ہے جسے کچھ دیر کے بعد آپ سُننے کی مسرّت حاصل کرینگے۔ سر سی پی راما سوامی ایر نے بھی اپنا نشست واری خطبہ روانہ کیا ہے جو آج سہ پہر کی نشست میں سُنایا جائیگا۔ سر عبدالقادر کی ذات میں کشش اور جاذبیت اور قانونی قابلیت مسلمہ ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کی صدارت میں یہ کانفرنس ایسے نتائج پر پہنچ سکیگی جو اس پیشے کے حق میں بہت مفید ثابت ہونگے۔

میں آپ سب کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مملکت آصفیہ اور تمام ہندوستان کے دور دراز مقامات سے تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ جنگ کے پیدا کردہ مشکلات کی وجہ سے لازمی طور پر بہت سی خامیاں رہ گئی ہیں اور اگر آپ کو بہ دوران قیام کچھ تکلیف ہو تو مجھے یقین ہے کہ آپ ہمیں معاف فرمائینگے۔ ہم آپ سب کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ اس کانفرنس نے کئی دوستوں کو یکجا کر دیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے بھی باہم ایسی دوستی پیدا ہو جائیگی جو ہمیشہ برقرار رہے گی۔

میں اب آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا اور نواب سر احمد سعید خاں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کانفرنس کا افتتاح فرمائیں جس کی سرپرستی اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے بمراحم خسروانہ قبول فرمائی ہے۔ خدا ہمارے شاہ ذی جاہ کی عمر و اقبال میں ترقی دے۔ آمین۔
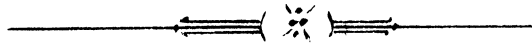
خطبۂ افتتاحیہ

از ہز اکسلنسی نواب ڈاکٹر سر احمد سعید خاں سعید الملک بہادر
امیر جامعہ عثمانیہ و صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

سب سے پہلے میں اعلیحضرت بندگانعالی کا

وہ پیام سنانے کی عزت حاصل کرتا ہوں جو

شاہ ذیجاہ نے بمراحم خسروانہ اس موقع کیلئے

مرحمت فرمایا ہے۔ آئیے ہم سب کھڑے ہو کر

پیام ہمایونی کو سُننے کی سعادت حاصل کریں:۔

"میں کل ہند قانونی کانفرنس کے پہلے جلسہ کو پیغام تہنیت بھیجتا ہوں۔ میری مملکت میں عاملہ عدلیہ سے بالکل علیحدہ ہے اور یہ میری حکومت کے نظم ونسق کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ عدالت العالیہ کو میرے ایک منشور کے تحت جو وقعت اور خودمختاری عطا ہوئی ہے اسکی بنا پر اس نے ممالک محروسہ کی اعلیٰ ترین عدالت کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں قانون کے درس وتدریس کے لئے ایک خاص شعبہ قائم کردیا گیا ہے جو نہ صرف محکمہ عدالت بلکہ طبقہ وکلاء کیلئے بھی موزوں افراد فراہم کر رہا ہے اور عدالتی حکام و وکلاء کے درمیان خوشگوار تعلقات ہمیشہ قایم رہے ہیں۔

"عدالتی نظم ونسق اور مطالعۂ قانون کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ قانون کا راج قائم کیا جائے جو کہ لازمی طور پر ہر ایک نظم ونسق کی اساس ہوا کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قانون اور اس کے مختلف پہلوؤں کے مطالعہ کو فروغ دینے اور تبادلہ خیالات کا ذریعہ بننے کے اعتبار سے یہ کانفرنس نہ صرف قانونی تعلیم کو مقبول بنانے بلکہ کسی قوم کی زندگی میں اسکی اہمیت کا پورا احساس پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہوگی"۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پیغام نہایت فیض آفرین ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس کانفرنس کی جانب سے اس رہنمائی اور حوصلہ افزائی کا صدق دل سے اعتراف کریں جو ہمارے سرپرست نے اس پیغام کے ذریعہ فرمائی ہے۔ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم بارگاہ رب العزت میں اپنے شاہ ذیجاہ کی عمر و اقبال میں ترقی کے لئے دست بدعا رہیں۔

صدر صاحب مجلس استقبالیہ نے میرا جو گرم جوشانہ خیر مقدم فرمایا ہے اس کے لئے میں ان کا شکر گذار ہوں۔ آپکے اس اجتماع میں شرکت میرے لئے موجب مسرت ہے۔ کل ہند پیمانہ پر قانونی کانفرنس کے انعقاد کا تصور نہایت قابل قدر ہے اور اس کانفرنس کے لئے اس مقام کا انتخاب بھی بہت موزوں ہے کیونکہ یہاں عاملہ اور عدلیہ میں کامل علٰحدگی کی وجہ سے عدالت کو اس کا حقیقی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے۔

"قانون کا ایک متحرک تصور ہونا ضروری ہے"

آپ حضرات قانونی پیشہ سے متعلق ہیں اور خواہ آپ کا تعلق عدالت سے ہو یا طبقۂ وکلاء سے یا آپ کسی درسگاہ میں قانون کی تدریس یا مطالعہ میں مصروف ہوں آپ اس مضمون کی اہمیت یا ایسے پیشہ کی ناگزیر نوعیت کی صراحت کے محتاج نہیں جو ایک منظم معاشرے میں افراد یا جماعتوں کے طرز عمل کا تعین کرنے والے انسانی حقوق و فرائض کے کسی تحریری ضابطہ کا نفاذ یا تاویل کرتا ہو۔ تاہم ایک عامی یا شہری یا نظم و نسق کا کچھ تجربہ رکھنے والے کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ قانون کا اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ افراد اور معاشرے کو مربوط رکھے ان کے باہمی تعلقات کی صراحت اور تعین کرے اور انہیں برقرار رکھے اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات ملحوظ رکھے اور ان میں جو تبدیلیاں واقع ہوں انہیں منعکس کرتا رہے۔ یعنی قانون ساکن نہیں ہوتا۔ اور اگر اسے کسی معاشرے کی تنظیم کا موثر ذریعہ بنانا مقصود ہو تو اس کا ایک متحرک تصور ہونا ضروری ہے۔ اگر قانون کے نفاذ و تاویل میں اس تصور کو ملحوظ رکھا جائے اور اسی خیال کے مطابق قانون بنایا

جائے تو وہ معاشرتی ترقی کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔

ہم آہنگی پیدا کرنے میں قانون کا حصہ

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ قانون بھی ایک قسم کی عبارت پرستی ہے جو الفاظ کے الٹ پھیر پر منحصر ہے یا ایک ایسا راز ہے جسے صرف وہی طبقہ سمجھ سکتا ہے جو اس خاص مقصد کے لئے وجود میں آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر خود قانون سازی غلطی پر نہ ہوں تو قانون بھی عام شعور پر اتنا ہی مبنی ہوتا ہے جتنا کہ کوئی اور موضوع بشرطیکہ فنی اصول سے ضروری واقفیت ہو جو کہ دوسرے تمام پیشوں کے لئے بھی ضروری ہے۔ چنانچہ میرا یہ خیال ہے کہ قانونی تربیت عام شعور کو زیادہ بیدار کر دیتی ہے اور انسانوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے یہ بیش بہا سبق دیتی ہے کہ کسی مسئلہ کے ایک سے زیادہ پہلو ہو سکتے ہیں۔ اور ہر پہلو میں محض مباحثی نکات سے زیادہ اہم چیزیں بھی مضمر ہوتی ہیں۔ میں اس ذہنی تربیت کو قانونی پیشہ سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی سرگرمیوں کا تعمیری جزء سمجھتا ہوں جو صرف اسی پیشہ تک محدود نہیں رہتیں بلکہ ان کا دائرہ عمل وسیع تر ہوتا ہے اور ان میں سیاسی یا معاشری یا قومی زندگی کی تشکیل کرنے والی دوسری سرگرمیاں داخل ہوتی ہیں۔ اس اعتبار سے ہندوستان خاص طور پر اپنی ترقیات کے لئے وکلاء کی جد و جہد کا مرہون منت ہے۔ خود ہماری مملکت میں بھی وکلاء ہمارے روشن خیال طبقہ کا ایسا حصہ ہیں جن پر یہاں کی قومی زندگی مفاد عامہ کی خدمت کیلئے روز افزوں اعتماد کر سکتی ہے۔

آزاد اور غیر جانب دار

حضرت بندگان اقدس نے قانون کے اقتدار کے تصور پر بجا طور سے زور دیا ہے جو حکومت اور مطالعہ قانون دونوں کی اساس ہے اور لازمی طور پر ہر ایک نظم و نسق کی بنیاد ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسا تصور جو ہر ایک فرد اور جماعت کے حقوق و فرائض کا اس طرح تعین کرے کہ گویا وہ ایک آزاد اور غیر جانب دار عادل ہے جو کسی شخص کو اپنے اقتدار اور دائرۂ عمل سے مستثنیٰ نہیں کرتا خواہ اس کا تعلق کسی طبقہ یا فرقہ سے کیوں نہ ہو یقیناً ایک ایسا شاندار تصور ہے جسے حاکم اور محکوم ہر دو کو

ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ حکام عدالت اور وکلاء دونوں پر یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ اس تصور کو قائم رکھنے میں اشتراک عمل کریں اور ملک کے مختلف جامعات و کلیات میں جو لوگ قانون کی تعلیم دیتے ہیں ان پر بھی یہ واجب ہے کہ وہ اس تصور کی اہمیت کو زیادہ سے زیادہ محسوس کریں۔ جامعہ عثمانیہ نے قانونی مطالعہ کے ضمن میں بہت کچھ کام انجام دیا ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ کام کرنا باقی ہے اور مجھے یقین ہے کہ جامعہ کے ارباب اقتدار ایک ایسے علمی شعبہ پر زیادہ سے زیادہ توجہ کریں گے جس کا عوام کی فلاح و بہبود سے قریبی تعلق ہے۔

میں نہایت مسرّت کے ساتھ اس کانفرنس کا افتتاح کرتا ہوں اور اس کے مباحث کی کامیابی کا متمنی ہوں۔
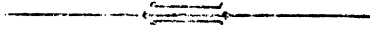
خطبہ صدارت

از آنریبل سر عبدالقادر چیف جسٹس بغداد الجدید

صدر عمومی کُل ہند کانفرنس قانون اجلاس حیدرآباد

میں اس پر پُرخلوص طور سے شکرگزار ہوں کہ کل ہند کانفرنس قانون نے مجھے اس کانفرنس کی صدارت کے لئے مدعو کرکے میری عزت افزائی کی ہے لیکن مجھے عمیق رنج کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ ایک افسوس ناک سبب نے سر موریس گائر جیسے ممتاز قائد پیشۂ قانون کو آج کے اہم موقع پر ہمارے ساتھ موجود ہونے سے روک دیا ہے اور یہ ان کی علالت ہے۔ وہ اس غرض کے لئے آرہے تھے کہ اس کانفرنس کی کارروائیوں کا افتتاح کریں اور ہمیں اس بات میں مدد دیں کہ اپنے کام کو صحیح راستہ پر شروع کریں۔ ان کی عاجلانہ صحت یابی کے لئے ہم دست بدعا ہیں۔ وہ ان چند منتخب لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اپنے پیشے کو (جس سے اس کانفرنس میں شریک ہونے والوں کی اکثریت تعلق رکھتی ہے) چار چاند لگا دیے۔ سر موریس نے قیام ہندوستان کے دوران میں نہ صرف وفاقی عدالت کی بنیادیں رکھیں بلکہ انہوں نے اس ملک میں اعلیٰ تعلیم کی ترقی سے بھی گہری دلچسپی لی ہے۔ ہندوستان کے کسی اور ادارے کے مقابلہ میں یہاں کی جامعات میں ان کے لئے بہت زیادہ کشش رہی ہے۔ جامعہ دہلی نے ان کی مشفقانہ نگرانی اور رہنمائی میں تیز ترقی کی ہے۔ مجھے شوق سے اس کا انتظار تھا کہ جو کام آپ نے اپنے آگے رکھا ہے اس میں آپ کے لئے برکات ایزدی حاصل ہونے میں ان کے ساتھ میں بھی شریک دُعا رہوں لیکن میں آپ سب کے ساتھ اس مایوسی میں حصہ دار ہوں کہ ناگزیر وجہ سے آج وہ یہاں موجود نہیں ہیں لیکن ہمیں ان کے مشورے تحریراً حاصل رہینگے اور ہمیں توقع ہے کہ

ان کا خطبہ وصول ہوگا جس سے ہمیں ان کی نیک تمناؤں اور ان کی تائید کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

مجھے خوف ہے کہ آپ نے مجھے صدارت کے لئے مدعو کرنے میں ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جس نے وکیل اور حاکم عدالت کی حیثیت سے نسبتہً منکسر الحال خدمات انجام دیے ہیں۔ آپ کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ کوئی عالمانہ خطبۂ صدارت حاصل ہوگا۔ میں صرف چند الفاظ میں یہ ظاہر کرونگا کہ اس کانفرنس کے متعلق میرے کیا احساسات ہیں۔ کانفرنس نے اولاً مجھ کو جو دعوت دی وہ یہ تھی کہ کانفرنس کی نشستوں میں سے ایک کی صدارت کروں۔ میں نے اس سے خیال کیا تھا کہ مختلف شعبہ ہائے قانون کے متعلق نہایت قابل افراد کی طرف سے لکھے ہوئے مقالوں کو سُننے کا موقع ملے گا۔ اور میں یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ کرسئی صدارت میں آرام سے گزرے گی۔ لیکن اسی اثنا میں آپ کی دوسری دعوت تار کے ذریعے سے پہنچ کر میری اس توقع کو پامال کر دینے کا باعث بنی۔ میں نے خیال کیا کہ اس کانفرنس کی خدمت ایک فریضہ ہے، اس لئے انکار کرنا نامناسب ہوگا۔ بنا برآں میں یہاں حاضر ہوں۔

میں سب سے پہلے بانیان کانفرنس کو ان کی اس کوشش پر مبارک باد دینا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ارکان پیشۂ قانون کو اس غرض کے لئے جمع کیا جائے کہ اس شریف پیشے کو استحکام حاصل ہو اور مختلف مرکزہائے علم میں قانون کی جو تعلیم ہو رہی ہے اس میں ہم آہنگی و ربط پیدا کیا جائے نیز مختلف شعبوں میں تحقیقاتی جذبے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ امر قابل مسرت ہے کہ اس کا اقدام حیدرآباد کی طرف سے ہوا ہے۔ ہماری کانفرنس اپنی نوعیت کی پہلی نہیں ہے جو یہاں منعقد ہو رہی ہو۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے اس خوبصورت پائے تخت میں حال میں جامعات ہند کی کانفرنس بھی ہوئی۔ اس نے سائنس، تاریخ اور فلسفے کی کانفرنسوں اور کانگرسیوں کو بھی مدعو کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ

یہ کارکردگیاں نیز دیگر اصلاحات حیدرآباد کو اس بات کا مستحق بنا دیتی ہیں کہ اسے ہندوستان کی سب سے زیادہ ترقی پسند ریاستوں میں سے ایک تصور کیا جائے۔ ہندوستان کی سب سے زیادہ وسیع طور پر بولی جانے والی زبان کو جامعۂ عثمانیہ میں ذریعۂ تعلیم بناکر ملک کے دیگر حصوں کی جو رہنمائی کی گئی ہے اس سے ثابت ہوچکا ہے کہ ہمارے مادر وطن کی بہبودی پر اثر انداز ہونے والے مسائل میں حیدرآباد کا نقطۂ نظر دور اندیشی اور عقلمندی کے خصوصی اوصاف سے متصف ہے۔

آپ اہل حیدرآباد خوش قسمت ہیں کہ ہر مفید مقصد کے لئے آپ کو اپنی حکومت سے مدد ملنی ممکن ہوتی ہے جو ہر اچھے کام سے ہمدردی دکھانے آمادہ ہوجاتی ہے۔ حیدرآباد کے حکمران طویل عرصے سے علم و ادب کی سرپرستی کے لئے شہرت رکھتے آئے ہیں اور آپ اپنے موجودہ محترم فرمانروا جلالت مآب حضور نظام کی ذات میں ایک ایسا محسن رکھتے ہیں جس نے علم کی خاطر فیاضانہ عطایا سے سُلطان العلوم کا لقب حاصل کرلیا ہے جو ان پر خوب پھبتا ہے۔ حیدرآباد کو اس بات کی بھی خوش نصیبی حاصل رہی ہے کہ یہاں سالار جنگ اول کے وقت سے مسلسل دانش و ثقافت کے حامل وزرائے اعظم ہوتے رہے ہیں۔ یہاں کے مدبرین اعظم میں سے تازہ ترین مہاراجہ سر کشن پرشاد آنجہانی اور رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کا نام لیا جاسکتا ہے۔ آپ کے موجودہ صدر اعظم ہز اکسلنسی نواب کرنل سر محمد احمد سعید خاں، نواب چھتاری وہ فرد ہیں جنہوں نے برطانوی ہند میں تدبیر سیاست کے سلسلے میں خراج تحسین حاصل کیا تھا اور اب حیدرآباد کی کشتیٔ نظم و نسق کے سُکان کے حامل ہونے سے سرفراز ہیں۔ انہوں نے اپنے ممتاز پیش روؤں کے روایات کو کامیابی سے جاری رکھا ہے اور ہر اچھے مقصد میں مدد دینے کے لئے مستعد ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی سرپرستی میں پہلی کل ہند کانفرنس قانون وجود میں آئی ہے اور اس کے مستقبل اور استحکام کے متعلق یہ نیک فال ہے۔ یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ برطانوی صوبوں کی

حکومت ہی کی طرح ہندوستانی ریاستوں میں بھی عدالتی نظم ونسق کو بلند معیار پر برقرار رکھنے سے عظیم دلچسپی ہے کیونکہ رعایا کا اطمینان کسی اور عامل کے مقابلے میں سب سے زیادہ اسی پر مبنی ہے۔ یہ کانفرنس اپنے ذمے اس کام کو لے سکتی ہے کہ ہندوستان کی بڑی ریاستوں کی عدالت ہائے عالیہ کے اچھے فیصلوں کا انتخاب شائع کیا جائے۔ جہاں تک حیدرآباد کا تعلق ہے، اس کے ہاں کے فیصلوں کا انگریزی ترجمہ کرانا ہوگا اور کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کے عدالت ساز" قانون کے ذخیرے میں آپ کی عدالت العالیہ کے فیصلوں سے کوئی اچھا اضافہ نہ ہو۔ آپ کی نمائش میں مولوی میر باسط علی خاں نے ایک نفیس نقشہ تیار کر دکھایا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلالت مآب حضرت آصف سابع کے دور میں عدالتی نظم و نسق نے کتنی عظیم ترقی نہ کی ہے۔ اس دور پر آپ سب کا فخر کرنا ہر طرح بجا ہے۔ میں آج کل شمالی ہند میں بغداد الجدید میں کارگزار ہوں اور اعلیحضرت فرمانروائے بہاولپور کی حکومت کو بھی میں نے عدالتی نظم ونسق کی اصلاح و ترقی کا ویسا ہی شائق پایا جیسا کہ کسی اور حکومت کو۔

آج جو مجمع یہاں جمع ہے وہ زیادہ تر ایسے افراد پر مشتمل ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں قانون کے مطالعے یا اس کی پریکٹس کے لئے وقف کر دی ہیں۔ اس لئے مجھے ان کے سامنے شاید ہی اس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ قانون کا مطالعہ بحیثیت ایک موضوع کے کس قدر اہمیت رکھتا ہے یا کسی ملک کے امن و مرفہ الحالی میں اس کی کتنی عظیم قدر و قیمت ہے۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ متمدن بنی نوع انسان کی تاریخ کے آغاز ہی سے آدمی کا علوم و فنون میں ترقی کرنا اور مملکت کے نظم ونسق کو بہتر بنانا اسی امر پر مبنی رہے ہیں کہ قانون پایا جاتا ہو اور لوگ اس کے احکام کی تعمیل پر آمادہ رہے ہوں۔ اسی وجہ سے جو افراد قانون کی مہارت رکھتے اور اس کی صحیح تعبیر یا اس کے قواعد کا "عدل واحسان" کے ساتھ اطلاق کرنے کی قابلیت رکھتے تھے، ان کو ہر زمانے میں بڑا اثر ورسوخ حاصل رہا ہے۔ پرانے زمانے میں بھی قانون دانوں کو ان مملکتوں میں بڑی وقعت وعزت حاصل رہی ہے

جہاں وہ رہے ہوں اور آج بھی یہی حال ہے۔ یورپ اور امریکہ کی بہت سی انتہائی ترقی یافتہ مملکتوں میں ممتاز قانون دان ہی وہاں کے ارباب حل و عقد و قانون ساز رہے ہیں اور ہمارے ملک میں بھی یہی حال ہے۔ جب سے ہند میں برطانوی راج قائم ہوا ہے، محکمہ قانون وانصاف رسانی ہی ایک محکمہ ہے جس کی اہمیت میں اضافہ ہوا ہے۔ یہی وہ محکمہ ہے جو سب سے پہلے قابل ہندوستانیوں کے لئے کھول دیا گیا اور اسی میں ہندوستانیوں نے سب سے پہلے اپنا سکہ بٹھایا۔ گزشتہ صدی کے نصف دوم اور موجودہ صدی کے آغاز سے ہندوستان نے وکلاء اور حکام عدالت کا ایک ایسا جھرمٹ پیدا کیا ہے جس پر کوئی بھی ملک ناز کر سکتا ہے۔ کسی ملک یا مملکت میں مستحکم حکومت کی بقا و دوران میں مدد دینے کے لئے بے رو رعایت انصاف کا ایک نظام قائم کرنے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ کسی ملک کے حکام عدالت جتنا زیادہ سختی اور ناطرفداری سے آئین پسندی کا نفاذ کریں اتنا ہی زیادہ لوگ اس حکومت پر اعتماد کرتے ہیں جس کے تحت وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو لوگ کسی ملک کی عدالتوں میں قانون کی پریکٹس کرتے ہیں وہ عدالتوں کے صحیح طور پر اپنے فرائض انجام دینے اور محکمۂ عدالت کو کامیاب بنانے میں اتنے ہی موثر عامل ہیں جتنے وہ جو کرسیٔ عدالت پر متمکن ہوتے اور انصاف جویوں کی قسمتوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔

اوپر بیان کردہ امور ہی کو پیشۂ قانون کے چلانے والوں کے فائدہ رساں وظائف فرائض نہیں سمجھ لینا چاہیئے بلکہ قدیم زمانوں سے قانون داں رعایا کی آزادی کے اعزازی محافظ بھی رہے ہیں۔ جب وہ قانون ساز کی حیثیت میں کسی ملک کے قوانین کا مسودہ تیار کرتے ہیں تو ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ انتہائی ممکنہ احتیاط کو کام میں لاکر کسی قانون یا مجموعۂ قوانین کے الفاظ میں یا کسی قاعدے یا حکم کی تدوین میں غلطی سے کوئی ایسی چوک نہ ہو جانے دینگے جو نصفت و معقولیت کے اصول کے مغائر ہو یا جس سے رعایا کی آزادی میں ناواجبی طور پر دخل دہی عمل میں آتی ہو۔ کسی مسودۂ قانون پر تنقید کرتے ہوئے بھی قانون داں قابل قدر

مدد دے سکتے ہیں۔ اس طرح کا کام عام طور پر تجربہ کار اور مشہور قانون داں انجام دیتے ہیں لیکن اس پیشے کے نوعمر تر اور حقیر تر افراد بھی اس کام کو قابلِ لحاظ کامیابی سے انجام دے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ کسی مجوزہ قانون کی خوبیوں اور خامیوں کی جانچ کے لئے وقت اور فکر صرف کریں۔ اسی طرح عدالتی نظم و نسق کے صحیح طور پر چلائے جانے میں قانون دانوں سے چاہے وہ بوڑھے ہوں یا نوعمر، جس مدد کی توقع کی جاتی ہے اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ان کے اس پیشے میں ہونے کی مدت یا ان کی ماہانہ آمدنیوں ہی پر منحصر ہو بلکہ وہ ان کے احساسِ فرض و ذمہ داری اور ان کی ایمان داری و بے لوثی پر منحصر ہوتی ہے۔

مادرِ وطن کی خدمت کے متعلق بعض حلقوں میں جو خیالات پائے جاتے ہیں ان کی کسی قدر اصلاح و ترمیم کی حاجت ہے۔ میں ان لوگوں میں سے ایک ہوں جو یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی ملک کا ہر باشندہ جو اپنے فرائض کو (خواہ اس نے خود اپنے ذمے لئے ہوں یا اس کے سپرد کئے گئے ہوں) ایمانداری اور مناسب احتیاط سے انجام دیتا ہے وہ اپنے ملک کی قابلِ قدر خدمت انجام دینے والا سمجھا جائیگا۔ خواہ اس کے فریضے کا دائرہ کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو۔ جو وکیل اپنے موکل کو ایمانداری سے یہ مشورہ دیتا ہے کہ کسی مقدمے کے چلانے سے (جس میں کامیابی کی توقع نہ ہو) باز آجائے، یا جو کسی سچے مقدمے میں لڑتا اور کسی متضرر کو انصاف حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس کا لحاظ نہیں کرتا کہ اسے جس کے انجام دادہ کام کا جو معاوضہ مل رہا ہے وہ کافی ہے یا نہیں، وہ نہ صرف اپنے موکل کی خدمت کرتا سمجھا جائیگا بلکہ اپنے ملک کی بھی کیونکہ وہ انصاف رسانی میں مدد دیتا اور بے انصافی کے امکانات گھٹاتا ہے۔ اسی طرح جو قانون داں عدالت کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے مقرر ہوتا ہے وہ بھی اپنے ملک کے مفاد کی خدمت کرتا سمجھا جائیگا اگر وہ انصاف رسانی کی کوشش میں حتی المقدور احتیاط سے کام لیتا ہو۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس کانفرنس کے اہم مقاصد میں سے ایک یہ ہوگا کہ اس علمی پیشے کے جملہ افراد میں اس کی عظمت اور اس کی ذمہ داریاں اور خصوصی امتیازات ذہن نشین کئے جائیں۔

معاشی احتیاج کے دباؤ اور ضرورت کے تحت نیز تنازع للبقا کی ترقی پذیر دشواریوں کے مدنظر بہت سے مقامات کے وکالت پیشہ لوگوں میں یہ رجحان پایا جاتا ہے اچھے یا برُے جس طریقے سے بھی ہو روپیہ کمایا جائے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اس پیشہ کا وقار عام طور پر پست ہو گیا ہے اور اس طرح وکیلوں کی شہرت بہ حیثیت جماعت متاثر ہو گئی ہے ہماری عدالت ہائے عالیہ نے اصلاح کی کوششیں کی ہیں کہ اس رُجحان کی حوصلہ شکنی کے لئے قواعد آداب وضبط نافذ کریں اور چند قصورواروں کو سزا دیں لیکن اصلاح اُس وقت زیادہ موثر ہوتی ہے جب وہ اندر سے اُبھرے نہ کہ باہر سے اس پر عاید کی جائے۔ جہاں کہیں انجمن ہائے وکلاء نے اصلاح کی ضرورت خود محسوس کی اور جہاں کہیں ارکان پیشہ کی رائے عامہ نے قواعد وآدابِ پیشہ کی خلاف ورزی کرنے والوں پر اپنا دباؤ خود ڈالا ہے تو ایسے مقامات پر نتائج زیادہ قابل اطمینان رہے ہیں اگر قانون دانوں کا یہ کل ہند ادارہ ملک کی انجمن ہائے وکلاء کو یہ بات سُنانے میں کامیابی حاصل کرے اور ہر جگہ کے وکلاء کی ضمیر کو تندہی سے اس پر آمادہ کر سکے کہ جس بلند معیار کے پیشہ ورانہ کردار کی اُن سے توقع کی جاتی ہے اس تک وہ اپنے آپ کو بلند کر لیں تو یہ ملک کی بحیثیت مجموعی ایک قابلِ ذکر خدمت ہوگی اور جس کی قدر وقیمت کتنی بھی کہی جائے وہ کم ہی ہوگی۔

آپ کا یہ ارادہ ہے کہ اس طرح کی کانفرنسیں میقاتی طور پر منعقد کیا کریں اور یہ تجویز کی گئی ہے کہ ہر دو سال بعد ایک کانفرنس کا انتظام ہو کانفرنس کسی بھی علمی مرکز میں منعقد ہو سکتی ہے جہاں سے کہ اُسے دعوت دیجائے یہ ایک کل ہند کانفرنس ہے یعنی اُس کے ارکان ہندوستان کے طول وعرض سے آپ کی دعوت پر آکر یہاں جمع ہوئے ہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ موجودہ اجلاس میں جنوبی ہند کے نمایندے زیادہ ہیں اور شمالی ہند کے لوگ اُس وقت زیادہ تعداد میں جمع ہوں گے جب آپ شمالی ہند کے کسی شہر میں جلسہ کریں۔ اس کانفرنس کو کل ہند حیثیت مکمل طور پر دلانے کے لئے شدید کوششوں کی ضرورت ہوگی۔ اس کانفرنس کے

جو اغراض و مقاصد ہیں اُن میں سے تیسرے اور چوتھے کا خاص طور پر ذکر نا ہے۔ نمبر ۳ کے تحت یہ ارادہ ہے کہ قانون کی تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور نمبر ۴ کے تحت یہ خواہش کیگئی ہے کہ قانونی تعلیم کے معیار کو ترقی دی جائے ان دونوں میں سے آخرالذکر زیادہ اہم ہے۔ مجھے اس کا تو موقع نہیں ملا کہ جامعۂ عثمانیہ میں قانون کی تعلیم کا جو انتظام ہے اس کا مشاہدہ کروں لیکن میں نے بعض دیگر مقامات کو دیکھا ہے اور میں یہ کہنے کی جرات کر سکتا ہوں کہ متعدد مقامات پر قانون کی تعلیم کے انتظامات میں ترقی کی گنجائش ہے۔ حالیہ سالوں میں کلیات قانون میں اصلاحیں کی گئی ہیں لیکن پھر بھی وہ کلیات فنون و سائنس کے معیار پر نہیں پہنچے اسکو زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ بعض ایسے کالج پائے جاتے تھے جن میں قانون کی تعلیم ایک فرسودہ نظام کے تحت دیجاتی تھی کہ ایک ایسا قانون دان جسکے معلومات اپنے موضوع کے متعلق پرانے ہو چکے ہوں کمرۂ جماعت میں اپنے لکچروں کا ایک پُرانا مسودہ لائے اور اُس کو خوابیدہ انداز میں خوابیدہ تر سامعین کے سامنے پڑھنا شروع کر دے اور یہ سہ پہر کے آخری گھنٹوں میں ہو۔ اس طرزِ عمل کی بنیاد یہ تھی کہ طلباء کی اکثریت اپنے مطالعہ کا اصل حصّہ کتب خانہ ہائے قانون میں انجام دے اور لکچروں کا منشاء یہ ہو کہ طلباء نے اپنے مطالعہ سے جو معلومات حاصل کر لئے ہیں اُن کا تکملہ کیا جائے۔ اس نظام کی خامی کے باوجود چند ذہین طلباء محض اپنی محنتوں کی وجہ سے اچھے رہتے تھے لیکن مابقی کثیر تعداد جب کالجوں سے باہر آتی تو اُسے قانون کے اصول پر کوئی مستحکم قابو حاصل نہیں رہتا تھا۔ امتحانات کامیاب کر لینے کے بعد وہ زیادہ تر درسگاہِ تجربہ میں کچھ سیکھتے تھے اور اگر اُن میں کوئی واقعی صلاحیت ہوتی تو پیشۂ وکالت میں وہ اچھے رہتے۔ حال حال سے اس میں قابل لحاظ اصلاح ہوگئی ہے لیکن پھر بھی صورت حال پوری طرح قابلِ اطمینان نہیں کہی جاسکتی۔ ہندوستان کے کلیات قانون میں آجکل باقاعدگی سے لکچر دیئے جاتے ہیں اور لکچروں کی حاضری کم از کم کثیر فیصد تعداد میں لازمی ہے تعلیم باقاعدگی سے ہوتی ہے اور داخلی امتحانات

بھی ہوتے ہیں۔ بزم ہائے قانون بھی ہیں اور مباحثہ اور مصنوعی عدالتیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔ پھر بھی پرانے نظام کا ایک حصہ اب تک باقی ہے بہت سے کالجوں میں جزوقتی اساتذہ ہیں جو اوقات عدالت سے پہلے یا بعد اپنے حسب سہولت لکچر دینے آتے ہیں اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ وکالت پیشہ قانون دانوں میں سے جس کسی کو معقول آمدنی ہو حقیر تنخواہ پر ہمہ وقتی لکچرار بن کر کام کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا اور اس لئے کلّیات قانون مجبور ہیں کہ چند ایسے لوگوں کو جنہیں قانون سے اچھی عملی واقفیت ہو جزو وقتی اساتذہ کے طور پر مامور کریں۔ اس کا ایک بدیہی علاج یہ ہے کہ زیادہ کارکرد ہمہ وقتی اساتذہ کیلئے زیادہ بڑی تنخواہیں پیش کیجائیں بشرطیکہ اداروں کے پاس مطلوبہ مالی وسائل فراہم ہو جائیں۔ اب یہہ آپ لوگوں کا کام ہے کہ اپنے مباحث کے دوران میں یہ بتائیں کہ قانون کی تعلیم کے طریقوں میں کونسی ترقیاں ضروری ہیں اور انہیں کس طور پر جامۂ عمل پہنایا جاسکتا ہے۔

تعلیم کے معیار میں ترقی دینے کے مسئلہ کے ساتھ جو موضوع بہت قریبی تعلق رکھتا ہے وہ اُس میں ہم آہنگی پیدا کرنے کا مسئلہ ہے ہم آہنگی میں فوائد بھی ہیں لیکن اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ہندوستانی جامعات کے کلیات قانون میں ایک ہی جچا تُلا نظام نافذ کردیا جائے تو اسے کوئی ایسی بھلائی سمجھنا ضروری نہیں جسمیں بُرائی کی آمیزش نہ ہو۔ کیونکہ اس طرح ہر معلم کی انفرادی صلاحیت کی وسعت پر پابندیاں عائد ہو جائیں گی۔ مجھے اُمید ہے کہ مسئلے کے اس پہلو پر آپ اس طور پر غور کرینگے جس کا وہ مستحق ہے اور کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے آپ اسکے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال لینگے۔

جامعہ عثمانیہ میں قانون کی تعلیم کے ذریعے کے متعلق جو ایک جدت کیگئی ہے وہ قابلِ ذکر ہے اس جامعہ نے جب اپنے اس جسارت مند تجربے کا آغاز کیا کہ جملہ مضامین کا ذریعۂ تعلیم اُردو کو قرار دے تو قانون کے لئے بھی اُسی پر عمل کیا گیا مجھے اس کے متعدد موقعے ملے ہیں کہ اس جامعہ کے طلبا کی جوابی بیاضیں امتحانات کے سلسلے میں جانچوں اور مجھے یہاں اس کا

بڑا اثر ہوا کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اُسے بڑی سہولت کے ساتھ ظاہر کر سکتے ہیں نیز جن مضامین کا وہ مطالعہ کرتے ہیں اُن پر اچھا عبور حاصل کرتے ہیں - مادری زبان کے ذریعۂ تعلیم ہونے کا ہی یہ نتیجہ ہے - جامعہ عثمانیہ نے بہت سی معیاری کتابیں جو اصل میں انگریزی[۱] میں لکھی گئی تھیں اُردو میں ترجمہ کردی ہیں لیکن پھر بھی ایسی بہت سی کتابیں ہیں جن کا مطالعہ طلبہ کرنا چاہیں تو انگریزی ہی میں پڑھنا پڑتا ہے کیوں کہ اُن کے ترجمے نہیں ہوئے ہیں مجھے امید ہے کہ قانون کی تمام شاخوں کے متعلق اچھی کتابیں جلد اُردو میں لکھی جائیں گی تاکہ جو ذریعہ تعلیم مقرر کیا گیا ہے اُس کے ذریعے سے قانون کا مطالعہ کرنے والوں کو سہولت حاصل ہو -

چند سال کا عرصہ ہوا کہ مجھے حیدرآباد کی عدالت عالیہ کے اجلاس متفقہ پر ایک مقدمے کی سماعت کے موقعے پر موجود رہنے کا موقع ملا - مجھ پر اس کا بڑا اثر ہوا کہ فریقین کے وکلا کس قابلیت کے ساتھ اپنے فریق کی طرف سے بحث کر رہے تھے اور معزز حکّام عدالت کس سہولت کے ساتھ پیش شدہ دلائل کے مکمل نوٹ لیتے جا رہے تھے - اس سے میرے یقین کی توثیق ہوگئی کہ اُردو زبان اُس قانونی اندازِ عبارت کو قابلِ اطمینان طور پر ادا کرنے کے قابل ہے جو صدیوں کی استعمال سے انگریزی عدالتوں میں مروج ہو گئی ہے -

یہ تجربہ اگرچہ اپنی حد تک قابل قدر ہے لیکن وہ اس واقعے کی ایک مثال ہے کہ اس طرح کی جدّتیں ہر ہر صوبہ یا ریاست کی ضرورتوں پر مبنی ہونگی نیز اُن حالات پر جو مختلف مقاموں پر پائے جاتے ہوں - اُن کے متعلق کوئی عام قاعدہ نہیں نافذ کیا جا سکتا -

اس کانفرنس کو چاہیے کہ تحقیقات علمیہ کی اسپرٹ کو ترقی دینے پر خاص توجہ کرے - مجھے یہ دیکھکر مسرّت ہوئی کہ معتمد نے اس کانفرنس میں بحث کے لئے جن مضامین کی فہرست دی ہے وہ تقریباً دو درجن مقالوں پر مشتمل ہے - وقت ملے تو یہ کانفرنس میں پڑھے جائینگے - میں اپنے محترم دوست ڈاکٹر ناظر یار جنگ اور اُن کے شرکار انتظامی کو مبارکباد دیتا ہوں کہ

---

[۱] - نیز فرانسیسی جرمن عربی اور فارسی بھی (اڈیٹر)

انہوں نے کوشش کر کے اتنے زیادہ مقالے اتنے زیادہ قابل لوگوں سے حاصل کر لئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اُن کو کتابی صورت میں یکجا شائع کیا جائے تو وہ قانون کی مختلف شاخوں کے مطالعے میں ایک مفید اضافہ سمجھے جائینگے۔

مجھے اس سے بڑی مسرت ہوئی کہ جو مقالے آپکے سامنے پڑھے جائینگے اُن کی فہرست میں اسلامی اور ہندو قانون پر بھی متعدد مقالے ہیں۔ ان دونوں شعبوں کے متعلق ممتاز یورپی اور ہندوستانی علماء نے اچھا خاصا کام انجام دیا ہے لیکن پھر بھی بہت کچھ باقی ہے۔ اگر جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ اور طلباء چند ایسے موضوعوں پر کام کریں جن پر ابھی تک اُن کے پیشرؤوں نے توجہ نہیں کی تو وہ جملہ محبّان علم سے خراج امتنان حاصل کرینگے۔ جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ میں جو قابل افراد شامل ہیں اُن میں سے ایک یعنی ڈاکٹر حمید اللہ اسلامی قانون پر متعدد سبق آموز مقالے شائع کر چکے ہیں اور انہوں نے اس کانفرنس میں پڑھنے کے لئے جو مقالہ مرتب کیا ہے اُس کا عنوان "تصادم قوانین کے متعلق اسلامی تصور" ہے ایک اور دلچسپ مقالہ جسکی اطلاع دیگئی ہے وہ بی۔ین چوبے صاحب کا "دھرم شاستر کے ابتدائی ماخذ اور شرع محمدی کے بعض مماثل تصورات پر سرسری نظر" کے عنوان سے ہے۔ میں ان مقالوں کو سننے کا شوق کے ساتھ منتظر ہوں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں دو مصروف دن گزارنے ہوں گے اور ایک بلند معیار کی ذہنی ضیافت ہوگی۔ مجھے توقع ہے کہ اس کانفرنس کے منتظموں نے جو بے غرضانہ کوششیں کی ہیں وہ اسی کامیابی سے بہرہ ور ہوں گی جن کی وہ پوری طرح مستحق ہیں اور یہ کہ ہم تمام لوگ جو دور دراز سے سفر کر کے آئے ہیں جب واپس ہوں گے تو ہمارے معلومات میں اضافہ ہو چکا ہوگا اور ہم میں ایک جوش اور جذبہ بھر جائیگا کہ ہم جہاں کہیں بھی ہوں وہاں کے پیشۂ قانون کی کارگزاری اور وقار میں اضافہ کریں۔ میں یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ اس کانفرنس میں جو کام انجام پائے وہ اسکے قیام کی ضرورتوں کو اس حد تک پورا کرے کہ ایسی ہی مفید کانفرنسیں سالہائے آیندہ میں دیگر مراکز علم میں بھی منعقد ہوتی رہیں۔ فقط (ترجمہ)

قرارداد عقیدت بہ حضور شاہانہ

جسے کانفرنس کے صدر عمومی نے حضرت جلالت مآب
کی خدمت میں روانہ فرمایا

"کل ہند کانفرنس قانون کا یہ تاسیسی اجلاس جلالت مآب حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے پیام عطوفت نشان سے سرفرازی پر اپنی دلی عقیدت اور مودبانہ امتنان عرض کرنیکی اجازت چاہتا ہے۔ کانفرنس ہذا، حضور والا کی قائم فرمودہ جامعۂ عثمانیہ کی دعوت پر منعقد ہوئی ہے اور اس کا مستقل دفتر بھی جامعۂ عثمانیہ ہی میں قائم رہیگا۔ کانفرنس کو یقین ہے کہ پیام شاہانہ میں اس کے اغراض و مقاصد کے متعلق جو رہنمائی فرمائی گئی ہے اس کی روشنی میں اور بندگان حضرت جلالت مآب کی سرپرستی میں دُنیائے قانون کی حد تک وہ ملک و قوم کے لئے مفید خدمت انجام دے سکیگی۔"

سر موریس گائر کا خطبہ

جناب صدر و برادران - میرا اوّلین اور خوشگوار فریضہ ہے کہ کُل ہند کانفرنس قانون کے پہلے اجلاس کو یہاں منعقد کرنے کی دعوت دینے پر اعلیٰ حضرت حضور نظام نیز جامعہ عثمانیہ کے امیر جامعہ اور دیگر ارباب کا ہم سب کی طرف سے شکریہ ادا کروں اور ہمارے آرام اور بہبودی کیلئے جو انتظام کئے گئے ہیں ان پر ہماری ممنونیت کا اظہار کروں یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ میں جامعہ عثمانیہ میں کوئی خطبہ دے رہا ہوں اور نہ یہاں کی فیاضانہ میزبانی کے لئے میں کوئی اجنبی ہوں - صرف ایک چیز ہے جو میری آج یہاں تقریر کرنے کی مسرت کو برباد کر سکتی ہے اور وہ میرے پرانے دوست سر اکبر حیدری کی غیر موجودگی ہے - یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے اس جامعہ اور اس مملکت کی اتنے طویل عرصے تک اس قدر وفادارانہ خدمت انجام دی - اور میرے گذشتہ سفر حیدرآباد کے بعد سے وہ طویل عمر اور اعزازات سے مالامال ہو کر اپنے آبا و اجداد میں جا ملے ہیں -

یہ ایک نہایت ہی عمدہ بات ہے کہ ہندوستان کے قانون دان وقتاً فوقتاً یکجا ہوا کریں اور باہم مشاورت کر کے بر اعظم ہند کے تمام حصوں کے ہم پیشہ افراد سے سماجی تعلقات مستحکم کریں - مجھے اس پر کسی قدر حیرت ہوئی کہ اب تک اس قسم کا کوئی کُل ہند اجتماع عمل میں نہیں آیا لیکن یہ امر میرے لئے مسرّت اور اطمینان کا باعث ہے کہ اب آپ آیندہ پابندی سے ہر دو سال میں اجلاس کا ارادہ رکھتے ہیں - دیگر پیشوں اور علوم میں امتیاز رکھنے والے عرصے سے اس کے عادی ہیں کہ ہم بزم ہوا کریں اور اس طرح نہ صرف علم کی بلکہ اپنے متعلقہ

پیشے یا جماعت کے مشترکہ مفادات کی پیش روی کے لیے کوشش کریں۔ قانون ایک علم بھی ہے اور ایک پیشہ بھی۔ اور وکالت جو قانون کی ایک شاخ ہے دیگر فنون کے مقابلہ میں یہ امتیازی خصوصیت رکھتی ہے کہ اس کو انجام دینے والوں میں نہ صرف نہایت اعلیٰ درجہ کی مہارت اور فنی واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اعلیٰ کردار بھی درکار ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پیشۂ قانون میں کسی اور پیشے کے مقابلے میں ہندوستان میں زیادہ لوگوں کے لئے کشش ہے جب ایسا ہے تو پھر وہ باہم میل جول کو ترقی دینے اور دیگر فوائد حاصل کرنے میں جو صرف شخصی تماس سے حاصل ہوتے ہیں، کیوں دیگر پیشوں سے پیچھے رہ جائے؟ ہر صوبے کے وکیلوں کی بے شک علیحدہ انجمنیں ہیں لیکن مجھے اکثر محسوس ہوتا رہا ہے کہ صوبوں کی خود مختاری سے اگرچہ بیشک بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں لیکن اگر ہم کسی مسئلہ پر توجہ مرتکز کرنے میں اس کی کُل ہند حیثیت کی جگہ اسے محض گھریلو قرار دیں تو اس سے نقطۂ نظر کو ایک حد تک صوبہ واری حدود سے محدود ہو جانے کا میلان ہو جاتا رہا ہے۔ اور اس محاورے سے میرا مقصد کسی کو رنجیدہ کرنا نہیں ہے۔ اس طرح کا میلان وکیلوں ہی میں نہیں دوسرے لوگوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس کا اس سے بہتر علاج نہیں کہ جس قسم کے اجتماع کا آج ہم آغاز کر رہے ہیں اسی قسم کے اجتماعات عمل میں لائے جاتے رہیں۔

ایک اور وجہ بھی ہے جس کی بنا پر اس طرح کی کانفرنس کے خیال کو خوش آمدید کہنا چاہیے خاص کر انسانی معاملات کی روانی کے موجودہ لمحے میں۔ وہ جنگ جس نے دنیا کی قوموں کے بڑے حصے کو اپنے بھنور میں پھنسا لیا ہے وہ بالآخر آج ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ اپنی انتہا کو پہنچ رہی ہے اور اپنے ناگزیر اختتام سے قریب ہو رہی ہے اگرچہ افسوس ہے کہ خون اور آنسو کے ابھی ہمارے سامنے بہت سے مہینے باقی ہیں۔ اقوام متحدہ اس غرض کے لئے جنگ کر رہے ہیں کہ ایک دفعہ اور ہمیشہ کے لئے ان بُرے نظریوں کا خاتمہ کر دیں جن کو بُرے لوگوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے سازش کرتے ہوئے پھیلایا ہے کہ قوموں کے مابین کوئی

قاعدہ قانون نہیں پایا جاتا بجز حیوانی قوت کے۔ اور یہ کہ شہریوں کے آپس کے تعلقات یا شہریوں یا مملکت کے تعلقات ہمیشہ خود ساختہ آمروں (ڈوک ٹے ٹرس) اور ان کے شرکاءِ جرم کی ہوس ناکی یا ظلم کے تابع ہوں۔ جس چیز کو ہم قانون سمجھتے ہیں وہ اور آئین پسندی یعنی لوگوں کے حقوق اور فرائض کا تعین معلوم اور مقررہ اصول کے مطابق ہونا اس طرح کے لوگوں کو سخت ناپسند ہے اور وہ ان کو تباہ اور نابود کرنے کے لئے ہر ایسے ذلیل طریقہ سے کام لیتے ہیں جو کینے یا نفرت کے باعث ان کے ذہن میں آتا ہو۔ قوت کا متمدن مملکتوں کے پاس بھی اس غرض کے لئے موجود ہونا ہمیشہ ضروری ہوگا کہ افعال ناجائز کا ارتکاب کرنے والوں کو روکا جائے لیکن قوت کو چاہئے کہ وہ انصاف کی خادمہ رہے نہ کہ مالکہ۔ جس قسم کے نظریوں کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے ان کے خلاف ایک ختم نہ ہونے والی جنگ کا جاری رکھنا ہر قانون والے کے عقائد کا ایک جز ہوتا ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے نظریے تمدن کے لئے ایک دھمکی ہیں تو انسانی ترقی کے لئے ایک رکاوٹ اور آدمیت کی شان میں ایک گستاخی۔ ہمارے آج یہاں جمع ہونے کا واقعہ خود آئین پسندی کی جلالت و برتری کا دعوے کرنا اور اس کی تائید کرنا ہے کہ ہم آئین و قوانین ہی کے نفاذ کے کارندے اور آلہ کار ہیں۔ اسی طرح یہ اجتماع اس بات کی شہادت ہے کہ ہمارا پیشہ واحد ہے اور ہمیں ایک بنانے والی بندھنیں موجود ہیں اور آخر میں یہ کہ ہم اس لئے جمع نہیں ہوتے ہیں کہ اترائیں اور اکڑیں بلکہ انسان کے ہر کام میں خامی رہنے کو تسلیم کرتے ہوئے جہاں تک ہم میں سے ہر ایک کے بس میں ہے اس بات کی کوشش کریں کہ قانون کے متعلق ہماری واقفیت کو ترقی دیں اور اس کے نفاذ کو بہتر بنائیں۔

ان مقالوں کی فہرست جن پر کانفرنس میں بحث ہونیوالی ہے اثر انداز اور بوجھل ہے اور موضوعوں کی بھی بہت وسعت پائی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن سے زیادہ تر اُن لوگوں کو دلچسپی ہو سکتی ہے جو قانون کی خاص خاص شاخوں کے ماہر ہوں لیکن دیگر مضمون زیادہ

عام دلچسپی کے حامل ہیں۔ میں نے اس فہرست کو غور سے دیکھا تاکہ اگر ہو سکے تو انتخاب کردہ مضامین میں سے ایک یا دو کو اپنے خطبہ کیلئے متن بناؤں کیونکہ میں باور کرتا ہوں کہ آپ لوگ اس بات کو ترجیح دینگے کہ جو محدود وقت مجھے ملے گا اُس میں معین مسائل سے بحث کروں بہ نسبت اس کے کہ سطحی عام باتیں بیان کروں جو عام طور پر قانونی اجتماعوں میں مینے بکثرت سُنی ہیں اور اگر میرا اپنا تجربہ کوئی رہنمائی کر سکتا ہے تو اُن سے سُننے والوں پر ایک طرح کا دل برداشتہ کرنے والا اثر ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ مقالوں کی فہرست میں ایک یا دو ایسے ہیں جو نہایت اہم دستوری مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ اور میں آپکی اجازت سے یہ چاہتا ہونکہ ان کے متعلق ایک دو لفظ کہوں بغیر اسکے کہ اُس میدان میں دخل دوں جسے سیاست دان اپنے سے مخصوص سمجھتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ فہرست میں قانونی تعلیم کا موضوع نمایاں ہے۔ اس کانفرنس نے اپنے جو پانچ مقاصد قرار دیئے ہیں اُن میں سے تین صرف اِسی اہم موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لئے میں بغیر ہچکچاہٹ کے اس کے متعلق کچھ بیان کروں گا اور میں اس وجہ سے بھی ایسا کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی قانونی تعلیم اور پیشۂ وکلاء کو آجکل جن مسائل اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اُن میں باہم جو تعلق پایا جاتا ہے اُسکے متعلق میں نے بہت ہی مستحکم رائے قائم کرلی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا مقالہ سُننے کیلئے موجود نہ رہونگا "یہ قانون حکومت ہند بابت ۱۹۳۵ء اور بعد کی دستوری تبدیلیون سے متعلق ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ مجھے اجازت دیکر اس مباحثے میں حصہ لینا پڑتا جو بے شبہہ اس مقالہ کے پڑھے جانے کے بعد شروع ہوتا کیونکہ یہ مضمون ایسا ہے جس سے مجھے ایک شخصی ـــ بلکہ میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ ـــ ایک دردناک دلچسپی ہے۔ اگر مجھے موقع ملتا تو میں اس وقت بھی حاضرین میں شریک رہتا جب رام لال کشن صاحب اپنا مقالہ "قانون انگریزی کے جدید رجحانات" پر سُناتے نیز محمد غوث صاحب "عدل گستری کے بنیادی اصولوں کا ارتقاء" پر۔ مجھے آخر الذکر کی ہمت کی

داد دینی چاہیئے کہ انہوں نے اتنی عمیق اور دور رس اہمیت والے مضمون کو ایک مضمون کے حدود میں سکیڑ لینے کی کوشش کی ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ میری نہ تو خواہش ہے اور نہ ارادہ کہ سیاست حاضرہ کو چھوؤں جو ظاہر ہے کہ موجودہ قسم کی کانفرنس میں بالکل بے محل ہوگا۔ پھر بھی مجھے اس اچھے اصول سے ہٹنا نہیں نظر آتا اگر میں اس حصے کی طرف اشارہ کروں جو ہندستان کے کسی نئی دستور کی تیاری میں ہمارے پیشے کے افراد لے سکتے ہیں۔ میں اسے ممکن نہیں خیال کرتا کہ حکومت کا کوئی کامیاب دستور قانون دانوں کی مدد کے بغیر بنایا جا سکے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں اور بھی آگے بڑھکر یہ کہہ سکتا ہوں کہ قانون دان اس بارے میں جو مدد دے سکتے ہیں وہ محض اس حد تک محدود نہیں ہوگی اور نہ ہونی چاہیئے کہ ایک پیچیدہ قانونی دستاویز کو صاف اور معین زبان میں مرتب کرنے کے لئے فنی مہارت دکھائیں قانون دانوں نے دستوری اصولوں کے ارتقاء میں جو حصہ لیا ہے وہ تاریخ میں ثبت ہے خود میرے اپنے وطن کی تاریخ میں شروع سے آخر تک جو عظیم دستوری کشمکشیں جاری رہیں اُن کی تقویت اور پرورش ایسے قانون دان کرتے رہے جو نہ صرف پیشہ ور وکیل کی ہر وقت کی مستعدی یا لفاظی دکھاتے رہے بلکہ اُس حیرت انگیز ایقان کا بھی مظاہرہ کیا جو مقنّن اور مدبر میں پایا جاتا ہے۔ قانون دانوں ہی نے ممالک متحدہ امریکہ کے دستور جیسی عظیم دستاویز کی تیاری میں بھی ایک اہم حصہ لیا ہے۔ یہ دستور انگریزی زبان اور انگلستان کے قانون موضوعہ کے اصولوں کے ساتھ ساتھ ان قوتوں میں سے جنہوں نے امریکی لوگوں کو ایک بڑی اور طاقتور قوم میں ڈھال دیا ہے سب سے زیادہ حیات بخش ہے۔ آپ کو یہ بھی نظر آئیگا کہ برطانوی قلمروؤں کی دستوری دستاویزوں کے تیار کرنے میں بھی قانون دانوں نے کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ میرا اشارہ اُس دولت عامۂ اقوام کی طرف ہے جو تاج برطانیہ سے وفاداری رکھتا ہے اس لئے میں اس بات میں کوئی شبہہ نہیں کرتا کہ ہندوستان میں بھی

مماثل مقصد کے لئے قانون دانوں کی ضرورت ناگزیر رہیگی اور میری رائے میں اس امر کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اس پہلو کو نہ صرف معلوم کیا جائے بلکہ اُس کے وجوہ بھی ذہن نشین کئے جائیں۔ میں یہ اسلئے کہہ رہا ہوں کہ وقتاً بوقتاً میں ایسی لکھی ہوئی چیزیں پڑھتا اور کہی ہوئی چیزیں سنتا ہوں جن سے یہ خیال کیا جا سکتا ہے دستور مرتب کرنا مقابلتہً ایک آسان کام ہے اگر دو یا تین ممتاز قائد مل بیٹھیں اور اُن میں اُس سے زیادہ اتفاق رائے پایا جائے جتنا کہ ابتک خیال کیا جاتا تھا۔ میں چاہتا تو یہی ہوں کہ دستورسازی ایسی ہی آسان ہوتی لیکن مجھے دستورسازی کا کچھ تجربہ رہا ہے اور میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ایک نہایت سخت اور مشکل کام ہوتا ہے اور اُس میں بڑی ذہنی محنت اور جد وجہد کی ضرورت ہوتی ہے، دستوری تاریخ اور اصُولوں پر کامل عبور اور قابو ہونا پڑتا ہے، ایک حد تک ذہن میں جدت پسندی اور لچک ہونی پڑتی ہے نیز دیگر اہم چیزوں میں سے ایک یہ بھی کہ بے انتہا صبر اور ضرورت پیش آنے پر مصالحت پر آمادگی ہونی پڑتی ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ میں قانون پیشہ لوگوں کے متعلق بلند بانگ دعوے کرتا نہیں سمجھا جاؤں گا اگر میں یہ کہوں کہ ان صفات میں سے بہت سی بلکہ شاید سب ہی ایسی ہیں جو ہر اُس قانون دان میں بطور امتیاز پائی جانی چاہئیں جو قانون میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل کرنیکی خواہش رکھتا ہو اور ان صفتوں میں سے چند ایسی ہیں کہ اُن کے متعلق میں ادب کے ساتھ شاید کہہ سکتا ہوں کہ وہ سیاست دانوں کے مقابلہ میں قانون دانوں میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ آپ یہ نہیں خیال کرینگے کہ میں اتنا احمق ہوں کہ یہ تصور کروں کہ وہ لوگ جو قانون دان ہیں، چاہے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہوں اور قانون دان ہونے کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہیں، وہ کوئی کامیاب اور قابلِ عمل دستور تیار کرلے سکتے ہیں۔ یہ ایسے مدبر کا کام ہے جو رائے عامہ کی ترجمانی کی مہارت بھی رکھتا ہو اور رائے عامہ کی تربیت کرکے اُسکی عاقلانہ رہنمائی بھی کرسکتا ہو۔ مدبرین مملکت میں قانون داں بھی ہوتے ہیں جس طرح

قانون دانوں میں مدبر اور ان دونوں طبقات کی خصوصیتوں میں جو امور بہترین ہیں اُن کا مجموعہ ہی وہ چیز ہے جس سے کسی کامیاب نتیجہ کے نکلنے کا سب سے زیادہ امکان ہوتا ہے۔

ان خطوط پر ابتدائی کام کا آغاز کیوں نہ شروع کر دیا جائے؟ ایک عام پیمائش زبانی بھی سوائے بھلائی کے کوئی اور چیز نہیں پیدا کریگی اور میں پورے ادب کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے خیال میں بہت بڑا فائدہ ہوگا اگر محض نقطہ ہائے اختلاف ہی معلوم کرلئے جائیں اور معقول وضاحت کے ساتھ معین کر دیے جائیں۔ فرض کرو کہ لوگوں کی ایک چھوٹی سی جماعت جمع ہو اور اس طرح کا ابتدائی کام شروع کر دے۔ کیا یہ تصور سے باہر چیز ہوگی کہ یہ لوگ کوئی ایسا قابل عمل منصوبہ تیار کرلینگے جو اس قابل ہو کہ بعد میں نمایندہ مجلس کے سامنے پیش کیا جا سکے؟ میرے اندازہ میں تعداد کا کم ہونا ضروری ہے اور یہ لوگ اپنا کام خانگی طور سے انجام دیں کیوں کہ کوئی قابلِ عمل دستور ساز جلسے میں تیار نہیں ہوسکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو کوئی بڑی اہمیت حاصل نہیں ہے کہ ایسی جماعت کے ارکان کس طور پر چُنے گئے بشرطیکہ وہ ایماندار اور قابل لوگ ہوں اور اپنے کردار کی بلندی کے باعث احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے ہوں اور یہ معلوم ہو کہ وہ مختلف نقطہ ہائے خیال کی نمایندگی کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اُن کا کیا ہوا کام بعد میں کسی ایسی نمایندہ مجلس کے سامنے پیش کرنا ہوگا جسے جانچ، تنقید اور ترمیم کے پورے اختیارات حاصل ہوں۔ یہ ترمیم شدہ مسودہ اُس مجلس کا کام ختم ہونے کے بعد اگر مناسب سمجھا جائے تو کسی وسیع تر مجلس کی رائے یا استصوابِ عامہ کیلئے پیش کیا جائے لیکن اسکو صرف قبول یا رد کا اختیار ہو۔ مگر ایک بڑے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور جہاں ایک ایسی آبادی ہے جس میں بدقسمتی سے تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب بہ حیثیت مجموعی بہت کم ہے وہاں اس آخری تجویز کے خلاف بدیہی طور پر اعتراضات کئے جاتے ہیں۔ میں نے جس قسم کے لوگوں کی ایک جماعت کا ذکر کیا ہے اُن میں اگر ممتاز

ہندوستانی قانون دانوں کی موجودگی بھی ہو اور وہ فی الوقت اپنے سیاسی علائق کو الگ کر رکھدیں اور اُن سب میں صرف اس بات کا ولولہ رہے کہ ایسے نتائج پیدا کرنے کی اٹل کوشش کرینگے جو نمایندہ مجلس کے سامنے پیش کیئے جا سکیں چاہے وہ منتخبہ ہو یا نامزد کردہ جیساکہ میں نے اوپر اشارہ کیا ہے، تو یہ ملک کیلئے بے حساب قدر و قیمت کی خدمت ہوگی قانون دان اپنی خصوصی تربیت کے باعث فطرۃً اس بات کے قابل ہوتا ہے کہ سیاسی مسائل کو اس شخص کے مقابلے میں زیادہ الگ تھلگ اور غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے دیکھ سکے جو روز بروز کی سیاسی کشمکش میں ڈوبا ہوا ہو۔ اور اسی وجہ سے مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے پیشے کے ارکان ملک کی آیندہ دستوری ترقیوں میں عظیم الشان حصہ لے سکتے ہیں۔

البتہ شاید میں اس دل لبھانے والے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کافی دور چلا گیا ہوں اور مجھے اب خطرناک زمینوں پر قدم بڑھانیکی خواہش نہیں ہونی چاہیئے۔ اس لئے مجھے دوسرے موضوع پر توجہ دینی چاہیئے جسکے متعلق میں بعض باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری مراد قانونی تعلیم کا موضوع ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ کی عام تائید حاصل ہوگی اگر میں یہ خیال ظاہر کروں کہ تن من دھن سے کام کرنے والے معلموں کی ایک بڑی جماعت موجود ہونیکے باوجود موجودہ نظام میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو غیر اطمینان بخش ہیں اور پیشۂ قانون کو بے انتہا فائدہ حاصل ہوگا اگر قانون پیشہ لوگ اور خاصکر اساتذۂ قانون ہندوستان کے ہر حصے سے آکر اس ہفتے کانفرنس میں شریک ہوں اور قانونی تعلیم پر بہ حیثیت مجموعی بحث کرکے اسکے متعلق ایک حد تک اتفاق رائے حاصل کرنیکی کوشش کریں۔

میں نے اس خطبے میں اوپر بیان کیا ہے کہ قانون کی تعلیم ایک ایسا مسئلہ ہے جسے پیشۂ قانون کو آجکل پیش آنے والے مسائل اور مشکلوں میں سے بعض سے بالکل بے تعلق نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چیز بالکل صحیح ہے۔ اور اسکی وجہ حسب ذیل ہے

میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں پیشۂ وکالت میں ہجوم کا ہو جانا اب کوئی شک و شبہہ نہیں رکھتا اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بھی عام طور پر اتفاق کیا جائیگا کہ اس پیشے میں بہت سے ایسے لوگوں کو بھی داخلہ مل گیا ہے جو اس پیشے کے ارکان پر عاید ہونیوالی ذمہ داریوں کو پورا کرنیکے بہت ہی کم قابل ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح کیلئے بہت سے تجویزیں پیش کی گئی ہیں اور اُن میں سے بعض ایسی ہیں کہ اُن کا ذکر ہی اسی لئے کرنا ہے کہ اُن کو رد کر دیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی بھی یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ ہماری تعداد پر کوئی مصنوعی یا میکانیکل پابندی عاید کر دی جائے یا کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے قانون پیشہ لوگ ایک محدود اور امتیازی طبقہ کی صورت میں متبدل ہو جائیں۔ یہ ہمیشہ سے پیشۂ قانون کا قابل فخر اصول رہا ہے کہ اُس کے دروازے صرف صلاحیت والے کیلئے کھلتے ہیں۔ لیکن صلاحیتوں میں بھی فرق ہوتا ہے اور اگر جانچ کیلئے جو معیار قائم کئے جائیں وہ ضرورت سے زیادہ پست ہوں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ صرف اس پیشے میں داخل ہونیوالوں کے لئے بلکہ خود پیشے کیلئے نقصان پہنچ جاتا ہے۔ مجھے اس میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ گذشتہ چند سالوں سے اس پیشے میں داخل ہونا ضرورت سے زیادہ آسان رہا ہے اور اسکے نتیجے کے طور پر بہت سے ناخوشگوار اثرات مترتب ہوئے ہیں، اور کچھ اتنا شدید مقابلہ پایا جانے لگا ہے کہ صورت حال غیر صحت بخش ہوگئی ہے۔ اور اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ کردار کے معیار بھی گر گئے ہیں۔ کیونکہ تنازع للبقا میں کمزور بھائی اس بات میں ہمیشہ کامیاب نہیں ہوتے کہ بُری ترغیبوں کا کامیاب مقابلہ کر سکیں پیشۂ قانون کے متعلق عام طور پر عوام میں جو احترام اور لحاظ ہونا چاہیئے اگر اس میں ذرا بھی کمی ہو تو یہ عدل گستری کیلئے مضر ہوگا۔ اور اس طرح مفاد عامہ بھی متاثر ہوتا ہے اور ارکان پیشہ کا مفاد بھی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ چند سال قبل غیر قانون داں لوگوں کے ایک مجمع کے سامنے میں ایک قانونی موضوع پر لکچر دے رہا تھا۔ اُسکے اختتام پر حاضرین میں سے ایک نے

مجھ سے پوچھا کہ ایک طرف تو میں قانون کو ایک شریف پیشہ قرار دیتا ہوں اور دوسری طرف اسکی شہرت ہے کہ وکلا میں عام طور پر ہیر پھیر اور سٹے بٹے پائے جاتے ہیں ۔ یہ دونوں چیزیں بہ وقت واحد کیسے صحیح ہو سکتی ہیں ؟ اس تباہی خیز سوال پر میں صرف یہ جواب دے سکتا تھا کہ ہر پیشے میں سیاہ بھیڑیں پائی جاتی ہیں ۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میرے جواب سے سائل کو پورا اطمینان نہیں ہوا اور خود مجھے بھی اطمینان نہیں ہوا تھا۔

اس لئے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ امر کانفرنس ہذا کے لئے غور کے قابل ہے کہ آیا اس بات کا وقت نہیں آگیا ہے کہ ان امتحانوں کے معیار کو بلند کر دیا جائے جن کی کامیابی سے فہرست وکلا میں داخلے کا حق پیدا ہو جاتا ہے ۔ لیکن اس طرح کا اقدام بمشکل قابل عمل ہوگا اور بہر صورت ہندوستان کے مختلف حصہائے ملک کے امیدواروں میں نامناسب فرق کریگا اگر اس بارے میں ملک کی قانونی درسگاہوں میں عام اتفاق رائے نہ پیدا ہو جائے کہ قانونی امتحانوں کا نصاب کیا ہو اور کامیاب ہونے کا معیار کیا رکھا جائے ۔ اور بھی مسائل ہیں جو ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ان پر غور کرنا بھی مفید ہوگا ۔ ایک مسئلہ ہمہ وقتی اور جز وقتی اساتذہ کا ہے ۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ لکچر بڑی کثرت سے دئیے جاتے ہیں اور میں خیال کرتا ہوں کہ ان میں تخفیف کی جائے تو سبھی متعلقہ لوگوں کو بڑا فائدہ حاصل ہوگا ۔ اسیطرح اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ کلاس ورک اور ٹیٹوریل تعلیم میں اضافہ کیا جائے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں صداقت سے کم کوئی چیز نہیں بیان کر رہا ہوں جب میں یہ اصرار سے بیان کروں کہ ایک سے زیادہ مقاموں پر آجکل ہندوستان میں طلبۂ قانون کے لئے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ یل۔یل۔بی کا امتحان محض اس طور پر کامیاب کرلیں کہ چند لکچروں میں تو حاضری دیں اور اپنی پوری مدت تعلیم میں نفاذ قانون کی کوئی کتاب بھی کھول کر نہ دیکھیں ۔ ان حالات میں کیا اسے کبھی بھی یہ سیکھنے کا موقع مل سکتا ہے کہ جو مستند ماخذ ہیں ان سے استفادہ کر سکے یا قانونی اصول کی ماہیت کا محض ابتدائی تصور بھی

حاصل کر سکے؟ پھر یہ دعوے کیسے ممکن ہے کہ وہ وکیل بننے کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کا اہل بن گیا ہے۔

اس طرح یل یل بی کے امتحان کے قواعد میں بھی مختلف صوبوں میں قابل لحاظ فرق ہے۔ کم از کم دو جگہ تین سالہ نصاب ہے۔ باقی جگہ صرف دو سالہ۔ دو مقاموں پر انٹرمیڈیٹ کامیاب کرنے کے بعد یل یل بی کی جماعت میں شرکت ہو سکتی ہے دیگر مقاموں پر بی۔اے ہونا شرط ماتقدم ہے۔ نصاب میں بھی فرق ہے ایک جگہ کا تو مجھے علم ہے دیگر مقاموں پر بھی شاید ایسا ہی ہو کہ ضابطہ اور مماثل مضامین بھی پرچے ہیں جو میری رائے میں ایسے نہیں ہیں کہ اُن کی تعلیم دینا جامعہ کا کام ہو۔ اکثر مضامین کی ترتیب میں کوئی منطقی یا حکمیاتی طریقہ بھی نہیں برتا گیا ہے اور میری رائے میں ان کا انتخاب بھی اکثر ٹھیک طور پر نہیں ہوا ہے۔ اس بارے میں اتفاق رائے ہونا چاہیئے کہ ہر جگہ کے نصابوں میں کونسی بنیادی چیزیں مشترک رہیں۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ مختلف صوبوں میں مقامی قانون کے متعلق خصوصی پرچے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح میں سوچتا ہوں کہ اس بات میں بھی اتفاق رائے کی ضرورت ہے کہ بیچارے طالبعلم کو جتنے امتحانوں میں سے گزرنیکی ضرورت ہے اُن کی تعداد کیا ہو۔ میرے خیال میں اس چیز پر بھی زیادہ توجہ ہونی چاہیئے جسے میں قانون کا نظری اور حکمیاتی پہلو قرار دیتا ہوں۔ اگرچہ میں اس سے واقف ہوں کہ ہندوستان میں آجکل ایسے اساتذہ بھی ہیں جن کی محنتیں اس سلسلے میں ہر طرح کی تعریف کی مستحق ہیں۔

یقیناً میں نے اس بات کو نہیں بھلایا ہے کہ جب تک یل یل۔ بی کی ڈگری مقامی وکالت کے لئے پاسپورٹ کا درجہ رکھے اُسوقت تک عدالتہائے عالیہ کو نصاب اور بعض دیگر معاملات میں آخری لفظ کہنے کا حق ہونا چاہیئے لیکن میرے خیال میں اگر اساتذہ قانون جن میں بڑے تجربہ کار لوگ بھی شامل ہیں میرے بیان کردہ امور کے متعلق آپس میں ایک حد تک اتفاق رائے قائم کرلیں تو مختلف عدالت ہائے عالیہ سے بحث و گفتگو

بہت آسان ہو جائے۔ شاید عدالت ہائے عالیہ کے وہ جج جنہیں قانونی تعلیم کے موضوع سے خصوصی دلچسپی ہو اس بات پر آمادہ ہو جائیں کہ میرے بیان کردہ مباحث کی ابتدائی نوبت پر اپنے مشورے پیش کر سکیں۔ بہر حال اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ کوئی طبقہ اشخاص وکالت میں نئے داخل ہونے والوں کے معیار کو بلند کرنے پر اُس سے زیادہ خوش آمدید نہیں کہیگا جتنا خود عدالت ہائے عالیہ اور مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس غرض و غایت کیلئے کوئی کارروائی کیجائے تو اُنکی سرگرم تائید حاصل ہو گی۔

میں نے محض عام الفاظ میں اُن خطوط کی طرف اشارہ کیا ہے جن پر میرے خیال میں مباحث کو چلایا جانا مفید ہو گا۔ لیکن ایک یا دو ایسے عملی تجاویز بھی ہیں جنہیں میں کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ آپکے سامنے پیش کرنیکی جرات کرتا ہوں۔

مجھے اس سے اتفاق ہے کہ نوعمر لوگوں کو قانون کے مطالعہ کی اس وقت تک حوصلہ افزائی نہیں کی جانی چاہیئے جب تک کہ انھوں نے عمومی تعلیم کی بنیادیں اچھی مستحکم نہ کرلی ہوں۔ بدقسمتی سے محض فنون کا طیلسان لے لینا مذکورہ غرض کی تکمیل کا ضامن نہیں ہوتا اور میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ کوئی جامعہ تجربے کے طور پر ایک ایسا نصاب شروع کرے جس میں قانون کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک زیادہ عمومی تعلیم کے عناصر بھی شریک ہوں۔ فی الوقت نوجوان طالب علموں کو بی۔ اے کرنے کیلئے چار سال لگتے ہیں (اور ایک جامعہ میں تین سال) پھر ایل۔ ایل۔ بی کیلئے مختلف مقاموں کے لحاظ سے دو یا تین سال مزید درکار ہوتے ہیں۔ فرض کرو کہ اُسے ایک ایسی ڈگری کا موقع دیا جائے جسے کیمبرج کی نہج پر بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی کہیں، پر اُس کے لئے بحیثیت مجموعی چار سالہ نصاب ہو اور یہ اصولاً قانونی علوم ہی کی تعلیم پر مشتمل ہو البتہ اُس میں تاریخ اور سیاسیات کے عمومی پہلوؤں کا قوی عنصر شامل ہو۔ یہ امتحان دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے پہلا امتحان دو سالہ تعلیم کے بعد اور دوسرا ختم نصاب پر پہلے حصے میں زیادہ تر نصاب کے اُن عناصر پر زور دیا جائیگا جو تاریخ اور سیاسیات

کے متعلق ہیں لیکن یقیناً کلیتہً محض انہیں پر اکتفا نہیں کیا جائیگا۔ اور دوسرا حصہ زیادہ (گو کلیتہً نہیں) قانونی ہوگا اور طالب علم اس نصاب کے آغاز ہی سے قانونی چیزوں کا مطالعہ شروع کر دیگا۔ یہ آنرس کا نصاب ہونا چاہیئے اور کسی شخص کو اس میں اسوقت تک داخلہ نہیں دیا جانا چاہیئے جب تک کہ وہ سترہ سال کا نہو چکا ہو۔ میں پھر بھی اصرار کروں گا کہ "ذریعہ اظہار خیال کے طور پر انگریزی زبان کا ایک عام نصاب" بھی شامل ہو۔ واوین میں دیئے ہوئے الفاظ اس قرار داد سے لیئے گئے ہیں جو گزشتہ دسمبر میں جامعات ہند کی پانچویں پنجسالہ کانفرنس میں منظور ہوئی تھی اسکے شمول کی وجہ یہ ہے کہ مجھے ہر طرف سے اس بات کی شہادت ملی ہے کہ آجکل بہت سے ایل۔ ایل۔ بی انگریزی میں کمزور ہوتے ہیں۔ میں نے یہ چیز اس بناء پر نہیں کہی ہے کہ مجھے قدرتی طور پر اپنی زبان کی تائید کا میلان ہے بلکہ اس لئے کہ جب تک انگریزی زبان اعلیٰ تر عدالتوں کی زبان ہے اور جب تک کہ تمام ہندوستانی رپورٹیں انگریزی میں چھپتی ہیں اُس وقت تک کسی اور شعبۂ حیات کے طلبہ کے مقابلہ میں قانون کے طالبعلم کیلئے انگریزی زبان کی اچھی علمی واقفیت زیادہ ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو نوجوان اسطرح کا نصاب لے گا، اور اپنے دونوں امتحانوں کو اچھی طور پر کامیاب کر لیگا۔ اور مجھے اسپر اصرار ہے کہ کامیابی کا معیار بلند ہونا چاہیئے۔ تو نہ صرف اُسے اچھی عمومی تعلیم حاصل رہیگی، بلکہ بعد میں اُسے اپنے پیشے میں مناسب طور پر لیس ہو کر داخلہ حاصل ہو سکیگا۔ میرے خیال میں یہ ناممکن نہیں ہے کہ جو لوگ قانون پیشہ بننے کا ارادہ نہیں رکھتے ہیں اُن میں سے بھی بعض اس قسم کا نصاب لینا چاہینگے۔ اسکو بہت زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ میرے وطن میں قانون کی اچھی واقفیت کو ہر پڑھے لکھے آدمی کے ذہنی ساز و سامان کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کیا شک ہے کہ تعلیم کے نصاب قانون کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہتیار کم ہی ہیں اور اگر اس طرح کی تعلیم کے ساتھ ایسی چیزیں شامل کر دی جائیں جن کو بعض لوگ عمومی

عناصر خیال کرینگے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک ایسی ذہنی تربیت دے دی جائے گی جس سے کوئی نوعمر پیشہ' قانون کے علاوہ بہت سے دیگر شعبہ ہائے حیات میں بھی کامیابی سے چل سکنے کے قابل ہو جائیگا۔

قانونی تعلیم کے اس مشکل مسئلے سے بحث کرنے کے لئے کانفرنس ہذا کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ ایک ایسی چھوٹی سی کمیٹی مقرر کرے جو وقت بوقت جمع ہو اور اسکے سامنے پیش کئے جانے والے معاملات کی جانچ کرے اور ایک وسیع تر جماعت کے سامنے روانہ کیا کرے۔ ظاہر ہے کہ خط و کتابت اور مختلف موضوعوں پر یادداشتوں کے تبادلے سے بہت سا کام انجام پا سکیگا تاکہ اجلاسوں کی کثرت کی ضرورت کو جہاں تک ہو سکے گھٹایا جا سکے اور آجکل کے مشکل زمانوں میں سفروں کا انتظام آسان نہیں۔ مجھے ایک اور تجویز بھی پیش کرنی ہے۔ تیس چالیس سال کا زمانہ ہوا کہ آنجہانی ایڈورڈ جینکس نے (جسکی کتابوں سے بے شبہہ آپ میں سے ہر ایک واقف ہے اور جس نے انگلستان میں قانونی تعلیم کے لئے بہت بڑا کام کیا ہے) اساتذہ قانون کی ایک انجمن قائم کی جس نے بہت جلد تقریباً اُن تمام لوگوں کو اپنے اندر شامل کر لیا جو جامعات اور دیگر مدارس میں قانون کی تعلیم میں مشغول تھے۔ اس زمانے میں میں خود بھی قانون کا ایک مدرس تھا اور اس انجمن کے ابتدائی ارکان میں سے ایک تھا۔ گو بعد میں اُس نے مجھے اپنے اعزازی ارکان میں داخلے سے سرفراز کیا۔ یہ انجمن گذشتہ بہت سے سالوں سے ایک بہت ہی با اثر جماعت ہو گئی ہے اور اعلیٰ ترین قانونی افسر بلکہ خود حکومت بھی بہت سے اقسام کے قانونی موضوعوں کے متعلق اسکی رائے اور مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ چند ہی دن ہوئے مجھے اپنے ایک پرانے دوست کے پاس ایک خط وصول ہوا ہے جو آکسفورڈ میں قانون پڑھاتا ہے اور اس انجمن کا رکن ہے۔ اُس نے مجھے لکھا ہے کہ کس طرح اس انجمن کی کمیٹی نے دفتر فوج کو اس بات پر توجہ دلائی کہ جو طلبہ فوج میں بھرتی ہوئے ہیں انہیں اپنی تعلیم جاری رکھنے کیلئے

مدد دی جائے اور یہ کہ کسطرح یہ تجویز بالآخر ترقی پاکر ایک وسیع تعلیمی اسکیم کی صورت اختیار کر گئی، جو دفتر فوج نے برّی بحری اور ہوائی تینوں قسم کے لوگوں کے متعلق نافذ کی۔ میرا یہ دوست اس کمیٹی کا میر مجلس ہے جو اس اسکیم کے قانونی پہلو سے سروکار رکھتی ہے۔ اس کمیٹی میں نہ صرف اس انجمن کے نمایندے ہیں بلکہ قانونی تعلیم کی کونسل کے بھی (جو وکلاء سے متعلق ہے) اور انجمن قانون کے بھی (جو مشیران قانون کے طبقہ سے متعلق ہے) اور اس میں تعلیم فوج کا ڈائرکٹر بھی موجود ہے۔ یہ بیان کرنے سے میرا مقصد اس بات کی ایک مثال دینا ہے کہ کسطرح اسطرح کی کوئی انجمن خدمت انجام دے سکتی ہے اگر وہ اپنا کام سیدھے طریقے سے کرے اور سرکاری افسروں کا اعتماد حاصل کرلے۔ کیا اس طرح کی کوئی تنظیم ناممکن ہے؟ مجھے اس کا پورا احساس ہے کہ ہندوستان میں مسافتوں کی طوالت اور مصارف سفر کے باعث بہت سی مشکلیں ہیں لیکن اسطرح کی انجمن یا تنظیم میں جو فوائد مضمر ہیں وہ میرے خیال میں اتنے اہم ہیں کہ ان مشکلوں کو گوارا کرنا چاہیئے مجھے وہ جواب یاد آرہا ہے جو فی الوقت انگلستان میں جنگی سربراہی اور مماثل معاملات کی ایک بڑی تنظیم کے صدر کی طرف منسوب ہے۔ اُس سے کسی نے اُسکی مشکلوں کے متعلق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ "اگر کام صرف مشکل ہو تو ہم اسے فوراً کر ڈالتے ہیں لیکن اگر وہ ناممکن ہو تو اُسے ذرا زیادہ وقت لگتا ہے"۔

یہ خطبہ اس سے زیادہ طویل ہوگیا جتنا کہ میرا ارادہ تھا اور مجھے اب اسے ختم کر دینا چاہیئے لیکن ایسا کرنے سے پہلے آپ مجھے اجازت دیں کہ ایک شخصی معروضہ کروں۔ مجھے واقعی رنج ہے کہ آج کی کرسی صدارت جسکی مجھے نہایت مہربانی سے دعوت دی گئی ہے لینے کے ناقابل ہوں جسکی مجھے آرزو تھی لیکن مجھے اپنے طبیب کے احکام کی تعمیل کرنی ہے اور یہی وہ آمر (ڈکٹیٹر) ہے جسکے احکام کی تعمیل کسی قانون داں کو بھی کرنے میں شرم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں کئی وجوہ سے آنا چاہتا تھا۔ پہلے اسلئے کہ میں عرصہ دراز سے حیدرآباد کو جانتا اور اسکی قدر کرتا ہوں اور وہاں میرے بہت سے دوست ہیں۔ مزید برآں اسلئے بھی کہ مجھے ایک زمانے میں ہندوستان کی دنیائے قانون میں ایک ذمہ دار خدمت پر فائز ہونے کا موقع رہا ہے اور اگرچہ اب میں وظیفہ لے چکا ہوں لیکن میں اسے اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ اس پیشے کے مفادات اور بہبودی کو ترقی دینے کیلئے جس سے مجھے اب بھی تعلق رکھنے کی عزت حاصل ہے، اپنی امکانی کوشش کروں، اور آخر میں اسلئے بھی کہ میرے ہندوستان میں آنے کے

بعد سے یہاں کے اہلِ قانون نے مجھ سے ہمیشہ کچھ اتنی عنایت اور لحاظ کا برتاؤ کیا ہے اور میرے ہندوستان کے مختلف اقطاع میں اتنے زیادہ دوست ہیں کہ اپنے آپکو دوبارہ ان میں پاکر مجھے مسرت ہوتی اور گزشتہ تعلقات کی یاد تازہ ہوسکتی لیکن اگر میں آج شخصی طور پر آپکے ساتھ نہیں ہوں تو میں آپکو یقین دلا سکتا ہوں کہ روحی طور پر آپکے ساتھ ہوں اور آپکے مباحث کو دلچسپی کے ساتھ سن رہا ہوں اور مجھے توقع ہے کہ مجھے اپنے دوست نواب ناظر یار جنگ بہادر اور اس کانفرنس کے مستعد معتمد کے پاس سے کانفرنس کی ایک مکمل رپورٹ بھی وصول ہوجائیگی۔ مجھے توقع ہے بلکہ یقین ہے کہ آپکی کوششوں سے بہت کچھ بھلائی کا سامان ہوگا۔ قانون دانوں میں چاہے کتنی ہی خامیاں ہوں (اوران کے ناقد یقیناً اُن کو یہ بھولنے کا موقع نہیں دیتے کہ اُن میں قابل لحاظ خامیاں ہیں) بہرحال وہ اس بات پر قادر ہیں کہ اگر وہ عقل اور سمجھ سے کام کریں تو ملک کی بڑی خدمت انجام دے سکیں۔ قانون کا پیشہ حال حال تک ہندوستان کی پبلک زندگی کا ایک واحد مقام تھا اور ناگزیر وکیلوں کی اکثریت حکومت کی مخالف تھی کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ اسطور پر انہوں نے اپنی دیگر قوتوں کو نقصان پہنچا کر تنقیدی قوت کو زیادہ ترقی دے دی ہے اور یہ کہ انہیں ابھی تک پوری طرح اندازہ نہیں ہوا ہے کہ آیندہ ایسے حالات آنے والے ہیں جن میں تنقیدی سے زیادہ تخلیقی اور تعمیری قوتوں کی ضرورت ہوگی۔ دستور سازی کا میں ذکر کر چکا ہوں لیکن اور بھی اہم ترین قسم کے تعمیری کام پیش آنیوالے ہیں جن میں اُن کے ہم وطن اُنکی خدمات سے بآسانی دستبردار نہیں ہوسکینگے کیونکہ انہیں لوگوں نے قانونی تربیت کی شدید ذہنی ڈسپلن یا ضبط سے اپنے کو گذار لیا ہے اور انہوں نے یہ سیکھ لیا ہے کہ اپنے خیالات کو کس طور پر واضح اور صاف انداز میں ظاہر کریں۔ اُن عظیم اور جاندار مسائل میں جو آپکے سامنے ہیں خود میں حصہ نہیں لے سکوں گا لیکن اُن میں جو مشکل ہے اور اسکی جو عظمت ہے اُسکا کسی قدر اندازہ رکھنے کے باعث میں آپکی کوششوں کا عظیم اور ہمدردانہ دلچسپی سے مشاہدہ کرتا رہونگا اور یہ یقین کرونگا کہ نتیجہ وہ ہوگا جس سے آپکے پیشے کو عزت اور آپکے ملک کو عظیم منافع حاصل ہونگے۔ اب اسطرح آپکی کارروائیوں پر خدا کی برکتوں کی دعا کرتے ہوئے مجھے افتتاحی خطبے کو ختم کرنیکی اجازت مرحمت ہو۔ (ترجمہ)

خطبۂ صدارت

از نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر اٹ لا

محترم صدرِ کانفرنس و معزز حضرات - کل ہند کانفرنس قانون جسکو پہلی مرتبہ حیدرآباد میں منعقد کیا گیا ہے اور جس کے متعلق تمام مشاہیر قانونی نے اپنے اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے اُسکی صدارت کی اتفاق سے کچھ ایسی صورت رہی کہ جن حضرات کو صدارت کے لئے منتخب کیا گیا تھا ان میں سے بعض کسی نہ کسی وجہ سے شرکت نہ فرما سکے - چنانچہ آج کے جلسے کی صدارت کے لئے ہمارے ممتاز ایڈوکیٹ جناب دیوان بہادر اروامودو اینگار صاحب منتخب ہوئے تھے لیکن وہ کسی اہم ضرورت سے بیرون حیدرآباد چلا جانے کی وجہ سے آپ کا یہ قرعہ فال مجھ پر پڑا ہے اور میں آپ کے حکم کی تعمیل میں اس اہم ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں اور اس عزت افزائی کے لئے خلوص دل سے شکر گذار ہوں -

اب قبل اسکے میں بعض مسائل پر اپنے خیالات ظاہر کروں آپ کو دیوان بہادر کا خطبہ پڑھکر سناؤنگا جو صاحب موصوف نے اس جلسہ کے لئے مرتب کیا ہے - اُمید ہے کہ صاحب موصوف کے قیمتی خیالات سے آپ ہم مستفید ہونگے -

خطبہ پڑھنے کے بعد یہ تقریر کی گئی :-

حضرات - میں سمجھتا ہوں کہ جن حضرات نے اس آل انڈیا لا کانفرنس کی بنیاد ڈالی ہے وہ قابلِ مبارکباد ہیں - یہ پہلا اجتماع ہے کہ جس میں ارکین عدالت، پروفیسرس وو کلا رشتہ کہ طور پر باہم تبادلہ خیالات کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں تاکہ قانون کی اصل غرض و غایت بہتر طور پر حاصل ہو اور اس خصوص میں جو مفید تجاویز حاصل ہو سکتے ہیں انکو

رو بہ عمل لایا جائے۔ مجھکو افسوس ہے کہ اتنا موقع نہیں ملا کہ میں اپنے خیالات قلمبند کرسکوں اسلئے کہ ایسی محفل میں جہاں حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد کے قانون سے خاص دلچسپی رکھنے والے ممتاز حضرات موجود ہوں فی البدیہہ تقریر کی کوشش کرنا ایک بیجا جرأت ہے۔

حضرات۔ پہلا مسئلہ جس کے متعلق میں آپکی توجہ منعطف کرنا چاہتا ہوں وہ حیدرآباد کی آئینی دستوری حیثیت کا مسئلہ ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس خصوص میں جس قدر توجہ علمی نقطہ نظر سے قانون دان حضرات کی ہونی چاہیئے اس وقت تک نہیں ہوئی ہے۔ حیدرآباد کی دستوری حیثیت کے تعین کے لئے اسکی تقریباً (۲۰۰) سالہ تاریخ پر غور کرنا ہوگا۔ اور نہ صرف ان تعلقات پر جو سلاطین مغلیہ سے تھے اور رفتہ رفتہ ہوتے ہوتے منقطع ہوگئے بلکہ ان معاہدات و تہہ نامجات پر بھی تفصیلی نظر ڈالنا ہوگا جو سلاطین آصفیہ نے مختلف اقوام بالخصوص ایسٹ انڈیا کمپنی سے کئے ہیں۔ نیز ان امور پر بھی غور کرنا ہوگا کہ مرور زمانہ کی وجہ کیا اشکال پیدا ہوئے اور اسکی حیثیت قانونی کیا ہے۔ اس خصوص میں مثالاً یہ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ حیدرآباد کے اقتدار اعلیٰ کا وہ جزء جس کا تعلق دوسری حکومتوں سے معاہدات اور معاملات کرنے کا ہے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور بالاخر حکومت برطانیہ کے مشورے کا تابع کیا گیا ہے۔ اسطرح حیدرآباد کے ساورنٹی (اقتدار اعلیٰ) کے متعلق آپکو علمی نقطہ نظر سے بہت کچھ چھان بین کرنی ہیں تاکہ صحیح صورت حال واضح ہو اور اہل ملک کی رہنمائی ہوسکے۔ مجھکو یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ جن حضرات نے مختلف تہہ نامجات وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ محسوس فرمائینگے کہ قطع نظر چھوٹی ریاستوں کے ریاست میسور، کشمیر جیسی ریاستوں کے آئینی حیثیت میں اور سلطنت حیدرآباد کی آئینی حیثیت میں بین فرق اور امتیاز ہے۔ میں سیاسی مسائل میں آپ کو لیجانا نہیں چاہتا لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اسکی شدید ضرورت ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق علمی اور قانونی نقطہ نظر سے تحقیق اور جانچ کیجائے اور مملکت حیدرآباد کی دستوری حیثیت کے متعلق کوئی مستند مقالہ یا کتاب لکھی جائے۔

مجھکو بطور خاص بیرون ملک سے تشریف لانے والے حضرات سے توقع ہے کہ حیدرآباد کے
دستوری مسائل پر بنظر غائر توجہ فرمائینگے اور عام طور پر ریاستوں کے ساتھ مملکت حیدرآباد کو
شریک کرکے مثل ایک ریاست کے جو غور کیا جاتا ہے اسمیں امتیاز فرمائینگے تاکہ ہندوستان کی
دستوری تبدیلیوں میں حیدرآباد کو صحیح مقام حاصل ہوسکے۔

اسکے بعد دوسرا مسئلہ جسکی طرف میں آج کی صحبت میں آپکی توجہ منعطف کرانا چاہتا ہوں
وہ مسئلہ حیدرآباد کے عطیات یعنے جاگیرات سمستانات وغیرہ کا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ
برطانوی ہند میں بڑی زمینداریاں اور مماثل اسٹیٹ پائے جاتے رہے۔ لیکن حیدرآباد میں
ایک خاص قانونی سسٹم عطیات کی حد تک نشو نما پایا ہے جو خاص امتیاز رکھتا ہے عطایاء
کے متعلق ایک تفصیلی تختہ جس میں نہ صرف مختلف اقسام عطایاء کے بتلائے گئے ہیں بلکہ
دیگر تفصیلات بھی ظاہر کئے گئے ہیں میرے شریک نواب محمد بدرالدین خاں لکچرار عثمانیہ
یونیورسٹی نے مرتب کیا ہے جو قانونی نمائش میں جس کا انعقاد اسی سلسلہ میں ہوا ہے
آویزاں کیا گیا ہے۔ لیکن میں بعض خصوصیات کی طرف آپ کی توجہ منعطف کراونگا تاکہ آپ
حضرات اس طرف توجہ کریں اور جانچ اور تحقیق کے بعد مفید معلومات فراہم کرسکیں۔

حیدرآباد میں تقریباً رقبہ کا ⅔ حصہ جاگیرات و سمستانات وغیرہ میں بشکل عطایاء
دیا گیا ہے جسکی موجودہ آمدنی تقریباً چار کروڑ ہے اور جس کے متعلق معمولی عدالت ہائے
دیوانی کو اختیار سماعت حاصل نہیں ہے بلکہ اسپیشل عدالت عطیات مقرر کیگئی ہے چنانچہ
قانون اور ضابطہ عطیات کے متعلق بیرون ملک کے ممتاز ایڈوکیٹس نے بھی بعض مشکلات کو
محسوس فرمایا ہے جن کو مستند تصفیہ و تالیف سے دور کیا جانا ضروری ہے۔

اس عطیہ جائداد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر عطیہ دار کے انتقال پر یہ جائداد
معطی کے حق میں مسترد ہوتی ہے نہ صرف یہی بلکہ قانونی نقطہ نظر سے معطی مقتدر یعنی
فرمانروائے مملکت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ معطی لہ کے زندگی میں بھی اس جائداد کو

اس سے واپس لے لیں۔ لیکن سلاطین آصفیہ کے روایات یہ رہے ہیں کہ معطی لہ کے خاندان میں معاش تابع تحقیقات وراثت جاری رکھی جائے۔ چنانچہ حضرت غفران مکانؒ نے فرمان مبارک میں جو بذریعہ گشتی نشان (۱۷) بابتہ ۱۳۱۲ف نافذ ہوا ہے یہ واضح کیا ہے کہ سلاطین آصفیہ کی پالیسی معطی لہ کے خاندان کی پرورش رہی ہے اور رہے گی۔ چنانچہ اعلیحضرت بندگانعالی نے بھی بمراحم خسروانہ اسی پالیسی کی توثیق فرمائی ہے اور روایات قدیمہ کے احترام میں ہر معطی لہ کے ورثاء کو معاش دیجاتی رہی ہے۔ یہ مسائل ایسے ہیں جن میں علمی جستجو اور توجہ کی ضرورت ہے تاکہ قانونی صورت حال واضح ہو۔

دوسری خصوصیات عطیات کی یہ ہے کہ ہر معاشدار کے انتقال پر نہ صرف وراثت لازمی ہے بلکہ احکام شرع و شاستری جن کی پابندی جائداد خانگی میں جیسے لازماً ہوتی ہے جائداد عطیہ سلطانی میں نہیں کیجاتی چنانچہ فرمان مبارک مرقومہ ۷ ربیع الاول ۱۳۴۷ھ جس کو "فرمان راست ورثاء" کہا جاتا ہے اور جس سے بعض ورثاء شرعی و شاستری محروم ہوتے ہیں کارروائی ہائے وراثت میں قانون کا درجہ رکھتا ہے اسی طرح دختران کے حقوق کے متعلق جو احکام ہیں اور تبنیت کے متعلق جو گشتیات ہیں ان سے واضح ہوگا کہ احکام شرع و شاستر میں تا بحد عطیۂ سلطانی تبدیل و ترمیم کیگئی۔ عطیات کا یہ پہلو بھی کافی وضاحت طلب ہے۔

تیسری چیز عطیات کے سلسلے میں جو میں آپکی توجہ میں لانا چاہتا ہوں وہ ان معاشوں سے متعلق ہے جو باغراض مذہبی درگاہ و دیول وغیرہ کے نام دیئے گئے ہیں۔ اس نوعیت کی معاشوں کے متعلق خاص احکام ہیں تاکہ جس مقصد کے لئے یہ معاشیں دیگئی ہیں وہ بدرجہ احسن پورے ہوں۔ اس قسم کی بھی لاکھوں کی معاشیں ہیں جن سے عرس جاترا وغیرہ کے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ان معاشوں کا بلحاظ احکامِ سند و ضروریات مذہبی بہترین مصرف کیا ہو سکتا ہے۔

یہ چند امور ہیں جن کے متعلق میری درخواست ہے کہ آپ حضرات اپنی توجہ

منعطف کر کے ایسی تحقیق و جانچ فرمائیں جو صحیح رہنمائی کا باعث ہو سکے۔ میں ممنون ہوں کہ آپ حضرات نے میری گذارشات کو بتوجہ خاص سماعت فرمایا۔ اب میں اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے ڈاکٹر میر سیادت علیخاں صاحب سے خواہش کرتا ہوں کہ وہ اپنا مقالہ سنائیں صاحب موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں میں اسقدر ضرور کہونگا کہ اگرچہ ڈاکٹر صاحب انتظامی محکمہ میں کام فرمارہے ہیں لیکن علمی ذوق ویسا ہی قائم ہے جیسا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسری کے زمانہ میں تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا مقالہ پر از معلومات اور دلچسپ ہوگا۔

تقریر

رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو

بتاریخ ۱۸ ارشہریور سنہ ۱۳۵۳ف م ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء شام کے (۶) بجے بمقام ٹاؤن ہال کل ہند کانفرنس قانون کی خصوصی نشست میں جس کی صدارت سر عبدالقادر نے فرمائی سر تیج بہادر سپرو نے انگریزی میں ایک فی البدیہہ تقریر کی۔ اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:—

حضرات و اہل قانون!

مجھے اہل قانون و ارکان کل ہند کانفرنس قانون کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی مسرت حاصل ہو رہی ہے۔ میرے دل میں حیدرآباد کیلئے خاص احترام ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں کانفرنس کے ابتدائی اجلاسوں میں شریک نہ ہو سکا۔ مجھ سے سر مورس گایر نے تار پر خواہش کی تھی کہ کانفرنس کے افتتاح کے وقت اُن کی جگہ موجود رہوں۔ موصوف کے ولولہ انگیز اور عالمانہ خطبے سے جو انہوں نے از راہ عنایت بھیجا، آپ سب مستفید ہو چکے ہیں۔ موصوف بہ حیثیت ایک انسان اور ایک جج کے ایک عظیم مرتبت رکھتے ہیں میں انہیں پندرہ بیس سال سے جانتا ہوں اور ان کا اس کانفرنس سے تعاون کرنا ہر طرح اطمینان آفریں ہے۔ منتظمین کانفرنس نے مجھے ایک تقریر کیلئے مدعو فرما کر اپنی عنایت کا ثبوت دیا ہے۔

سر مورس گایر نے نہ صرف اپنے عہدے کو اپنی شخصیت سے اعزاز بخشا تھا بلکہ وہ قانون دانوں میں ایک ایسا بلند مرتبہ رکھتے ہیں جو قانون پیشہ لوگوں کو کم میسر ہوتا ہے جو الذکر روپیہ کمانا اپنا مقصد سمجھتے ہیں، علم قانون کو ترقی دینا نہیں۔ سر مورس کے چند فیصلے

بھی آپ پڑھیں تو آپ کو ان کی نظر کی وسعت اور رائے کی آزادی کا کھلا ثبوت مل جائے گا۔

حضرات آپ نے مجھے اپنی مہربانی سے مدعو کیا ہے۔ میں جرأت کرتا ہوں کہ اپنے چند خیالات علم قانون کے متعلق اور چند خیالات پیشۂ قانون کے متعلق عرض کروں۔

قانون پر بلاکسٹن کی مشہور کتاب پڑھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کے ہاں محض بے جان تذکرۂ قانون نہیں ہے بلکہ وہاں ایک انبج، ایک زندگی، ایک جاوید دلچسپی کا سامان ہے۔ ہندستانی جامعات میں علم قانون پر زیادہ توجہ نہیں ہوتی۔ محض خداداد قابلیتیں بھاشیم آئنگار جیسے لوگوں کو اس شعبے میں جگہ آپ پیدا کر لینے کے قابل بناتی رہی ہیں۔ ہمارے طلبہ کو محض ایکٹ پڑھائے جاتے ہیں اور وہ ان کی شرح رٹ لیتے ہیں۔ حالانکہ قانون شہادت وغیرہ کا علمی نقطۂ نظر سے مطالعہ بیحد ضروری ہے تاکہ اس پر حقیقی قدرت اور عبور حاصل ہو۔ قانون دستور تک ہمارے ہاں بے جان سا ہے۔ دستور سازی میں نظر کی وسعت اور ملک کے مستقبل کا اہتمام ہونا چاہیئے۔

ہندستان میں بڑے بڑے جج اور وکلا بہت سے ملینگے لیکن ماہرانِ علمِ قانون کی تلاش کی جائے تو خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ہم سید محمود اور سید امیر علی پر فخر کر سکتے ہیں۔ جسٹس سیّد محمود کے فیصلوں کو پڑھ کر ان کی نظر اور فکر کی وسعت سے میں حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔ یہ لوگ صرف جج ہی نہیں تھے بلکہ علم قانون کے ماہر بھی تھے۔ امیر علی کی عالمانہ تالیفیں آپ سب کو معلوم ہیں۔ لیکن ہمارا ہر جج ان کے جیسا عالم نہیں ملتا۔

ہمارے ملک میں قانون میں تحقیقی کاموں کی بڑی گنجائش باقی ہے۔ شرع و شاستر کے وسیع میدان اب تک سنسان پڑے ہوئے ہیں جہاں جولانیٔ طبع دکھانے والا کوئی شہسوار کم ہی جاتا ہے۔ بہت سے نظریے ایسے ہزاروں سال پہلے ہندو یا مسلمان ماہران قانون بیان کر چکے ہیں اور آج اسی چیز کو کوئی اہل مغرب بیان کرتا ہے تو ہم سر دھننے لگتے ہیں۔ پانچ سال

قبل حیدرآباد کی عدالت میں ایک اردو بحث کے وقت میں ایسے ہی مسائل عربی حوالوں سے معلوم کر کے حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ امام ابو یوسف کے بیان کردہ متعدد مسائل ایسے ہیں جو جدید بد ترین تصورات کی ہزار سال پہلے تکمیل کر چکے ہیں۔ غرض دھرم شاستر اور شرع شریف میں تحقیقات کی گنجائش غیر محدود ہے۔

اپنے مسلمان دوستوں سے میں کہونگا کہ اسلامی قانون صرف وہی نہیں ہے جو برطانوی ہند یا دیسی ریاستوں کی عدالتوں میں نافذ کیا جاتا ہے۔ اس کی وسعت اور اس کے حدود اس سے بہت زیادہ ہیں۔

حیدرآباد میں نظم عدل گستری کی اصلاحوں سے میں بڑا متاثر ہوا ہوں۔ حال میں اجلاس منصفہ کے اختیارات میں اضافہ ہو کر بھی ایک دیرینہ ضرورت کی تکمیل ہو گئی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حیدرآباد کا نظام مطلعیت کو پہنچ گیا ہے۔ بہرحال حیدرآباد میں جس آزادی سے اصلاحوں کو نافذ کیا جاتا ہے وہ اگر آئندہ بھی باقی رہے تو بڑی بڑی توقعات کی جاسکتی ہیں حیدرآباد نے ایک قانونی زبان بھی بنالی ہے جس طرح انگلستان وغیرہ میں ملکی زبان کے علاوہ ایک مستقل قانونی زبان ہے۔ اور یہ ضروری و ناگزیر ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ حیدرآباد کا اپنا بار سٹر کیوں نہ ہوا کرے۔ آپ کو اس پر توجہ کرنی چاہئیے

آپ کی کانفرنس اخلاقی خدمت بھی بہت کچھ انجام دے سکتی ہے۔ اور رہنیوں میں بھی اخلاق کی ترقی کی ضرورت ہے لیکن میں اس وقت صرف اپنے ہم پیشہ افراد کا ذکر کر رہا ہوں۔ ان کے اخلاق کا معیار بلند تر کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ انگلستان میں فضول اور بے وجہ مقدمہ بازی نہیں ہوتی اور وکلا ایسے مقدموں کو لیتے ہی نہیں اور موکل کی بے وجہ مقدمہ بازی کے لئے کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔

وکیل کو مذہبی تعصب سے بالا ہونا چاہئیے اور موکل کے مذہب کا قطعی لحاظ کئے بغیر انصاف حاصل کرنے کی اسے کوشش کرنی چاہئیے۔ ہندو موکل مسلمان کو اور مسلمان موکل ہندو کو وکیل مقرر کرے تو

تو وکیل کی حیثیت مسلمان یا ہندو کی نہیں بلکہ وکیل کی ہوتی ہے۔ اس بارے میں بھی ہم انگریز سے
ابھی سبق لے سکتے ہیں۔

حیدرآباد نے عدل گستری کی طرح قانون کی تعلیم اور علم کی بھی اتنی خدمت کی ہے کہ بے ساختہ داد
دینی پڑتی ہے۔ آپ کو کوشش کرنی چاہیئے کہ اس پہلو کو ترقی دیں اور ملک میں آپ کے ال ال بی بہترین
عالم قانون اور ماہر دستوریات سمجھے جائیں اور حیدرآباد سے بھی لوگوں کو وکالت کے لئے باہر جانا چاہیئے
جس طرح مثلاً میں باہر سے حیدرآباد آیا ہوں۔ آپ ہندستان کی سب سے مقدم ریاست سے تعلق رکھتے
ہیں۔ آپ کو قانون دستوری میں تحقیقات پر بطور خاص متوجہ و منہمک رہنا چاہیئے۔

اب تک ہم اپنی چیزوں کا انگریزی نقطہ نظر سے مطالعہ کرتے رہے ہیں اب ضرورت ہے کہ
اپنے نقطۂ نظر سے بھی مطالعہ کریں اور مثلاً مسئلہ اقتدار اعلیٰ اور اقتدار برتر کی تحقیقات اور تقابلی
مطالعہ بہت مفید امر ہو سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ نے جو کانفرنس یہاں آغاز کی ہے وہ اپنے تجاویز کو کامیاب کرائیگی
اور علم قانون سے دلچسپی بڑھانے میں حصہ لیگی۔ اس لئے مجھے آپ کے کام سے بڑی مسرت ہوئی اور
خلوص سے متمنی ہوں کہ ملک آپ کا ہاتھ بٹائیگا۔ آپ کے فینانس ممبر مولوی غلام محمد صاحب بھی آپ
کو ضرور دل کھول کر مدد دینگے۔ آپ کی حکومت ایسے علمی معاملات میں ہمدردی کے لئے شہرۂ آفاق
ہے۔ وہ ضرور آپ کی ضرورتوں کا پورا پورا لحاظ کریگی۔

عدل گستری کے بنیادی اصولوں کا ارتقاء

انصاف حاصل کرنے کا ابتدائی طریقہ

تمدن کو باہمی اختلاف کی قربان گاہ پر بھینٹ نہ چڑھا دینے کیلئے انسانی ذہن نے سلطنت اور حکومت کے آئینی طریقوں پر رسائی حاصل کرلی اور انسانوں کے مختلف گروہوں اور افراد کی روزمرہ زندگی اور نیز باہمی معاملات میں توازن قائم رکھنے کے لئے حکومت کے قواعد وضوابط میں ایک قومی محافظ تلاش کر لیا گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ انصاف رسانی کی یہ ارتقائی شکل صورت پذیر ہوتی ہر انسان اپنے حقوق کے اتلاف کی بناء پر ان کی بابحالی کیلئے اپنے حسب دل خواہ عمل کرنے لئے بالکلیہ آزاد تھا۔ مظلوم کا اپنے مخالف سے خود ہی انتقام لینا ابتدائی تمدنی زندگی کا عام طریقہ تھا[1]

تشدد آمیز طریقہ سے اپنی مدد آپ کر لی جاتی تھی اور اگر ضرورت ہوتی تو شخص متضرر کے دوست اور اصحاب قرابت کی تائید اور ان کا تعاون بھی حاصل ہو جاتا[2]

اس صورت حال نے ترقی کرکے جو نوعیت اختیار کرلی تھی اس کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے :-

"وحشی جماعت میں رشتہ نسب نے جو استحکام پیدا کر لیا تھا اسکی بناء پر اگر ایک رکن کوئی قصور کرتا تو اس قصور کا بدلہ لینے کے لئے کسی دوسرے ایسے رکن پر حملہ کیا جاسکتا جو اس قصور میں شریک نہ ہوتا۔ اس کا جرم صرف یہ ہوتا تھا کہ اس کی رگوں میں بھی وہی خون دوڑ رہا ہے جو صاحب قصور کی رگوں میں۔ ایک انتقام کا نتیجہ دوسرا انتقام ہوتا اور یوں خونی نزاعوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ صورت حالات شخصی

---

[1] ام۔ چمبرز۔ تاریخ دستور انگلستان۔ ترجمہ سید علی رضا۔ سلسلہ جامعہ عثمانیہ صفحہ (۳۶۷)

[2] سامنڈ۔ جورس پروڈنس۔ صفحہ ۱۱۴۔

جنگ کے مصداق تھی[1]۔

چنانچہ عرب قبل از اسلام میں اس قسم کے انتقامات نے قبیلوں کے قبیلے تباہ کر دیئے۔ نیز عورت کے بجائے مرد کو قتل کر دیا جاتا اور غلام کے بجائے آزاد کو[2] ثار[3] کے عقیدہ نے تو عرب بھر میں امن و اطمینان کو مفقود کر دیا تھا۔

بزرگ خاندان یہ حیثیت منصف اس کے بعد جب میل جول اور رشتہ کہ زندگی کے نظام نے ترقی کی تو بزرگ خاندان یا قبیلے کے شیخ پر انصاف رسانی کے فرائض انجام دینے کی ذمہ داری قرار پائی یہ لوگ اپنے قبائل کے گویا امیر و حکمران بھی ہوا کرتے تھے[4]۔ مثلاً اسلام سے پہلے عرب نے یہ منزل بھی طے کی ہے۔ اگر قبیلہ کے شیخ سے فیصلہ نہ ہو سکتا تو کاہنوں کو حکم بنایا جاتا۔ چنانچہ زمزم کے کنوئیں کی کھدائی کے موقع پر عبدالمطلب اور بعض عمائد قریش میں جو نزاع پیدا ہوا اس کے فیصلہ کے لئے شام کی ایک کاہنہ کے پاس فریقین کی روانگی عمل میں آئی[5]۔

تحکیم علاوہ ازیں زمانہ قبل اسلام میں قریش نے کچھ تمدنی زینے طے کر لئے تھے اور اپنی سرزمین کے انتظام کے فرائض مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیئے تھے[6]۔ چنانچہ تحکیم یا فصل خصومات کا فرض

---

[1]۔ اخلاقیات تالیف۔ ڈیوی۔ ترجمہ عبدالباری سلسلہ جامعہ عثمانیہ صفحات ۹۷۸ و ۹۷۹

[2]۔ الام تالیف امام شافعی صفحہ ۲۱ جلد ۶

[3]۔ ثار سے مراد یہ ہے کہ جب کسی قبیلہ کا کوئی شخص کسی موقع پر قتل ہو جاتا تھا تو مقتول کے قبیلہ پر انتقام لینا فرض ہو جاتا۔ سالہائے سال گزر جاتے لیکن جب تک قاتل کے قبیلہ کے کسی آدمی کو قتل نہیں کر لیا جاتا تھا اطمینان حاصل نہ ہوتا۔ یوں یہ سلسلہ ہر وقت جاری رہتا (ملاحظہ ہو سیرت النبی تالیف شبلی ص ۱۲۱ و ۱۲۲ حصہ اول مجلد اول طبع سوم اور جرجی زیدان۔ تمدن اسلام اردو ترجمہ از محمد حلیم انصاری جلد اول ص ۲۴۸) [4]۔ جرجی زیدان۔ تمدن اسلام اردو ص ۲۴۸ جلد اول [5]۔ سیرت ابن ہشام ص ۹۴ جلد اول مطبوعہ مصر [6]۔ جرجی زیدان۔ تمدن اسلام اردو حصہ اول ص ۲۳۔

قبیلہ بنی تمیم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس قبیلہ کے سردار گو یا موروثی طور سے عرب کے حکام عدالت تھے۔ یہ لوگ سال میں ایک مرتبہ کسی بڑے میلے مثلاً عکاظ میں جاتے اور اس جگہ ہر قسم کے دیوانی اور فوجداری مقدمات سنکر فیصلہ کرتے[1]

مملکت کی قوت

تمدنی ارتقاء کے ساتھ بالآخر ضرر رسیدہ افراد کیلئے مملکت کی قوت کا پشت پناہ بن جانا ضروری ہے[2]

"جرائم کے انسداد اور مجرموں کو سزا دینے میں شخصی قوت و اقتدار کے بدل کی صورت میں ایک جماعت مشترکہ کی حیثیت سے سلطنت کی قوت و اقتدار کا بطور آلہ کار مقرر ہو جانا ایک نہایت اہم عنصر ہے اس تبدیل ہیئت کا جو ابتدائی طریقہ کے ارتقاء کے بعد سلطنت نے حاصل کر لیا[3]"

لیکن سلطنت کی قوت و اقتدار کے مستحکم ہونے کے باوجود مختلف ممالک میں انصاف رسانی کے آئین و ضوابط پر ابتدائی رنگ بہت شدت سے چھایا رہا ہے۔ آزمائش غیبی (آرڈیل) اور تحقیقات بذریعہ جنگ (ٹرائل بائی بیاٹل) کے ضوابط خود حکومت کی رضامندی سے قایم تھے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر بطور مثال ہندوستان اور انگلستان کی قدیم تاریخ کی مدد سے ان ابتدائی ضوابط کا ایک خاکہ پیش کیا جائے۔

قوانین ہندوستان

منو کے زمانہ میں سلطنتی انصاف رسانی نے کافی استحکام حاصل کر لیا تھا۔ بریں ہم شخصی انصاف ستانی کو بھی منو نے بعض صورتوں میں جائز قرار دیا ہے مثلاً قرضخواہ کیلئے درست تھا کہ قانون اپنے ہاتھ میں لے لے اور بذریعہ قوت قرضہ وصول کرے[4]

---

[1] - ڈاکٹر محمد حمید اللہ کا مقالہ عدل گستری ابتدائے اسلام میں۔ (مجلہ عثمانیہ جلد ۱۱) ۱۹۳۸ء

[2] - سامنڈ جورس پروڈنس صفحہ ۱۱۴۔ [3] - سامنڈ جورس پروڈنس صفحہ ۱۱۴

[4] - بینی پرشاد - تھیوری آف گورنمنٹ ان اینشنٹ انڈیا مطبوعہ ۱۹۲۷ء صفحہ (۸۵)

نیز آزمائش غیبی بھی اس زمانے میں انصاف رسانی کا ایک مسلمہ قاعدہ تھا۔ کامیابی کے ساتھ پانی میں غوطہ لگایا جائے یا آگ اٹھائی جائے تو اس کو بے قصوری کا کامل ثبوت قرار دے دیا جاتا تھا[1]
قدیم ہندوستان میں تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ برابر رائج رہا چنانچہ آگے چل کر قرار دیا گیا کہ جب دستاویزی اور لسانی دونوں قسم کی شہادت میں شبہ پیدا ہو جائے یا جب دلیل و برہان ناکام ثابت ہو[2] یا جرم بوقت شب یا کسی سنسان مقام پر وقوع میں آئے[3] تو خدائی انصاف سے مدد لی جائے۔ زہر خوری نے بھی اب استناد حاصل کر لیا تھا[4]۔ علاوہ ازیں "وزن" کرنے کا بھی دستور جاری ہوا۔ مجرم کو دو وقت وزن کیا جاتا۔ اگر دونوں وقت وزن ایک ہی ہوتا تو اس کی بے قصوری ثابت ہو جاتی اگر دوسری مرتبہ وزن زیادہ ہوتا تو قصور ثابت ہوتا۔ اور خیال یہ کیا جاتا کہ گناہ نے وزن بڑھا دیا ہے۔ اگر وزن کرنے کے اثناء میں ترازو ٹوٹ جاتا یا اس میں کوئی اور خلل پیدا ہوتا تو اس سے بھی الزام ثابت قرار پا جاتا تھا[5]

بالعموم مقدمات زنا، قتل اور بغاوت میں اور جہاں شہادت موجود نہ ہوتی اس قسم کا طریقہ ثبوت اختیار کیا جاتا۔ کوئی شبہ نہیں کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کیلئے قواعد اور ضوابط مقرر ہو گئے تھے[6]۔ عورتوں اور برہمنوں کیلئے ہلکی آزمائش مقرر ہوتی[7]۔ اس زمانہ میں جب کہ البیرونی نے ہندوستان میں اس کی تہذیب سے ذاتی آگاہی حاصل کی یہ ضوابط برابر عمل پذیر تھے۔ پانی کی غوطہ زنی سے اب یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ کسی تیز بہاؤ کے دریا پر یا کسی گہرے کنویں پر ملزم کو لایا جاتا اور پانچ آدمی مل کر اس کو پانی میں ڈالتے اگر ملزم ڈوبنے سے بچ جاتا تو وہ اس کی بے قصوری کی

ع۱۔ بینی پرشاد۔ تذکرۂ صدر کتاب صفحہ (۸۸)
ع۲۔ بینی پرشاد دی اسٹیٹ ان انشنٹ انڈیا ص۳۲۵
ع۳۔ بینی پرشاد۔ تذکرۂ صدر کتاب ص۱۶۹
ع۴۔ بینی پرشاد۔ تذکرۂ صدر کتاب ص۱۷۹
ع۵۔ تفصیل ملاحظہ ہو بینی پرشاد کی تذکرۂ صدر کتاب میں ص۲۶۱
ع۶۔ بینی پرشاد کی تذکرۂ صدر کتاب ص۳۲۶ ع۷۔ بینی پرشاد۔ تذکرہ صدر کتاب ص۲۴۲ و ص۳۲۵

کافی حجت تھی ع[1]

اگر کسی شخص کی شہادت سے ملزم پر الزام قتل ثابت ہو جاتا تو زمانہ منو میں گواہ کو جھوٹ بولنے کی اجازت حاصل تھی ع[2]۔ گواہوں کی زیادتی موجب اشتباہ خیال کی جاتی ع[3] حکام عدالت اس امر کے بھی مجاز تھے کہ خفیہ ذاتی تحقیقات کی بناء پر فیصلہ کریں ع[4]۔ منو نے قرار دیا تھا کہ حاکم عدالت کو فیصلہ صادر کرنے میں قرائن کو بھی کام میں لانا چاہیئے۔ قرار دیا گیا تھا کہ احباب ساتھی اور دشمن کو شہادت دینے کا حق حاصل نہیں ہے[5]۔ گواہوں کی اخلاقی حالت اور ان کے عادات و خصائل اور کیرکٹر کو بہت وزن دیا گیا تھا[6]۔ جیسے کہ اسلامی فقہا نے بھی قرار دیا ہے۔ راجہ کو بہ حیثیت گواہ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا[7]۔ گواہ کا کام صرف ادائی شہادت ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک حیثیت سے اسیسر بھی تھا۔

انگلستان کا قانون انگلستان میں مستقل حکومت کے قیام کے بعد بلکہ ایڈمنڈ کے عہد تک بھی ارتکاب قتل کی صورت میں فریق کے اہل قرابت جنگ کے عادی تھے[8]۔ البتہ یہ امر صحیح ہے کہ پہلی سی شدت باقی نہ رہی تھی اور جیسے کہ سر جان سامنڈ نے وضاحت کی ہے کہ گو سیاکسن بادشاہوں کے قوانین کے ذریعے انتقام شخصی کی قطعی ممانعت عمل میں نہیں آئی لیکن اس کو ضابطہ و آئین میں مقید کر دیا گیا ع[9]۔

ع[1]۔ بینی پرشاد کتاب متذکرہ صد صفحہ ۴۴
ع[2]۔ بینی پرشاد تھیوری آف گورنمنٹ صفحہ ۸۸
ع[3]۔ ” ” متذکرہ صدر کتاب صفحہ ۱۳۸
ع[4]۔ ” ” ” ” صفحہ ۱۳۶
ع[5]۔ ” ” ” ” صفحہ ۸۶
ع[6]۔ ” ” ” ” ”
ع[7]۔ ” ” ” ” ”
ع[8]۔ تاریخ دستور انگلستان۔ ایم جیمبرز ترجمہ سید علی رضا صفحہ ۳۶
ع[9]۔ جورس پروڈنس صفحہ ۱۱۵۔

اس زمانہ میں ضابطہ کے رسمی امور اور اصطلاحات مقررہ کی بڑی شدت سے پابندی کی جاتی تھی۔ اگر کسی فقرے یا اصطلاح کو زبان سے ادا کرنے میں مجرم کی زبان کو لغزش ہو جاتی تو وہ جرم کے اثبات کے لئے کافی تھا[1]۔ خود عصری انگریزی ارباب قانون نے اب یہ امر تسلیم کر لیا ہے کہ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عادی مجرموں کو عدالت کی گرفت سے بچ جانے کا پورا موقع مل جاتا لیکن نو آموز یا بے خطا ملزم پھنس جاتا[2]۔

انگلستان کو قدیم ہندوستان کی طرح آزمائش غیبی کی منزل بھی طے کرنی پڑی ہے۔ تصدیق[3] حلفی (ویجر آف لا) میں جو نقائص پیدا ہو گئے تھے ان کی وجہ سے بارھویں صدی عیسوی میں آزمائش غیبی کا اصول رواج پا گیا[4]۔

آزمائش غیبی کے جو تین طریقے رائج تھے وہ یہ تھے

۱۔ آزمائش آب۔ ملزم کے ہاتھ پیر باندھ کر اس کو پانی میں پھینک دیا جاتا۔ اگر ملزم ڈوبنے سے بچ جاتا تو وہ اس کی بے گناہی کی دلیل تھی۔

۲۔ آزمائش آب گرم۔ ملزم اس امر پر مجبور کیا جاتا کہ وہ اپنا ہاتھ کھولتے ہوئے پانی میں ڈبو دے۔ بعد ازاں اس ہاتھ پر کپڑا باندھ کر مہر کر دی جاتی اور مسلسل تین روز ہاتھ اس طرح

---

[1] ۔ چیمبرز صفحہ ۳۶۹

[2] ۔ ،، صفحہ ۳۶۹

[3] ۔ ملزم اکثر حلف اٹھانے کے سوا اپنی صفائی میں دوسروں کی شہادت بھی پیش کر سکتا تھا لیکن گواہ اپنے حلف سے ملزم کے حلف کی تصدیق کرتے چونکہ اس قسم کے گواہوں کو اصل میں ملزم کی چال چلن کی تصدیق کرنی ہوتی تھی اور ان کو مقررہ الفاظ میں حلف اٹھانا پڑتا تھا اور اس میں بہت نزاکت تھی اس لئے یہ طریقہ متروک ہو گیا۔

[4] ۔ چیمبرز صفحہ ۳۷۰۔

سر بمہر رکھا جاتا اس اثنا میں چنگا ہو جاتا تو ملزم قصور سے بری ورنہ مجرم قرار دیا جاتا[1]۔

۳۔ آزمائش آگ۔ ملزم پر لازم تھا کہ ایک پونڈ وزنی جلتی ہوئی لوہے کی سلاخ ہاتھ میں لیکر تین قدم چلے[2]۔

ایسے ملزم جن پر کوئی سنگین الزام لگایا جاتا ان تینوں آزمائشوں کو برداشت کرنے پر مجبور تھے[3]۔

نارمن بادشاہوں کے زمانہ میں "شخصی انتقام" کے اصول نے ایک اور ارتقائی شکل اختیار کی اور آزمائش غیبی کے بجائے تحقیقات بذریعہ جنگ کا طریقہ جاری ہوا[4]۔ اس زمانہ میں ہر شخص کو یہ حق تھا کہ اپنی مدد اور اپنی حفاظت کے لئے خود ہی کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرے۔ یہ حق گویا ہر شخص کا فرض بھی تھا۔ اس لحاظ سے تحقیقات بذریعہ جنگ میں حکومت کو صرف یہ اقتدار حاصل تھا کہ قاعدہ و آئین کی پابندی کرائے[5]۔

"تحقیقات بذریعہ جنگ" سے مراد یہ ہے کہ ارجاع نالش کے بعد فریقین باہم دست و گریباں ہو کر اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے اور جب تک مدعی مدعیٰ علیہ پر غالب نہ ہو جاتا دعوے غلط خیال کیا جاتا[6]۔

نالشات اراضی میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر اکثر زمیندار پیشہ ور مشت زنوں کو نوکر رکھا کرتے اور مقدموں کے رجوع ہونے کی صورت میں نیابتی لڑائی کے طریقہ کو بھی قانونی استنا حاصل تھا۔ انصاف رسانی کیلئے تحقیقات کا یہ ضابطہ ۱۹ویں صدی کے اوائل تک ۔۔۔

ع۱۔ چمبرز ص۳۷۱ ۔ ع۲۔ چمبرز ص۳۷۱ ۔ ع۳۔ چمبرز ص۳۷۱ ۔ ع۴۔ چمبرز ص۳۷۱ ۔
ع۵۔ سامنڈ۔ جورس پروڈنس ص۱۱۵ ۔ ع۶۔ چمبرز ص۳۷۱
ع۷۔ چمبرز ص۳۷۱ ۔

انگلستان میں از روئے قانون جائز اور ملزم کو مستغیث کے مقابلہ میں طلب مبارزت
کا حق بجا طور سے حاصل تھا۔ ۱۸۱۹ء میں بذریعۂ قانون موضوعہ اس ضابطہ کی تنسیخ عمل
میں آئی۔[1]

جوری کے ذریعہ انصاف رسانی کا جو عمل درآمد رائج ہوا اس کی ابتدا میں چونکہ فریقین
مقدمہ کی باہمی رضامندی کے بغیر کوئی جوری مقدمہ میں اپنی رائے ظاہر کرنے سے معذور
تھی اس لئے ملزم کو رضامند کرنے کے لئے بڑی شدت برتی جاتی۔ ۱۲۷۵ء میں بذریعہ
قانون سنگین جرائم کے ملزموں کو قید میں تعزیر شدید کا حکم دیا گیا اور ملزم کی غذا میں
بتدریج کمی کی جاتی اور اس کو فاقون پر رکھا جاتا تا آنکہ ملزم یا تو جوری کے بلانے پر راضی
ہو جاتا یا اقبال جرم کرتا یا ہلاک ہو جاتا۔ ۱۷۷۲ء تک یہ طریقہ قانوناً جائز تھا۔[2]
اصل میں بات یہ تھی کہ سنگین جرائم کی پاداش میں ملزمین کی جائداد غیر منقولہ ضبط ہو جاتی
اور ان کے ورثہ کو محروم الارث کر دیا جاتا۔ اس لئے لامحالہ اقرار جرم یا طلبئ جوری پر
اظہار رضامندی کے عوض لوگوں کا رجحان ہلاک ہو جانے پر زیادہ مائل تھا۔ چونکہ کسی
ملزم کے خلاف جوری کے تصفیہ کے بغیر جرم ثابت قرار نہیں دیا جاتا تھا اس لئے اگر ملزم
کی ہلاکت قبل تصفیہ جوری واقع ہو جائے تو وارث اپنے ترکہ سے محروم نہیں ہو جاتے تھے۔[3]
بہرحال یہ عدلی نظریہ کہ سلطنت کی قایم کردہ عدالتوں کے سوا کسی دوسرے شخص کو
انصاف رسانی کا کوئی حق نہیں ہے بہت عرصہ پیشتر ہنری سوم (۱۲۱۶ء) کے زمانہ
میں مضبوطی سے قایم ہو گیا اور یہ قدیم اصول وضوابط ایک کے بعد ایک ختم ہو گئے۔

ع۱ - سامنڈ - جورس پروڈنس صفحہ ۱۱۵ -

ع۲ - جینکس صفحہ ۴۲۵ و ۴۲۶

ع۳ - جینکس صفحہ ۴۲۶

لیکن اس سے بہت قبل اسلامی شریعت جو اصلاح عمل میں لائی اس کا قدرے تفصیل سے تذکرہ بے محل نہ ہو گا۔

اسلامی حکومت نے انصاف رسانی اپنے ذمہ لی

مملکت کی قوت ضرر رسیدہ افراد کے لئے پشت پناہ جو بن جاتی ہے وہ صورت حال اسلامی معاشرہ میں بہت جلد پیدا ہو گئی۔ چنانچہ قرآن میں حضرت رسالت پناہ کو مخاطب کیا گیا ہے کہ

"سمّٰعون للکذب اکالون للسحت فان جاؤک فاحکم بینھم او اعرض عنھم وان تعرض عنھم فلن یضروک شیئا وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین"[1]۔

مطلب یہ ہے کہ "بڑے جاسوس جھوٹ کہنے والے اور بڑے حرام کھانے والے سو اگر آویں تجھ پاس تو حکم کر دے ان میں یا ان سے تغافل کر اور اگر تو تغافل کرے گا تو تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اور اگر حکم کرے تو حکم کر ان میں انصاف کا۔ اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو"[2]

یہ حکم ایک مخصوص حکم قرار دیا جا سکتا ہے لیکن دوسری جگہ صراحت سے یہ مذکور ہے کہ۔

"انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ ولا تکن للخائنین خصیما"[3]

اس کا مطلب یہ ہے کہ "ہم نے اتاری تجھکو کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں جو سوجھا دے تجھکو اللہ اور تو مت ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا"[4]

عا۔ القرآن سورہ المائدہ ع ۶۔ ع۲۔ شاہ عبدالقادر۔ موضح القرآن۔

ع۳۔ القرآن سورہ النساء ع ۱۷۔

ع۴۔ شاہ عبدالقادر۔ موضح القرآن۔

انگلستان میں از روئے قانون جائز اور ملزم کو مستغیث کے مقابلہ میں طلب مبارزت
کا حق بجا طور سے حاصل تھا۔ ۱۸۱۹ء میں بذریعۂ قانون موضوعہ اس ضابطہ کی تنسیخ عمل
میں آئی۔[1]

جوری کے ذریعہ انصاف رسانی کا جو عمل درآمد رائج ہوا اس کی ابتدا میں چونکہ فریقین
مقدمہ کی باہمی رضامندی کے بغیر کوئی جوری مقدمہ میں اپنی رائے ظاہر کرنے سے معذور
تھی اس لئے ملزم کو رضامند کرنے کے لئے بڑی شدت برتی جاتی۔ ۱۲۷۵ء میں بذریعہ
قانون سنگین جرائم کے ملزموں کو قید میں تعزیر شدید کا حکم دیا گیا اور ملزم کی غذا میں
بتدریج کمی کی جاتی اور اس کو فاقوں پر رکھا جاتا تا آنکہ ملزم یا تو جوری کے بلانے پر راضی
ہوجاتا یا اقبال جرم کرتا یا ہلاک ہوجاتا۔ ۱۷۷۲ء تک یہ طریقہ قانوناً جائز تھا۔[2]

اصل میں بات یہ تھی کہ سنگین جرائم کی پاداش میں ملزمین کی جائداد غیر منقولہ ضبط ہوجاتی
اور ان کے ورثہ کو محروم الارث کردیا جاتا۔ اس لئے لامحالہ اقرار جرم یا طلبی جوری پر
اظہار رضامندی کے عوض لوگوں کا رجحان ہلاک ہوجانے پر زیادہ مائل تھا۔ چونکہ کسی
ملزم کے خلاف جوری کے تصفیہ کے بغیر جرم ثابت قرار نہیں دیا جاتا تھا اس لئے اگر ملزم
کی ہلاکت قبل تصفیہ جوری واقع ہوجائے تو وارث اپنے ترکہ سے محروم نہیں ہوجاتے تھے۔[3]

بہرحال یہ عصری نظریہ کہ سلطنت کی قایم کردہ عدالتوں کے سوا کسی دوسرے شخص کو
انصاف رسانی کا کوئی حق نہیں ہے بہت عرصہ پیشتر ہنری سوم (۱۲۱۶ء) کے زمانہ
میں مضبوطی سے قایم ہوگیا اور یہ قدیم اصول وضوابط ایک کے بعد ایک ختم ہوگئے۔

ع۱ - سامنڈ - جورس پروڈنس صفحہ ۱۱۵ -

ع۲ - جیمبرز صفحہ ۴۲۵ و ۴۲۶

ع۳ - جیمبرز صفحہ ۴۲۶

لیکن اس سے بہت قبل اسلامی شریعت جو اصلاح عمل میں لائی اس کا قدرے تفصیل سے تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔

اسلامی حکومت نے انصاف رسانی اپنے ذمہ لی

مملکت کی قوت ضرر رسیدہ افراد کے لئے پشت پناہ جو بن جاتی ہے وہ صورت حال اسلامی معاشرہ میں بہت جلد پیدا ہو گئی۔ چنانچہ قرآن میں حضرت رسالت پناہ کو مخاطب کیا گیا ہے کہ

"سَمّٰعُونَ لِلْکَذِبِ اَکّٰلُونَ لِلسُّحْتِ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـًٔا وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ"[1]۔

مطلب یہ ہے کہ "بڑے جاسوس جھوٹ کہنے والے اور بڑے حرام کھانے والے سو اگر آویں تجھ پاس تو حکم کر دے ان میں یا ان سے تغافل کر اور اگر تو تغافل کرے گا تو تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اور اگر حکم کرے تو حکم کر ان میں انصاف کا۔ اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو"[2]

یہ حکم ایک مخصوص حکم قرار دیا جا سکتا ہے لیکن دوسری جگہ صراحت سے یہ مذکور ہے کہ۔

"اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا"[3]

اس کا مطلب یہ ہے کہ "ہم نے اتاری تجھ کو کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں جو سوجھا دے تجھ کو اللہ اور تو مت ہو دغا بازوں کی طرف سے جھگڑنے والا"[4]

ع۱ - القرآن سورہ المائدہ ع ۶۔ ع۲ - شاہ عبدالقادر - موضح القرآن۔

ع۳ - القرآن سورہ النساء ع ۱۷۔

ع۴ - شاہ عبدالقادر - موضح القرآن۔

قدیم ابتدائی زمانہ کا قاعدہ کہ ایک کا بدلہ دوسرے سے لیا جاسکتا ہے اسلام نے ابتداء سے قطعی طریقہ پر منسوخ کر دیا۔ قرآن کا حکم ہے کہ۔

"ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخری"[1]

خطبۂ حجۃ الوداع میں جناب رسالت مآب نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

"الا لا یجنی جان الا علی نفسہ الا لا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ"[2]

یعنی ہاں مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے۔ ہاں باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں ہے اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔

اس بناء پر فقہا نے قرار دیا ہے کہ "ان اللہ انما الزم کل مذنب ذنبہ ولم یجعل جرم احد علی غیرہ"[3]

بہرحال مدینہ جب حکومت اسلامیہ کا مستقر ٹھہر چکا اور ابتدائی انتظامات سے امیر اسلام نے فراغت حاصل کر لی تو آپ نے بذریعہ تحریر اپنے عدالتی حقوق و فرائض کا اعلان عام کر دیا۔ آپ نے قطعی طور سے طے کر دیا کہ۔

۱۔ آئندہ انصاف رسی منفرد کے ہاتھ میں نہیں رہے گی۔

۲۔ انصاف رسانی پوری جماعت مسلمانان کا فریضہ قرار پائے گی۔

۳۔ ہر قسم کے جھگڑے کے لئے رسالت پناہ کا فیصلہ آخری ہوگا۔

۴۔ انصاف رسانی میں کسی کی رشتہ داری کا پاس نہ ہوگا گو ملزم کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ الفاطر ع ۲ الزمر ع ۱۔ الشوری، النجم ع ۲۔

[2] شبلی نعمانی سیرت النبی حصہ اوّل جلد دوم طبع دوم ص ۱۶۲ بحوالہ ابن ماجہ و ترمذی۔

[3] امام شافعی الام ص ۲۱ جلد ۶۔

۵۔ کسی مجرم کو کوئی شخص پناہ نہیں دے گا۔[1]

اسلامی فقہائے اس بارے میں جو مسلک قرار دیا ہے اس کی توضیح

واضح ہو کہ بعض حالات میں فریقین کو اس بات کی اجازت ہے کہ کسی حکم یا ثالث کے ذریعہ اپنے معاملات کا تصفیہ کر لیں بشرطیکہ ثالث کا فیصلہ مطابق احکام شریعت یا قانون ہو چنانچہ زن و شوہر کے اختلافات کی صورت خود نص قرآنی ہے کہ "فابعثوا حکما من اھلہ وحکما من اھلھا ان یریدا اصلاحا یوفق اللہ بینھما"[2] یعنی شوہر کے لوگوں میں سے ایک شخص کو حکم بنا اور عورت کے لوگوں میں سے ایک شخص کو اگر وہ اصلاح کا ارادہ کرلیں تو اللہ دونوں کو توفیق دے گا۔

امام مالک نے تحکیم جائز قرار دی ہے۔ امام شافعی نے تو اپنے ایک قول میں اسکو جائز ہی نہیں رکھا ہے[3]۔ غالباً اسی وجہ سے شافعی فقہاء میں باہم اختلاف رائے ہو گیا ہے بعض اصحاب کی رائے ہے کہ تحکیم اس وقت درست ہو سکتی ہے جب کہ کسی مقام میں قاضی موجود نہ ہو۔ بعض کی رائے ہے کہ تحکیم صرف جائداد کی حد تک درست ہے۔ قصاص و نکاح و اسی طرح میں درست نہیں لیکن عام طور سے شافعی ارباب فقہ نے حدود کے سوا باقی امور میں تحکیم جائز رکھی ہے[4]۔ امام اعظم کے پاس تحکیم کا جواز ثابت ہے بشرطیکہ ثالث

ع[1] ۔ یہ تحریر دراصل ایک معاہدہ تھا جو ایک طرف انصار و مہاجرین میں منعقد ہوا تھا تو دوسری طرف اہل اسلام اور یہود میں۔ ملاحظہ ہو ڈاکٹر طیب اللہ کا مقالہ عدل گستری ابتدائے اسلام نیز دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت نیز سیرت ابن ہشام ص ۱۷۸ و ص ۱۷۹ جلد اول مطبوعہ مصر۔ یہ امور خود قرآنی آیات سے بھی ثابت ہیں ان پر علیحدہ کبھی لکھا جائیگا۔ ع[2] ۔ قرآن شریف سورۂ النساء ع[3] ۔ قاضی ابن رشد۔ ہدایۃ المجتہد ص ۳۸۴ جلد ۲ مطبوعہ آستانہ ۱۳۳۳ھ ع[4] ۔ امام نووی المنہاج ص ۱۳۶ مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ

کا فیصلہ قاضی کی رائے کے مطابق ہو۔[1]

بہرحال فقہاء نے یہ امر قطعی طور سے طے کر دیا ہے کہ حدود اور قصاص یا جیسے کہ فتاویٰ عالمگیری میں بتایا گیا ہے حقوق اللہ (پبلک رائٹس) میں تحکیم کسی طرح درست نہیں ہے۔[2]

ان امور میں حکم جاری کرنا اور اس حکم کو نافذ کرنا امام (سلطنت) کا ہی فرض ہے۔[3]

فقہاءِ متاخرین کی یہ قرارداد کہ حدود و قصاص کے علاوہ باقی ابواب میں جیسے کہ طلاق و نکاح کے معاملات میں تحکیم جائز ہے، صاحب ہدایہ نے صحیح تسلیم کر لی ہے لیکن ساتھ ہی بیان کیا ہے کہ یہ قول مفتی بہ نہیں ہے۔ بعض ارباب فقہ نے قرار دیا ہے کہ حکم یا ثالث کا فیصلہ سرکاری حکام عدالت کی توثیق کا محتاج ہوتا ہے۔[4]

ثالث یا حکم کے لئے ضروری ہے کہ اس میں وہ اوصاف وصفات موجود ہوں جو سرکاری حاکم کے لئے لازمی قرار دیئے گئے ہیں۔[5]

نامناسب نہیں ہے اگر ثالث کی حیثیت پر یہاں یہ اشارہ کر دیا جائے کہ ثالث کی حیثیت فریقین کے مابین بعینہ اسی طرح ہے جیسے کہ قاضی کی حیثیت جمیع افراد کے ساتھ۔ ثالث کا حکم اس وقت تک نافذ نہیں ہو سکتا جب تک کہ فریقین اس کے فیصلہ پر رضامند نہ ہو جائیں یا دوسرے الفاظ میں جو افراد اپنی مرضی سے ثالث کا تصفیہ تسلیم کر لیں صرف انہیں کے حق میں یہ تصفیہ جاری ہوگا بخلاف اس کے قاضی کا فیصلہ نافذ ہونے میں کسی کی رضامندی یا غیر رضامندی کو دخل نہیں ہے۔ قاضی کا حکم حکومت کی جانب سے پوری قوت کے ساتھ

ع[1] - قاضی ابن رشد - بدایۃ المجتہد ص ۳۸۴ - ع[2] - فتاوی عالمگیری ص ۴۷۸ جلد ثالث طبع کلکتہ ۱۲۴۶ھ - ع[3] - الھدایہ جلدین آخرین ص ۱۲۷ مع تعلیقات -

ع[4] - الھدایہ ص ۱۲۹ جلدین آخرین -

ع[5] - الھدایہ ص ۱۲۷ جلدین آخرین -

نافذ کرایا جائے گا[1]

غرض ابتدائی زمانہ کے اس طریقۂ انصاف رسی کو کہ جس کی وجہ سے زبردست زیردست پر غالب ہو جاتا تھا اسلام نے اپنے آغاز سے ہی بالکلیہ رد کر دیا۔ انفرادی انصاف یابی کے نقصانات کو اول سے ہی محسوس کر لیا گیا۔ اسلام نے پہلے جو طریقہ رائج تھا اس میں جو انقلاب پیدا کیا گیا وہ فوری تھا اور پوری قوت سے اس کو نافذ کیا گیا۔ اس قاعدہ کی پابندی جبری اور لازمی تھی۔ فریقین کے منشار اور مرضی کو اس میں کسی طرح دخل نہیں تھا۔ تمام مقدمات کا فیصلہ کرانے کے لئے حکومت کے مقرر کردہ حکام (قاضیوں) کے پاس رجوع ہونا ضروری قرار دیا گیا۔

وعلی القاضی مدار الاحکام والیہ النظر فی جمیع القضایا من القلیل والکثیر بلا تحدید[2]

تحکیم یا ثالثی کا جو طریقہ رائج رہا ہے اس میں بھی یہ نکتہ قابل لحاظ ہے کہ اس کے ذریعہ بھی انفرادی انصاف یابی کا دستور بالکلیہ رد کر دیا گیا اور کسی غیر متعلق شخص کے ذریعہ باہمی خصومات کا تصفیہ قرار پایا۔

اب اس سلسلہ میں یہ بات معلوم کرنا ضروری ہے کہ شریعت اسلامیہ کی رو سے "آزمائش غیبی" اور "تحقیقات بذریعہ جنگ" کے اصول کو کوئی استناد حاصل ہے یا نہیں۔ دعوی ثابت کرنے کے لئے آزمائش غیبی کی وہ صورتیں جو قدیم ہندوستان اور انگلستان کے قانون کی رو سے اوپر بیان ہوئیں وہ اسلامی نظم ونسق عدالت میں کبھی قابل لحاظ نہیں قرار دی گئیں۔

علامہ ابن عابدین نے صراحت کی ہے کہ حاکم عدالت کو حقوق العباد میں انفصال

ع۱۔ فتاوی عالمگیری جلد ۳ ص ۷۷۴

ع۲۔ معین الحکام ص ۔ ۴

مقدمات کیلئے جس ذریعہ پر کاربند ہونا لازم ہے وہ یہ ہے کہ دعوی پیش ہو اور اس پر حجت قایم کی جائے[1]

حجت میں آزمائش غیبی کی وہ صورتیں داخل نہیں ہیں جو جسمانی تکلیف کی موجب ہوں۔ قاضی ابن رشد نے واضح کیا ہے کہ انفصال خصومات کا دارو مدار چار امور پر ہے - وہ چار امور یہ ہیں :-

۱۔ شہادت - ۲۔ یمین (قسم یا حلف) ۳۔ نکول (انکار) ۴۔ اقرار۔

یہ چار صورتیں علٰحدہ علٰحدہ بھی پیش آسکتی ہیں - اور مرکب بھی[2] ان چار صورتوں پر ہی حجت کا اطلاق ہوتا ہے[3]۔

بہرحال خود قرآن پر رجوع کیا جائے تو روشن ہوتا ہے کہ اس نے انسانی باہمی معاملات کے انفصال کے لئے مافوق البشر یا مافوق العادت طریقوں کے اختیار کرنے کی کبھی ہدایت نہیں کی اس نے ہر جگہ صاف اور سادہ ذرائع کو اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے۔

اس کی مزید توضیح بے محل نہیں ہے

قرآن شریف کی طویل ترین آیت ، آیت مداینہ میں کھلے اور صاف الفاظ میں شہادت کی اہمیت ثابت کر دی گئی ہے۔

یہ بیان کر کے جس وقت کسی ادھار کی کوئی معاملت کسی وعدہ مقررہ کے لئے عمل میں آئے تو اس کو لکھ لینا چاہئیے - یہ بیان کیا گیا ہے کہ :-

---

[1] - ردالمحتار ص ۴۱۵ جلد ۴ -

[2] - بدایۃ المجتہد ص ۳۸۴ - جلد ۲ -

[3] - ردالمحتار ص ۴۱۵ - جلد ۴ -

"واستشهدوا شهیدین من رجالکم" یعنی اس معاملہ میں اپنے لوگوں میں سے دو افراد کو شاہد کر لینا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں حکم ہے کہ

"ولا یاب الشهداء اذا ما دعوا"

یعنی شاہدوں کو جب اداءِ شہادت کے لئے طلب کیا جائے تو ان کو حاضری سے انکار نہ کر دینا چاہیئے۔ یہ حکم تو ایسے معاملوں کے متعلق ہوا جن میں بدل نقد ادا نہیں کیا جاتا۔ لیکن ایسے معاملات میں بھی جہاں کہ سودا نقد ہو قیام شہادت کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں وارد ہے کہ

"ولا تکتموا الشهادة ومن یکتمها فانه آثم قلبه"[1]

یعنی گواہی چھپانی نہ چاہیئے۔ اگر کوئی چھپائے تو اس کا دل گنہ گار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص گواہی چھپاتا ہے یا غلط شہادت دیتا ہے اس کا دل پھر کسی نیکی کا سرچشمہ نہیں بن سکتا۔

یتامیٰ کو بعد بلوغ ان کی جائیداد واپس کرنے کے متعلق جو احکام صادر کئے گئے ہیں ان میں صراحت سے یہ حکم بھی ہے کہ

"فاذا دفعتم الیهم اموالهم فاشهدوا علیهم"[2]

یعنی جب یتامیٰ کے سپرد ان کی جائیداد کی جائے تو شہادت فراہم کر لینی چاہیئے۔ بستر مرگ پر اگر وصیت کی جائے تو اس کے سلسلہ میں جو ضابطہ مقرر کیا گیا ہے اس میں بھی شہادت کی تاکید کی گئی ہے[3]

زنا کی سزا کے متعلق جو احکام نافذ ہوئے ہیں اس میں بالصراحت یہ حکم ہے کہ بلا شہادت سزا نہ دی جائے گی[4]۔

ع[1]۔ سورہ بقرع ۳۹۔ ع[2]۔ النساء ع ۱۔

ع[3]۔ المائدہ ع ۱۴۔ ع[4]۔ سورہ نور ع ۱۔

طلاق کے احکام کے ذیل میں بھی بالصراحت یہ حکم دیا گیا ہے کہ شہادت قایم کر لینی چاہیئے[1]

ان ہدایتوں اور صریح احکام کے علاوہ صحیح طور سے ادار شہادت کا اہتمام اور اور اس کی حقیقی اہمیت متعدد مواقع پر ذہن نشین کرادی گئی ہے مثلاً ارشاد ہے کہ

"یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم اوالوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلوا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرا"[2]

مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان یا مسلمانوں کو انصاف پر قایم رہنا چاہیئے گواہی خدا کیلئے دینی چاہیئے اگر اس سے خود اپنی ذات یا والدین یا قرابت داروں کو نقصان ہوتا ہو تو اس کو خیال میں نہ لانا چاہیئے۔ نہ تو مالدار کی خاطر کرنی چاہیئے اور نہ محتاج پر ترس کھانا چاہیئے۔ انصاف کرنے میں اپنے خواہشات کی پیروی نہ کرنی چاہیئے۔ کہا جائے تو سچ لیکن اس طرح کہ شبہ واقع ہو یا بات پوری نہ کہی یا کچھ بات کام کی رکھ لی تو اللہ کو ان سب امور کی خبر ہے[3]

ایک دوسرے مقام پر وارد ہے کہ

"یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھداء بالقسط"[4]۔

یعنی مسلمانو! کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی "[5]

قرآن شریف کے ان احکام سے صاف واضح ہے کہ معاملات کے تصفیہ کے لئے شہادت پر ہی سب دارومدار ہے۔

---

[1] ۔ سورۂ طلاق ع ۱۔ [2] النساء ع ۲۰۔ [3] ۔ شاہ عبدالقادر، موضح القرآن۔
[4] ۔ المائدہ ع ۲۔ [5] ۔ موضح القرآن

اس جگہ رسالت پناہ کے عمل در آمد پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ

لو یعطی الناس بدعواھم لادعی رجال اموال قوم ودماءھم لکن البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کے دعوے پیش ہوتے ہی تسلیم کر لئے جائیں تو پھر لوگ دوسروں کے مال اور جان کا دعوے کرنے لگیں گے۔ بار ثبوت مدعی پر ہے اور قسم اس شخص پر جو انکار کرے

رسالت پناہ کے پاس ایک مقدمہ پیش ہوا۔ دعویٰ وراثت کا تھا اور بعض ایسی چیزوں کا جو بوسیدہ ہو گئی تھیں۔ آپ نے فریقین پر یہ بات واضح فرما دی کہ میں جو فیصلہ کروں گا وہ اپنی رائے سے کروں گا۔[2]

ایک مقدمہ ایسا پیش ہوا جس میں شوہر نے اپنی بیوی پر زنا کا الزام قایم کیا تھا۔ آپ نے مستغیث سے شہادت طلب فرمائی اور یہ بات قطعی طور سے واضح فرما دی کہ اگر مستغیث شہادت پیش نہ کرے تو اس کو حد قذف کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ مستغیث نے یہ عذر پیش کیا کہ شوہر کو اگر واقعہ نظر آئے تو آیا وہ شہادت فراہم کرنے کے لئے چل پڑے عذر مسموع نہ ہوا اور شہادت کا قیام ضروری قرار دیا گیا۔[3] (لعان کا حکم غالباً بعد کا ہے)

کئی مواقع پر رسالت پناہ نے یہ بات فریقین مقدمہ کے ذہن نشین کرا دی کہ میرے پاس جو مقدمات بغرض صدور فیصلہ پیش ہوتے ہیں ان میں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی فریق اپنے دلائل کو بیان کرنے میں زیادہ واضح ہو اس لئے ممکن ہے کہ یہ سمجھ کر کہ اس نے صحیح روئیداد پیش کی ہے

ع۱۔ النوادی الاربعین فی مباق الاسلام د قواعد الدین۔ مخطوطہ کتب خانہ سعیدیہ اور الشعرانی، کشف الغمہ عن جمیع الامہ ص ۲۹۴ جلد دوم۔ ع۲۔ الشعرانی، کشف الغمہ عن جمیع الامہ ص ۲۹۴ جلد دوم
ع۳۔ صحیح بخاری ص ۷۶۳۔ مرتبہ مولوی احمد علی۔ ع۴۔ صحیح بخاری ص ۱۰۳۱، ۳۶۸، ۳

میں اپنا فیصلہ اس کے حق میں صادر کردوں۔ اگر اس کا دعوےٰ فی الحقیقت مطابق واقعہ نہیں ہے تو اس کو یہ سمجھ لینا چاہئیے کہ دوسرے مسلمان کے جس حق پر اس کو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ دراصل آگ کا ایک شعلہ ہے۔ چاہے اس کو حاصل کرے یا نہ کرے[1]

غرض اسلامی فقہاء نے بطور ایک اصول کے یہ قرار دیا ہے کہ "دلوں کا حال اللہ ہی جانتا ہے اور اس پر اس نے عقاب مقرر کیا ہے اللہ کی مخلوق میں کوئی فرد اس امر کا مجاز نہیں ہے کہ علانیہ جو امور ظاہر ہیں ان کے سوا کسی اور بنا د پہ کوئی حکم لگائے[2]"

اس ضمن میں امام شافعی نے بیان کیا ہے کہ "کسی حاکم کو یہ بات جائز نہیں ہے کہ کسی شخص پر بیان کردہ امور سے ہٹ کر کوئی حکم لگائے۔ معاملہ کے متعلق نیت بسبب ظن اور تہمت کے بارے میں جو امر اللہ تعالیٰ نے حاکم سے پوشیدہ رکھا ہے اس کی بناء پر کسی شخص کے خلاف کوئی حکم جاری نہ کرے[3]"

اس اصول کو ایک اور مقام پر امام شافعی نے یوں دہرایا ہے۔ "سارے اسرار اللہ ہی جانتا ہے۔ حلال و حرام اسکے علم کے لحاظ سے ہی ہے۔ حکم ظاہر امر پر لگایا جائے گا چاہے یہ حکم ان اسرار الٰہی کے موافق ہو یا مخالف[4]"

بہر حال اسلامی حکام عدالت نے اپنا یہ اصول مقرر کیا ہے کہ "لا نحکم الا بالظواھر[5]"۔

"آزمائش غیبی" کے سلسلہ میں اس قدر بحث کافی متصور ہوگی۔ اب "تحقیقات بذریعہ جنگ" کے متعلق صراحت کی جاتی ہے۔ اوپر قرآن شریف کا یہ حکم نقل کیا جا چکا ہے کہ

"ولا تکسب کل نفس الا علیھا ولا تزر وازرۃ وزر اخریٰ"

---

[1] صحیح بخاری ص ۱۳۳۱ و ۳۶۸۔ [2] الام ص ۱۹۹ جلد ۶

[3] الام ص ۲۰۲ جلد ۶ ۔ [4] الام ص ۲۰۲۔

[5] تعلیق صحیح بخاری ص ۳۶۶۔

یہ حکم اس قدر عالمگیر ہے کہ اس کی وجہ سے تعدی کا بدلہ اصل تعدی کرنے والے کو چھوڑ کر دوسرے سے لینے کی ساری صورتیں ممنوع ہو گئیں۔ حجۃ الوداع کے موقع پر رسالت مآب نے جن صاف اور صریح الفاظ میں اس حکم قرآنی کی توضیح فرمائی اس کی بنا پر انسانی برادری بدلہ لینے کی ساری قدیم بندشوں سے آزاد ہو گئی۔ رسالت پناہ نے خود اپنے خاندان کے انتقام خون کو منسوخ فرما کر حکم قرآنی کی ہمہ گیری کا برملا اظہار فرما دیا۔

اسلامی قانون کی اس ساری طویل تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں مل سکتی کہ عدالت نے "تحقیقات بذریعہ جنگ" یا اس کے مماثل دوسری کسی اور صورت کو بربناد قانون جائز رکھا ہو اور اس کو عمل میں لانے کا حکم صادر کیا ہو۔

اس تفصیل کے بعد اب یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ اسلامی قانون کی رو سے امور مندرجہ ذیل کے بارے میں کیا ضوابط قرار دیئے گئے ہیں:۔

۱۔ یہ کہ اسلامی قانون کے اجرا میں آیا شرافت نسب یا عزت و ثروت کو کوئی اہمیت حاصل ہے۔

۲۔ آیا افراد کے ساتھ کس تعدی پر اس نقطۂ نظر سے توجہ کی جاتی ہے کہ وہ مشترکہ دولت کے ساتھ زیادتی ہے۔

۳۔ یہ کہ آیا عدالت میں اثبات دعوے کے بغیر کسی شخص کے حق کا استقرار یا کسی فرد کے جرم کا اثبات ہو سکتا ہے۔

۴۔ یہ کہ آیا حکام عدالت ایسے قواعد اور احکام کی پیروی کرتے ہیں جن کی عام اشاعت ہو چکی ہو۔

۵۔ یہ کہ آیا حاکم حسب ضرورت حکم نامہ گرفتاری جاری کر سکتا ہے۔

۶۔ یہ کہ حاکم عدالت کے سزا دہی کا حکم نافذ کرنے کے بعد اس کے عمل پذیری کی نگرانی کی ذمہ داری اس پر کس حد تک ہے۔

۷۔ یہ کہ فیصلہ صادر کرنے میں ایک موجود فی الخارج اور سب کے لئے یکساں معیارِ قانون کی پابندی کرنے کی کس حد تک ذمہ داری عائد ہے۔

ان مسائل کے من جملہ پہلے تین امور کے سلسلہ میں یہاں کچھ تفصیلات پیش کیجاتی ہیں۔

۱۔ شرافت نسب یا نسب و ثروت کا لحاظ قرآن میں عدل وانصاف کے متعلق جو احکام وارد ہیں وہ کسی قسم کی رعایتوں کے قیود و شرائط کے ساتھ مشروط نہیں ہیں۔ دوست و دشمن سب کے ساتھ بے لاگ انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ قرابت کا پاس اور دوستی کے حق کو انصاف رسانی میں کسی طرح حائل نہ ہونا چاہیئے۔ شرافت نسب یا عزت یا ثروت کا انصاف رسانی میں کوئی لحاظ نہیں ہے۔

حکم قرآن ہے کہ "واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل"[ع۱]

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے جھگڑے چکانے پڑیں تو انصاف سے کام لینا چاہیئے۔[۲]

دوسری جگہ یہ حکم وارد ہے کہ

"ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی"[ع۳]

مطلب یہ ہے کہ کسی قوم کی دشمنی کے باعث عدل نہ چھوڑنا چاہیئے عدل ضرور کرنا چاہیئے عدل تقوی سے قریب تر ہے[ع۴]

یہودیوں کے مقدمات کے سلسلہ میں حضرت رسالت پناہ کو قرآن میں یوں مخاطب کیا گیا ہے کہ "وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط"[۵]

یعنی اگر ان میں فیصلہ کیا جائے تو انصاف سے فیصلہ کرنا چاہیئے۔

شہادت ادا کرنے کے متعلق جو احکام دیئے گئے ہیں اس کے سلسلہ میں واضح کر دیا گیا

ع۱۔ النساء ع ۸ ع۲۔ شاہ عبدالقادر موضح القرآن ع۳۔ المائدہ ع ۲۔
ع۴۔ شاہ عبدالقادر موضح القرآن ع۵۔ المائدہ ع ۶ ع۶۔ النساء ع ۲۔

ہے کہ اگر شہادت کی وجہ سے خود اپنی ذات یا ماں باپ یا قرابت داروں کو کوئی نقصان ہوتا ہو تو اس کو برداشت کرنا چاہیے[1]

خود جناب رسالت پناہ نے اپنے عدالتی فیصلوں کے صدور کے مواقع پر اور ان فیصلوں کے تعمیل کے وقت یہ امر قطعی طور سے طے کر دیا کہ اجرائے انصاف محض انصاف کی خاطر ہونی چاہیئے

امام بخاری نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ قبیلہ مخزوم کی ایک عورت مسماۃ فاطمہ نے چوری کی۔ بعد ثبوت رسالت پناہ نے سزائے شرعی کے نفاذ کا حکم صادر فرما دیا۔ لوگوں نے بعد مشورہ حضرت اسامہ کو جناب رسالت پناہ کے پاس سفارش کے لئے آمادہ کر لیا۔ انہوں نے سفارش کی۔ سفارش کا کوئی اثر جناب رسالت پناہ نے نہیں لیا اور ایک عام خطبہ ارشاد فرمایا اور نہایت واضح طور سے سب کے ذہن نشین یہ بات فرما دی کہ سزائے شرعی سے کوئی مجرم چاہے وہ شریف ہو یا ذلیل نہیں بچ سکتا۔

دوران خطبہ میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ

"سابقہ قوموں کو اسی چیز نے گمراہ کر دیا۔ ان کی عادت تھی کہ شریف چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر ضعیف چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو محمد اس کا بھی ہاتھ کاٹ ڈالتا"[2]

حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ ہوئے اور پہلی مرتبہ خطبہ ارشاد فرمایا تو قطعیت کے ساتھ یہ بات بھی گوش گزار کر دی تھی کہ۔

"الا ان القوی عندی ضعیف حتی آخذ منہ الحق والضعیف عندی قوی حتی آخذ لہ الحق"[3]

اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ

---

[1] ۔ النساء ع ۲ ۔ [2] ۔ بخاری ۔ الصحیح ص ۱۰۰۳ ۔ [3] ۔ کنز العمال جلد ۳ ص ۱۲۸ ۔

آگاہ ہو جاؤ قوی میرے پاس ضعیف ہے تا آنکہ میں اس سے حق نہ حاصل کر لوں۔
ضعیف میرے پاس قوی ہے تا آنکہ میں اس کا حق نہ دلا دوں۔

حضرت عمر فاروق کے ایک یادگار مراسلہ میں جو ابو موسیٰ اشعری صوبہ دار کوفہ کا موسوم ہے یہ ہدایت بھی مرقوم ہے کہ "آس بین الناس فی وجھک و مجلسک و عدلک حتی لا ییاس الضعیف من عدلک ولا یطمع الشریف فی حیفک"[1]

مطلب یہ ہے کہ اپنی ذاتی حیثیت میں اپنے اجلاس پر اور اپنے انصاف میں سب کے ساتھ مساوات برتنی چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ کمزور حاکم کے انصاف سے مایوس ہو جائے اور صاحب اثر کو مروت اور رعایت کی امید پیدا ہو جائے۔

حاکم عدالت کے پاس فریقین کو جو مساوی حیثیت حاصل ہونی چاہیئے اور جس کی حضرت عمر نے اپنے حکم میں صراحت کی ہے اس سلسلہ میں خود ان کا ایک ذاتی واقعہ اس قابل ہے کہ اس کو یہاں بیان کیا جائے۔

ایک دفعہ حضرت عمر کو ابی بن کعب سے کسی امر میں اختلاف ہو گیا۔ اور بنا دعوے پیدا ہوئی۔ مقدمہ حضرت زید بن ثابت کے اجلاس پر پیش ہوا۔ حضرت عمر عدالت میں آئے تو حضرت زید نے اپنی جگہ خالی کر دی۔

حضرت عمر نے عدالت سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ پہلی نا انصافی ہے جو اس مقدمہ میں ظاہر ہوئی۔ یہ کہکر وہ دوسرے فریق کے بازو جا بیٹھے[2]

ان کے بیٹے ابو شحمہ نے شراب پی۔ جرم ثابت ہوا تو سزائے شرعی دی گئی اس سزا کے صدمہ سے انہوں نے وفات پائی۔ اس طرح حضرت عمر کے برادر نسبتی قدامہ بن مظعون بھی شراب پینے کے جرم میں ماخوذ ہوئے۔ علانیہ ان کو بھی آپنے (۸۰) درے لگوائے[3]

---

[1]۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ۔ [2]۔ مولانا شبلی الفاروق ص ۱۸۲ حصہ دوم۔

۲۔ عصری نقطۂ نظر کے بموجب قرار دیا گیا ہے کہ:۔

افراد کے ساتھ کوئی زیادتی واقع ہو تو اس پر اس زاویۂ نگاہ سے توجہ کی جائے گی کہ وہ دولت عامہ کے ساتھ زیادتی ہے۔

جناب رسالت پناہ کے ایک عہد کا تذکرہ اس سے قبل کیا جا چکا ہے۔ اس عہد میں یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ کسی فرد کے ساتھ زیادتی عمل میں آئے تو اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ زیادتی عام امت کے خلاف ہے۔ خود قرآن میں وارد ہے کہ انه من قتل نفسا بغير نفس او فسا د في الارض فكا نما قتل الناس جميعا ومن احياها فكا نما احيا الناس جميعا[۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو مار ڈالنے یا ملک میں فساد مچانے کے بغیر کوئی کسی کی جان لے بیٹھے تو گویا اس نے سب کو مار ڈالا اور جس نے کوئی جان بچائی تو گویا اس نے سب کی جان بچائی۔

اس توضیح سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ جرم گو کسی فرد کے خلاف کیوں نہ ہو بحیثیت مجموعی وہ پورے معاشرہ کے خلاف صادر ہوتا ہے۔ سلطنت اور حکومت بہ لحاظ محافظ معاشرہ کے خلاف صادر ہوتا ہے۔

۳۔ مسئلہ یہ ہے کہ حکام عدالت کے اجلاس پر اثبات دعوے کے بغیر کسی شخص کے حق کا استقرار یا کسی فرد کے جرم کا اثبات ہو سکتا ہے یا نہیں۔

یہ بات ہمیں معلوم ہو چکی ہے کہ اسلامی ارباب قانون نے بالاتفاق یہ بات طے کر دی ہے کہ حاکم عدالت یا قاضی ہر حق کا فیصلہ کر سکتا ہے چاہے یہ حق حقوق اللہ سے متعلق ہو یا حقوق الناس[۲] سے

ع۱۔ المائدہ ع ۵ ع۲۔ ابن رشد۔ بدایۃ المجتہد ص ۳۸۴ جلد دوم۔

"وعلی القاضی مدار الاحکام والیہ النظر فی جمیع القضایا من القلیل والکثیر بلا تحدید"[1]

حضرت عمر نے ابو موسیٰ الاشعری کو جو حکم نامہ بھیجا تھا اس میں صراحت سے یہ بھی لکھا تھا کہ
"ان لا یقضی الا بیسر" امر نمبر ۴ یعنی یہ کہ حکام عدالت ایسے قواعد و احکام کی پیروی کرتے
ہوں جن کی عام اشاعت ہو چکی ہو نیز امر نمبر ۵ یعنی یہ کہ فیصلہ صادر کرنے میں ایک موجود فی الخارج
اور سب کے لئے یکساں معیار قانون کے حکام عدالت کس حد تک پابند ہیں ان کے
سلسلہ میں یہ واضح ہے کہ قرآن کے احکام سے تجاوز نہیں ہو سکتا جس کی عام اشاعت
اور موجود فی الخارج ہونے اور سب کے لئے قابل پابندی ہونے کے متعلق کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔
امور ۵ و ۶ کے متعلق بھی فقہی کتابوں سے حوالے ملتے ہیں لیکن یہاں تطویل کا اندیشہ ہے۔
غرض اسلامی شریعت اور فقہ کی آواز باز گشت کے طور پر ہی ابتدائی زمانہ کے آئین و
ضوابط ایک کے بعد ایک ختم ہو گئے اور اب ان کی جگہ ایک ایسی صورت معاملات نے لے لی ہے
جس میں سلطنت کا ایک با اختیار قایم مقام اور ناطرفدار ثالث :۔

۱۔ افراد کے ساتھ زیادتی پر اس حیثیت سے توجہ کرتا ہے کہ وہ دولت عامہ کے
ساتھ زیادتی ہے۔

۲۔ مفروضہ زیادتی کرنے والے کو گرفتار کرتا ہے۔

۳۔ تعین جرم میں ایک موجود فی الخارج اور سب کے لئے یکساں معیار فیصلہ یعنی قانون سے
کام لیتا ہے۔

۴۔ مفروضہ زیادتی کرنے والے پر ان قواعد کارروائی بشمول قواعد شہادت و ثبوت کے
مطابق مقدمہ چلاتا ہے جن کی عام اشاعت ہو چکی ہے۔

ع۱۔ معین الحکام ص۴

ع۲۔ شاہ ولی اللہ۔ و ازالۃ الخفا ص۱۱۹ مطبوعہ بریلی۔

۵ ۔ بصورت ثبوت زیادتی کرنے والے کی سزا دہی اپنے ذمہ لیتا ہے[1]

۶ ۔ اور کسی ملزم کو جب تک حسب ضابطہ اور قانون کی رو سے قانون کی بنا کردہ عدالتوں میں تحقیقات نہ ہو جائے جسمانی یا مالی سزا نہیں دی جا سکتی ہے[2]

یوں تو یورپ کے تقریباً تمام دوسرے ممالک میں عہدہ داران انتظامی قید عارضی نظر بندی اور جلا وطنی وغیرہ کے معاملات میں وسیع اختیارات استعمال کرتے ہیں لیکن انگلستان میں ان کا نہ تو ادعا کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو روبہ عمل لایا جا سکتا ہے ۔

غرض کیا عصری قانون اور کیا شریعت اسلامیہ دونوں کے اعتبار سے کل افراد قوم، امیر و غریب اعلیٰ و ادنیٰ کی ایک ہی حیثیت ہے ۔ قانون و شریعت میں کسی کے پیشہ اور مرتبہ کا کوئی لحاظ نہیں ہے ۔ سب کے حق میں ایک ہی قسم کا انصاف ہوتا ہے یا دوسرے الفاظ میں سب کے لئے ایک ہی قانون اور سب کے لئے ایک ہی سزا مقرر ہے ۔ کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے ۔ فقط

محمد غوث ایم ۔ اے، ال ال بی
(ریسرچ اسکالر)
اسلامی قانون (جامعۂ عثمانیہ)

ع[1] ۔ ڈیوی اخلاقیات ۔ ترجمہ جامعہ عثمانیہ ص ۴۷۹

ع[2] ۔ چیمبرز ص ۴۴

ع[3] ۔ اے وی ڈائی سی قانون دستوری ترجمہ مسعود علی سلسلہ جامعہ عثمانیہ ۔ ص ۲۸۳

اسلامی قانون اور مملکت حیدرآباد

(از جسٹس میر باسط علی خان حیدرآباد)

ہندوستان میں اسلامی قانون اور اسکا طریقہ عدل گستری

جب مسلمان ہندوستان میں آئے تو یہاں بھی عام طور سے اسلامی قانون ان کا رہنما رہا لیکن ہندوؤں کا تمدن چونکہ بہت قدیم اور اس ملک کی پرانی رعایا کو عزیز بھی تھا اس لئے اپنی اسلامی رواداری کے بموجب حسب احکام قرآن وسنت مسلمان دھرم شاستر اور وید کے احکام اور مذہبی اور قومی رواجات کا بھی خاص طور پر احترام کرتے رہے۔ اور پنڈتوں اور شاستریوں کے ذریعہ سے ہندوؤں کے مقدمات کا تصفیہ کرانے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں یہاں ہندو مسلمان شیر و شکر بنے رہے اسلامی طریقہ عدل گستری یہ تھا کہ اضلاع و تعلقات میں قاضی بحیثیت جج، منصف و مجسٹریٹ مامور کئے جاتے تھے جو دیوانی و فوجداری مقدمات فیصل کیا کرتے تھے پایہ تخت اور مستقر صوبہ پر کسی بڑے قاضی کا تقرر ہوتا تھا فوجداری کے معمولی مقدمات حکام کوتوالی سے فیصل ہوتے تھے بعض خاص مقدمات دیوانی و فوجداری خود بادشاہ وقت یا اس کے نائب السلطنت یا صوبہ دار کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ فوجداری مقدمات میں حدود شرعی جاری ہوا کرتی تھیں دیوانی مقدمات میں ضرورتاً مدیون کو سزائے قید بھی دی جاتی تھی۔ جس کو آج انگریزی عدالتوں نے بھی جائز رکھا ہے۔ قاضیوں کا انتخاب محض علمی قابلیت پر نہیں بلکہ وجاہت خاندانی اور اعلیٰ کردار کی بنا پر ہوا کرتا تھا اور ان کی تنخواہیں معقول ہوا کرتی تھیں تاکہ حصول ناجائز کی طرف وہ مائل نہوں اور رعایا پر ان کا رعب قائم رہے ان کو تجارت کی بھی ممانعت تھی۔

مسلمانوں کے مقدمات ان قاضیوں کے پاس پیش کئے جاتے تھے۔ غیر مذاہب والوں کو عموماً اجازت تھی کہ وہ اپنے مقدمات اپنے مذہب و رسم و رواج کی رو سے بذریعہ پنچایت وغیرہ بطور خود فیصل کرالیں۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں محتسب مامور کئے جاتے تھے جنکا کچھ عملہ بھی ہوتا تھا۔ ان کے فرائض آج کل کے محکمہ جات صفائی و کوتوالی کے فرائض سے ملتے جلتے تھے مثلاً اس بات کی نگرانی کرنا کہ ترازو اور باٹ کم نہوں۔ سڑک پر کوئی مکان نہ بنائے جانوروں پر بوجھ زیادہ نہ لادے شراب کی علانیہ فروخت نہو رمضان المبارک میں خورونوش کی دکانیں دن میں بند رہیں شرح مقرر کردہ سرکار میں کمی و بیشی نہو وغیرہ وغیرہ ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کا چالان قاضیوں کے پاس کیا جاتا تھا صراحت مذکورہ بالا سے واضح ہے کہ اسلام نے انصاف رسانی کے کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کیا اور حقیقت یہ ہے کہ انصاف اسلامی قانون کا جزو اعظم رہا اور مسلمان بادشاہوں نے عدل و انصاف کا ہمیشہ خیال رکھا۔ مثلاً یہاں اس زنجیر عدل کا ذکر کردینا بے موقع نہوگا جو شہنشاہ جہانگیر نے تیار کرائی تھی۔ اس سے متشرع بادشاہوں کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

زنجیر عدل

اس عدل پرور شہنشاہ نے جو فرمان بزبان فارسی صادر فرمایا اس کا ترجمہ یہ ہے "تخت نشینی کے ساتھ ہی سب سے پہلے حکم جو میں نے دیا وہ زنجیر عدل کے باندھنے کا تھا تاکہ مظلوموں اور ستم رسیدوں کی دادخواہی و انصاف رسانی میں اگر عہدہ داران عدالت کوتاہی و غفلت کریں تو مظلوم خود اس زنجیر کے پاس پہنچکر اسے ہلا دیں اور اسکے شور سے مجھے اطلاع ہو جائے یہ زنجیر خالص سونے کی تھی جس کا طول ۳۰ گز تھا اس میں (۶۰) گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں ہندوستان کے حساب سے اس کا وزن چار من تھا ایک سرا اس زنجیر کا قلعہ آگرہ کے شاہ برج میں (جو بادشاہ کی خوابگاہ تھی) مضبوط باندھ دیا گیا تھا اور دوسرا سرا دریائے (جمنا) کے کنارے ایک سنگین کھمبے میں پیوستہ کر دیا گیا تھا۔"

حیدرآباد کا قدیم طریقہ عدل گستری

اب اگر ہم اس ریاست کی قدیم عدالتوں کے قیام ان کے اختیارات اور طریقہ کار پر ایک نظر غائر ڈالیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ ملک دکن تقریباً چھ سو سال سے مسلمانوں کے زیر نگیں رہا ہے اور تقریباً دو سو سال سے سلاطین آصفیہ کا سایہ ہما یا یہ اس سرزمین پر پرتوافگن ہے اس لئے یہاں بھی وہی اسلامی قانون اور وہی طریقہ عدل گستری (جس کا ہم نے اوپر بہ تفصیل ذکر کیا ہے) کچھ کم وبیش تغیر کے ساتھ رائج رہا۔

بے اطمینانی کا زمانہ اور اسکے نتائج

جب تمام ہندوستان میں بے اطمینانی کا دور شروع ہوا اور ہندوستان میں اسلامی شہنشاہیت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ سحری بجھنے لگا۔ دیسی ریاستوں کی باہمی رقابت نے زور پکڑا اور سارا ملک فتنہ و فساد اور ریشہ دوانیوں کا آماجگاہ بن گیا تو سرزمین ہندوستان سے امن اور اطمینان رخصت ہوگیا بالخصوص انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک ایک سو برس ایسے گذرے جن میں میسور کی جنگیں مرہٹوں کی لڑائیاں افغانستان۔ سندھ۔ برہما اور گورکھا کے محاربات پنڈاریوں کی لوٹ مار اور ہندوستان کا غدر یہ تمام بلائیں اس بدقسمت پر ایسی مسلسل نازل ہوئیں جن سے حیدرآباد بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس زمانہ میں سب کو اپنی جان و مال عزت و آبرو کی پڑی تھی حصول علم وفن کی طرف کون مائل یا متوجہ ہوتا اور فن سپاہ گری چھوڑ کر قرآن و حدیث یا دھرم شاستر یا ویدوں کا درس کون حاصل کرتا نتیجہ یہ ہوا کہ عام خاندانوں کے علاوہ قاضیوں اور شاستریوں اور پنڈتوں کے خاندانوں سے بھی علم و فضل جاتا رہا جو لوگ قاضیوں کے اہم فرائض انجام دیتے تھے ان کے جانشین اور ان کی اولاد صرف نکاح پڑھانے اور "پڑی ہوی چھری" پھیرنے کے کام رہ گئے اور علیٰ ہذا قیاس پنڈت اور شاستریوں کی اولاد بھی صرف جنتر منتر پڑھنے کے قابل رہ گئی !!

ہندوستان میں انگریزی عدالتوں کا قیام اور اس کا اثر اسلامی قانون اور دہرم شاستر پر

مغلیہ سلطنت کے خاتمہ پر دوراندیش حکومت برطانیہ نے اسلامی قوانین اور اسلامی عدالتوں اور دہرم شاستر کو یک لخت ختم کر دینا قرین مصلحت و انصاف خیال نہیں کیا کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اہل ملک مسلمانوں کا بے لاگ انصاف انکی رواداری اور اسلامی قوانین کے برکات کے شیدائی تھے جب کچھ عرصہ گذر چکا اور ان کی سلطنت میں استحکام پیدا ہو گیا تو انہوں نے انگریزی عدالتیں قایم کیں جن میں شرع اسلام نے ایک نیا اور خاص روپ اختیار کیا انگریزوں کے ابتدائی زمانہ حکومت میں فقہ اسلام تمام عدالتوں میں نافذ رہا شرع شریف اور دہرم شاستر کے احکام کا نفاذ تھوڑے دنوں تک ہندوستانی عہدہ داروں کے ذریعہ عدالتوں میں کرایا جاتا رہا جو عدالتوں میں ماہرین فن یعنے ”مشیر“ کی حیثیت سے کام کرتے مسلمان مشیر مفتی اور مولوی اور ہندو مشیر ”پنڈت“ کہلاتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد ایسے ماہرین سے کام لینا غیر ضروری سمجھکر ترک کر دیا گیا فقہ کے احکام متعلقہ جرائم و تعزیرات و مالگزاری و قبضہ اراضی و ضوابط شہادت اور جزا انتقال جائداد کے یکے بعد دیگرے متروک ہو کر ان کی جگہ مجلس وضع آئین و قوانین کے ایکٹ قائم کر دیئے گئے ۔ ایسے مقدمات جو مسلمانوں کے مابین ہوتے تھے جہاں تک ممکن ہوتا شرع شریف کے احکام کی پابندی کی کوشش کی جاتی تھی ۔

حیدرآباد کے قدیم عدالتیں انکی تنظیم و تشکیل اور بعض کی تخفیف

جب ہندوستان میں امن و امان ہو گیا اور تمام صوبوں میں ہائیکورٹس کا قیام اور عدالتوں میں تنظیم ہو گئی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ حیدرآباد کی سابقہ عدالتوں کی بھی تنظیم و تشکیل شروع ہو گئی اور شہر حیدرآباد میں عدالت فوجداری عدالت دیوانی بادشاہی عدالت محکمہ مرافعہ وغیرہ کا قیام عمل میں آیا مگر ”عدالت دارالقضاء و دفتر صدر الصدور“ جو اسلامی عدالتوں کی باقیات تھے

بدستور کام کرتے رہے۔ نیز صوبہ دار حیدرآباد کو دیوانی مقدمات کی اور کوتوال بلدہ کو فوجداری
مقدمات کی سماعت کا حسب سابق اختیار رہا۔ نائب سلطنت یعنے دیوان یا مدارالمہام
وقت اپنے محل میں دیوانی و فوجداری ہر قسم کا کام ملاحظہ کرتے رہے مفتی و محتسب کے اختیارات
بھی کچھ نہ کچھ باقی رہے۔ اضلاع و تعلقات میں کہیں کہیں جج و منصف مقرر کئے گئے اور تمام
عہدہ داران مال یعنے صوبہ داروں، اول، دوم، دسوم تعلقداروں حتیٰ کہ پولیس پٹیلوں کو
بھی عدالتی اختیارات دیئے گئے۔ مگر اسلامی عدالتوں کی یادگار یعنے قاضیوں کو بھی بیگانہ چھوڑا
گیا یہ لوگ عہدہ داران مال کو فصل خصومات میں مدد دیا کرتے تھے۔ جہاں قاضی نہیں ہوتے تھے
وہاں پٹیل پٹواری بھی جھگڑے چکا دیا کرتے تھے یہ عمل سنہ ۱۲۳۱ف م سنہ ۱۸۲۲ء تک رہا اس کے بعد
یہاں کی عدالتوں نے ترقی کا ایک اور قدم آگے بڑھایا تاریخ عدالت حیدرآباد میں سنہ ۱۲۳۱ف
مطابق سنہ ۱۸۲۲ء ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سنہ میں عدالت دارالقضاء دفتر
کوتوالی بلدہ دفتر صدر الصدور اور بعض دوسری عدالتوں کے اختیارات کا تعین کیا گیا شہر
کی بعض غیر ضروری عدالتیں توڑ دی گئیں اور چند عدالتوں اور ہائیکورٹ کا قیام عمل میں
آیا اضلاع اور تعلقات میں قاضی جو فصل خصومات میں عہدہ داران مال کے شریک ہوا کرتے
تھے اس خدمت سے سبکدوش کر دیئے گئے یہ سب کچھ ہوا پھر بھی ہماری سابقہ عدالتوں
کی ایک شان باقی رہی دیوانی مقدمات میں سودی ڈگری دینے سے پرہیز کیا جاتا رہا
سنہ مذکور سے پہلے سے جو عدالتیں قائم تھیں یا جو بعد میں قائم ہوئیں یا ہنوز باقی
ہیں ان کے منجملہ بعض کی مختصر کیفیت کا اس موقع پر ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کیونکہ اس سے
واضح ہوگا کہ قدیم عدالتوں کی تنظیم و تشکیل اور ان کو اسلامی عدل گستری کے اعلیٰ تر درجہ
تک پہنچانے میں حکومت کو کیا کیا مراحل طے کرنے پڑے:۔

دفتر عدالت الحق عدالت دیوانی یا چینی خانہ یا عدالت دیوانی خورد یا دیوانی بلدہ

پہلے زمانہ میں چونکہ ہندو اور مسلمان دونوں عدالتوں میں جانا معیوب سمجھتے تھے اور انکی

ہمیشہ یہ خواہش ہوتی کہ اپنی شکایت خود نائب بادشاہ یعنے دیوان یا مدارالمہام کے سامنے پیش کریں اس لئے اسلامی اصول عدل گستری اور روایات سلاطین سابقہ کے اتباع میں سلاطین آصفی نے بھی اپنی عزیز رعایا کی اس واجبی خواہش کو پورا کرنے میں کبھی دریغ نہیں فرمایا چنانچہ نواب سراج الملک نے اپنے محل میں ایک " سررشتۂ عرائض " قائم کیا تاکہ اسکے ذریعہ ہر شخص اپنے عرائض نواب صاحب ممدوح کے سامنے پیش کر سکے نتیجہ یہ ہوا کہ ہزارہا عرائض دیوانی و فوجداری گذرنے لگیں اور اس سررشتہ کی صورت ایک عدالت کی سی ہوگئی اولاً اس دفتر کے افسر کو " داروغہ " کہا کرتے تھے اس کے بعد ناظم سررشتہ عرائض کہنے لگے۔

۱۲۶۱ف م ۱۸۵۲ء میں (۵۸) مقدمات اس عدالت میں منفصل ہوئے منجملہ ان کے تین مقدمات ضرر خفیف اور حبس بیجا کے تھے ۔ جب نواب سالارجنگ مرحوم نے اس عدالت کو اپنے محل موسومہ چینی خانہ میں جہاں دیواروں اور چھتوں میں چینی کا کام کیا ہوا ہے منتقل کیا تو یہ " عدالت چینی خانہ " کہلانے لگی ۔ بعدازاں ۱۲۸۴ف م ۱۸۷۵ء میں یہ " عدالت دیوانی خورد " کے نام سے مشہور ہوئی اس زمانہ میں مدارالمہام درحقیقت خود جج ہوا کرتے تھے اور ہر قسم کے مقدمات دیوانی و فوجداری بذریعہ " دفتر عرائض " پیش ہوا کرتے تھے ۱۲۸۴ف م ۱۸۷۵ء میں نواب صاحب ممدوح نے یہ خیال کرکے کہ عدالتی و عاملانہ اختیارات کا ایک ہی شخص سے متعلق رہنا خلاف مصلحت ہے اور رعایا کی بھلائی کے لئے متعدد محکمہ جات کا مقرر ہونا زیادہ مناسب ہے ، اپنے عدالتی اختیارات عدالتوں کے سپرد فرمادئے بزمانہ نواب سر آسمان جاہ مرحوم ۱۳۰۱ف م ۱۸۹۲ء میں اس کا نام " عدالت دیوانی بلدہ " رکھا گیا اور سر علی امام مرحوم کے دور میں یہاں کے ناظم اول کو مطالبات خفیفہ کے اختیارات عطا کئے گئے چونکہ بہ عہد صدارت مہاراجہ سرکشن پرشاد شہر حیدرآباد میں ایک جداگانہ عدالت مطالبات خفیفہ قائم کی گئی ، اب ان اختیارات کا کوئی تعلق دیوانی بلدہ سے باقی نہیں رہا۔

عدالت مجلس ساہوان عدالت گوبند راؤ

چونکہ سلاطین آصفیہ نے داد رسی کا دروازہ صرف اہل اسلام کیلئے ہی نہیں بلکہ تمام رعایا کیلئے بلا تفریق مذہب وملت کھول رکھا تھا اس لئے بزمانہ غفران مکان نواب میر محبوب علیخان دو عدالتیں یعنی "عدالت مجلس ساہوان" و "عدالت گوبند راؤ" قایم ہوئیں اول الذکر عدالت کے صدرنشین خود نواب سالار جنگ تھے یہہ عدالت ۱۸۷۴ء میں تخفیف ہوگئی۔ ثانی الذکر عدالت ۱۸۶۲ء میں قائم ہوئی۔ اس عدالت میں مقدمات وطن داری گوسائیاں و نزاعات جوشیاں وغیرہ پیش ہوتے تھے۔

دفتر اجرا یا محکمہ تعمیل

شہر حیدرآباد میں دیوانی عدالتیں تو قائم ہوگئی تھیں مگر ان کے فیصلہ جات ڈگریات کی تعمیل کوئی آسان کام نہ تھا اگرچہ ڈگریوں کی تعمیل ہر ملک اور ہر زمانہ میں دشوار رہی ہے مگر اس زمانہ میں دشوار تر تھی کیونکہ بااثر مدیونان کی طرف سے زر ڈگری کی ادائی او جائداد اور املاک کی قرقی و نیلام میں طرح طرح کی دقتیں پیدا کیجاتی تھیں مدیونان کی گرفتاری تقریباً ناممکن ہوگئی تھی یہ لوگ امراء عظام یا جمعداران فوج کے ہاں پناہ لیتے تھے اور اس طرح عدالت کی دسترس سے باہر ہو جاتے تھے ان تمام دشواریوں کے پیش نظر نواب سالار جنگ نے ۱۲۶۵ف م ۱۸۵۶ء میں شہر حیدرآباد میں یہہ محکمہ قائم فرمایا جو بہت کامیاب ثابت ہوا۔ جب عدالتوں کا کافی رعب و وقار قائم ہوگیا تو اس کو برخاست کر دیا گیا۔

محکمۂ قضایائے عروب

ایک عرصہ دراز سے حیدرآباد میں عروب سرکاری جمیعت میں ملازمت کرتے چلے آرہے ہیں ان میں سے اکثر نقدی لین دین بھی کیا کرتے تھے اپنی افتاد طبیعت کے لحاظ سے یہ بہت جلد مشتعل ہوجایا کرتے تھے اور جن معاملات کا تصفیہ زبانی طور پر ہوسکتا تھا یہ بزور شمشیر فیصلہ کرنے پر فوراً تل جاتے تھے۔ اس لئے داد و ستد کے معاملات اسلامی قانون کے

بموجب طے کرنے کے لئے یہ عدالت قائم کی گئی تھی نواب مختار الملک نے ۱۸۷۲ء میں عربوں کے
مقدمات گشت وخون وسرقہ درہ زنی کو بھی اس محکمہ میں رجوع کرنے کا حکم دیا اور محکمہ کے
سرپنچ خود مدار المہام ہوتے تھے محکمہ مذکور کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ
جب نواب سالار جنگ ۱۸۷۶ء میں بغرض ملاقات گورنر جنرل بمبئی تشریف لے گئے تو ذریعہ
جریدہ غیر معمولی ہدایت فرمائی کہ اگر کوئی اہم معاملہ پیش آجائے توان کی واپسی تک اسکا
تصفیہ ملتوی رہے یہ محکمہ ۱۸۸۹ء میں تخفیف کردیا گیا اور اسکے دفتر کا بڑا حصہ مجلس عالیہ
عدالت میں اور کچھ حصہ محکمہ نظم جمعیت میں ضم ہوگیا۔

عدالت بادشاہی یا فوجداری بزرگ یا عدالت فوجداری عالیہ

نواب سالار جنگ نے ۱۸۵۵ء میں یہ عدالت شہر حیدرآباد میں قائم فرمائی
اور نواب صاحب ممدوح خود اسکے صدر نشین تھے اور اس خیال سے کہ عوام اور اہل
مقدمات پر اسکی عظمت کا اثر پڑے، اس کا نام "عدالت بادشاہی" رکھا اور حکم دیا
کہ کل استغاثے اس عدالت میں پیش ہوا کریں اس عدالت کو بجز اختیارات سزائے موت
وحبس دوام باقی تمام اختیارات فوجداری حاصل تھے آگے چل کر اس عدالت کا نام "عدالت
فوجداری عالیہ" یا "عدالت العالیہ و فوجداری بزرگ" پڑ گیا ۱۸۷۰ء میں اس عدالت
کو شکست کرکے عدالت العالیہ میں شریک کردیا گیا۔

عدالت فوجداری خورد یا عدالت فوجداری بلدہ

اس عدالت کو راجہ چندو لال نے بعہد مغفرت منزل نواب سکندر جاہ ۱۸۳۸ء
میں قائم کیا تھا اگرچہ اس وقت اضلاع میں جج و منصف فوجداری اختیارات عمل
میں لاتے تھے مگر ان کے فیصلہ جات بغیر اس عدالت کی منظوری کے نافذ نہیں ہوا کرتے
تھے اس عدالت میں سرقہ کی پاداش میں ہاتھ کاٹنے کی سزا دیجاتی تھی ۱۸۴۸ء میں
یہ سزا موقوف کرکے سزائے قید دیجانے لگی یہ عدالت اب "فوجداری بلدہ" کے نام سے

موسوم ہے جہاں (۴۸) ماہوار ارباب نظام اور چند نظما اعزازی کام کرتے ہیں۔

عدالت کوتوالی بلدہ

دستور قدیم کے مطابق نہ صرف کوتوال بلدہ کو بلکہ اون کے مددگاروں کو بھی فوجداری اختیارات حاصل تھے نواب سالارجنگ نے ان اختیارات کو محدود فرمادیا اور حکم دیا کہ بلا منظوری عدالت بچار من سے زیادہ کسی قیدی کو حوالات میں نہ دکھا جائے ۱۸۷۰ء میں کوتوالی سے اختیارات فوجداری بالکل علیحدہ کردیئے گئے۔

دفتر معتمدی عدالت دفتر ہوم سکرٹری اور محکمہ صدالمہام عدالت و مدارالمہام

سنہ ۱۲۷۲ف م ۱۸۶۲ء میں عدالتوں کی مزید نگرانی کے لئے ایک دفتر موسومہ "دفتر معتمدی" بلدہ میں قائم ہوا جس میں ایک عہدہ دار "معتمد مدارالمہام" کے نام سے مقرر کیا گیا اس دفتر کے توسط سے عدالت العالیہ کے دیوانی مقدمات کے مرافعات جنکی مالیت (۵۰۰۰) سے زیادہ ہوتی تھی یا بعض خاص مقدمات خود صدرالمہام بہ شراکت معتمد سماعت کیا کرتے تھے ۱۸۷۰ء میں نواب سالارجنگ نے صیغہ عدالت کے کام کو عمدہ طور پر چلانے کے لئے امراء بلدہ سے نواب بشیرالدولہ سرآسمانجاہ کو صدرالمہام عدالت مقرر فرمایا جو عدالت العالیہ کے تجاوز کی ناراضی سے مرافعات سماعت فرماتے تھے اور اگر فریق اس پر بھی مطمئن نہ ہوتا تو مدارالمہام کے پاس مرافعہ کرسکتا تھا ۱۸۷۱ء میں عدالت العالیہ کے مرافعہ کا فیصلہ قطعی قرار دیا گیا اور دوران تحقیقات میں محکمہ جات بالا کی مداخلت موقوف کردی گئی مگر خاص خاص صورتوں میں صدالمہام کو مداخلت کا حق رہتا تھا اور فریق کی خواہش پر اسکو مدارالمہام تک مرافعہ لے جانے کی اجازت دیجاتی تھی نواب سالارجنگ نے محکمہ صدرالمہام کو تخفیف کردیا اور اسکے اختیارات عدالت العالیہ کو دیدیئے سالارجنگ ثانی کے زمانہ میں ایک جدید عہدہ ہوم سکرٹری کے نام سے قایم ہوا تھا ۱۸۹۰ء میں دفتر معتمدی میں ہوم سکریٹری کا دفتر شامل کردیا گیا اور ایک سال بعد اس دفتر کو شکست کردیا گیا اب یہ دفتر "معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ" کے نام سے موسوم ہے اسکے توسط سے عدالت العالیہ کے

تجاویز کی ناراضی سے صرف انتظامی مرافعات صدرالمہام عدالت و صدر اعظم بہادر کے ملاحظہ میں پیش ہوتے ہیں۔

مجلس مرافعہ صدر یا مجلس عالیہ عدالت یا عدالت عالیہ

سنہ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کی رو سے سرکار عظمت مدار نے اضلاع شولاپور و رائچور و نلدرگ سرکار عالی سے لئے تھے سنہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس قابل قدر امداد کی بنا پر جو ریاست حیدرآباد نے اس نازک موقع پر سرکار انگریزی کو دی تھی اضلاع مذکور سنہ ۱۸۶۲ء میں سرکار عالی کو واپس مل گئے ان اضلاع کے عدالتی انتظام کے لئے "صدر عدالت متفرقہ" کے نام سے ایک محکمہ حیدرآباد میں قائم کیا گیا اس وقت تک اضلاع کے بیرعدل (جج) اور تعلقات کے منصفوں کے فیصلے تصیح کی غرض سے حیدرآباد کی عدالت فوجداری میں روانہ کئے جاتے تھے سنہ ۱۸۶۴ء سے تمام عدالت ہائے اضلاع کا تعلق اس جدید محکمہ سے کردیا گیا اور اس کا نام "صدر عدالت متفرقہ و تصیح تعلقات" رکھا گیا اور سنہ ۱۸۶۶ء میں ضلع بندی کے بعد اس کا نام "محکمہ مرافعہ اضلاع" ہوگیا اس زمانہ میں محکمہ مذکور کے علاوہ ایک مجلس اور قائم ہوئی جس میں اس محکمہ کو شامل کردیا گیا کچھ عرصہ بعد اسکا نام "مجلس مرافعہ صدر" ہوگیا اور یہ نام سالہا سال تک چلتا رہا سنہ ۱۸۷۰ء میں یہ مجلس تخفیف ہوکر عدالت العالیہ کی شکل میں رونما ہوئی اور اس میں نئے ارکین مامور کئے گئے اس کے بیرمجلس کی رائے دو ججوں کی رائے کے مساوی سمجھی جانے لگی اور ہر مقدمہ کا فیصلہ بغلبہ آرا ہونے لگا لیکن اسکے ارکین اپنے عدالتی کام میں ہر طرح صدرالمہام عدالت کے ماتحت تھے جن کے توجہ دلانے پر بعض اوقات ایک ہی مقدمہ کی تجویزیں بار بار رد و بدل ہوتا تھا اگر مجلس اپنے ہیشتر کے فیصلہ پر قائم رہتی تو اس وقت تک عذر مکرر کے احکام آتے رہتے جب تک کہ مجلس سے حسب منشا فیصلہ صادر نہوتا اگرچہ اس مجلس کا نام اب "ہائیکورٹ" مشہور ہوگیا اور عدالت ہائے بلدہ و اضلاع کے فیصلوں کی بہ صیغہ مرافعہ سماعت کرنے کا اختیار بھی اسے حاصل تھا مگر اس کو اپنی ماتحت عدالتوں پر انتظامی حیثیت سے کوئی اقتدار حاصل نہ تھا سنہ ۱۸۷۲ء میں عدالت

"دیوانی بزرگ" "عدالت بادشاہی" و "عدالت فوجداری" جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ شکست ہو کر اس عدالت میں ضم ہوگئیں اور اس وقت سے دو ذیح صیغہ ابتدائی دیوانی و صیغہ ابتدائی فوجداری کے لئے مقرر کئے گئے یہ مجلس جس کے کئی نام بدل چکے تھے ہائیکورٹ کی تشکیل کے بعد بھی ابھی تک "مجلس مرافعہ" یا "ہائیکورٹ" کہلاتی تھی۔ یکم اردی بہشت ۱۲۸۷ف م ۱۰ فروری ۱۸۷۸ء سے "مجلس عالیہ عدالت سرکار عالی" موسوم ہونے لگی۔ شہریور ۱۲۹۲ف میں محکمہ صدر المہام عدالت تخفیف کر دیا گیا اور کل اختیارات اس عدالت کو حاصل ہو گئے۔ دو سال بعد یعنی اسفندار ۱۲۹۴ف میں دستور العمل مجلس عالیہ عدالت کی ترمیم عمل میں آئی اور حسبہ اسکے اقتدارات بڑھا دیئے گئے مختلف امور میں ایک باقاعدگی اور تنظیم پیدا ہوگئی ملک کے قابل اور ممتاز افراد کی خدمات حاصل کی گئیں حکومت نے بعطائے وظائف ملک کے قابل افراد کو اعلےٰ قانونی تعلیم کی غرض سے ولایت اور کچھ عرصہ بعد حیدرآباد سیول سرویس کے کامیاب اشخاص کو عملی تجربہ حاصل کرنے کے لئے برٹش انڈیا بھیجنا شروع کیا تاکہ ملک میں قابل اور اعلیٰ ڈگری یافتہ اشخاص مہیا ہو جائیں چنانچہ ان کو بعد حصول تعلیم و عملی تجربہ رکنیت مجلس عالیہ کے عہدوں پر مامور فرمایا گیا جس میں سے اکثر افراد میر مجلس کے عہدہ تک پہونچے ہماری حکومت کی اس دور اندیش پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکمہ عدالت میں بتدریج و بہ کثرت اصلاحات عمل میں آنے لگیں متعدد قوانین و قواعد نافذ ہوئے اور وقار عدالت بڑھتا گیا فصل خصومات میں بیحد آسانی ہوگئی۔ اس وقت یہ عدالت ایک میر مجلس ایک مفتی اور (۱۱) اراکین بشمول رکن دورہ پر مشتمل ہے۔

محکمہ ارباب نشاط

پچھلی دو صدیوں میں جسقدر عدالتیں اس ریاست ابد مدت میں قائم ہوئیں ان کے منجملہ بعض اہم عدالتوں کے انعقاد تنظیم اور تشکیل کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ مذکورہ بالا عدالتوں کے علاوہ زمانہ سابق میں ایک محکمہ "ارباب نشاط" کے نام سے قائم تھا جو عام طور پر کنچن کچہری کے نام سے مشہور تھا۔ اس محکمہ کی مہتممہ ہمیشہ ایک عورت ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ بارہویں صدی کے وسط میں

ما ما شریفہ مہتمہ تھیں۔ کچہری ہذا کے قیام کے اغراض یہ تھے کہ:-

(۱) اس مخرب اخلاق پیشہ کی جو اسلامی دور کے صدیوں پہلے سے چلا آرہا تھا بتدریج بیخ کنی کیجائے۔

(۲) پیشہ ور عورتوں پر نگرانی قائم کرکے عام رعایا کو امراض متعدیہ سے محفوظ رکھا جائے۔

(۳) اس طبقہ کے تعزیری جرائم کا انسداد و تحقیقات کی جائے۔

(۴) اس طبقہ کی دیوانی نزاعات مثلاً تقسیم ترکہ۔ ماہوارات و معمولات کی اجرائی و مسدودی و کارروائی ہائے وراثت وغیرہ کا حسب ضابطہ تصفیہ کیا جائے۔

اغراض بالا کی تکمیل کے لئے اس کچہری میں جملہ طوائف کی ایک مفصل سوانح (ہسٹری) درج رجسٹر ہوا کرتی تھی اگر کسی نائکا کی جانب سے کسی لڑکی کے اغوا کرنے کا (جو آج بھی مہذب اقوام کے قانون تعزیرات میں ایک سنگین جرم قرار دیا گیا ہے) کوئی استغاثہ پیش کیا جاتا تو توسلین کچہری باہداد کوتوالی مفرورہ لڑکی اور مغوی کو گرفتار کرکے فوراً مہتمہ کے پاس پیش کرتے تھے جہاں سے حسب ضابطہ تحقیقات کے بعد بصورت اثبات جرم مہتمہ اپنے اختیارات محصلہ کی رو سے سزائے قید یا جرمانہ صادر کرتی تھیں تاکہ ناجائز تعلقات کی فوراً روک تھام ہو جائے۔ اور اگر یہ ثابت ہوتا کہ لڑکی اپنی رضامندی امر ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی غرض سے گئی تھی تو فوراً آپس میں نکاح کرا دیا جاکر نائکا کی پرورش کیلئے مناسب معاوضہ دلا دیا جاتا تھا اس کچہری کی تمام مراسلت و تحقیقات بزبان فارسی ہوا کرتی تھی اور آخر مہتمہ ما ما مبارک تھیں کچہری مذکور کے احکام و فیصلہ جات کے دیکھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ:-

(۱) یہاں فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کے مقدمات کی تحقیقات بموجب قانون و ضابطہ عمل میں آتی تھی۔

(۲) دوران تحقیقات میں مثل دیگر عدالتوں کے یہاں بھی ملزم کو جواب دہی و ثبوت صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔

(۳) اس کے احکام نہ صرف پولیس و دیگر محکمہ جات بلکہ عہدہ داران افواج باقاعدہ کیلئے بھی واجب التعمیل ہوتے تھے۔

(۴) اس کچہری میں جرمانہ وغیرہ کے لئے حق سرکاری لیا جاتا تھا جس سے چھوٹے مقدمات کی روک تھام ہوتی تھی۔

موجودہ زمانہ کو بجا طور پر دور مہارت خصوصی یعنی (specialisation) کہا جاسکتا ہے مثلاً شعبۂ طب کو لیجئے تو ہر مرض کا جداگانہ ماہر (specialists) موجود ہے آنکھ کا ڈاکٹر الگ ہے تو دانت کا الگ کوئی فلسفہ کا ماہر ہے تو کوئی نفسیات میں ید طولی رکھتا ہے غرض آج کل زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کا خصوصی ماہر نہ ہو ہر شخص کا ایسے ماہرین کے خدمات سے استفادہ کرنے کا رجحان یوماً فیوماً ترقی پذیر ہے۔ قانونی دنیا بھی اس رجحان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی یورپ وامریکہ میں دیوانی کام کے ماہر اور فوجداری کام کے ماہر جدا جدا ہوتے ہیں کوئی فن جراح کا ماہر ہے تو کوئی بحث کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا کوئی مسائل قانونی کا ماہر ہے تو کوئی قانونی مشورہ وہی کو اپنا پیشہ بناتا ہے غرض اسی اصول کے بموجب اور اس وجہ سے بھی کہ دیوانی و فوجداری مقدمات کی شہادت کو جانچنے کا معیار جداگانہ ہوتا ہے بعض اکابرین قانون کی رائے یہ ہے کہ دیوانی و فوجداری کام ایک ہی حاکم عدالت کے تفویض نہ کیا جانا چاہئیے۔

ہماری سابقہ مختلف النوع عدالتوں پر نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ آج سے کئی سال قبل ماہرین فن کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا تھا جب کہ نام نہاد ہمہ جہتی ترقی شروع بھی نہیں ہوئی تھی یہ سب اسلام کی اوس تبلیغ اور تلقین کا نتیجہ ہے جو اس نے نصفت اور عدل گستری کے بارے میں کی تھی چنانچہ کچہری زیر بحث کے قیام اور اس کے انتظام پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون نے ماہران خصوصی کی اس اہمیت اور ضرورت کو آج سے صدیوں پہلے محسوس کر کے اس محکمہ کے متعلقہ فرائض کو کسی مرد حاکم کے حوالہ نہیں

بلکہ ایک عورت کے تفویض کیا جو کیا بلحاظ صنف و کیا بلحاظ فطرت اس عہدہ کے لئے
سب سے زیادہ موزوں ہوتی تھی اور چونکہ وہ اس طبقہ کے رسم و رواج اور اس کے
تنازع فیہ مسائل سے بھی بخوبی واقف ہوتی تھی اس لئے اس کے فیصلہ جات سے فریقین
ہمیشہ اور ہر طرح مطمئن رہتے تھے اسلامی اصول عدم گستری کی یہہ واحد مثال نہیں ہے
بلکہ جیسا کہ ہم نے اسکے پہلے ذکر کیا ہے اس ریاست ابد مدت میں اور بھی خصوصی عدالتیں
قایم کی گئی تھیں اس پیشہ کی بیخ کنی کا سہرا دورِ عثمانی کے سر ہے کیونکہ اس میں داخلہ کے
لئے اغوا یا خرید و فروخت جرم تعزیری قرار دیا گیا ہے۔

اسمات و اضلاع و تعلقات میں عدالتوں کا قیام اور انکا ارتقاء

یہہ تو بلدہ حیدرآباد کی مختلف قدیم و جدید عدالتوں کی تنظیم و تشکیل کا تذکرہ ہوا اب ہم
عدالتہائے اسمات و اضلاع و تعلقات پر نظر ڈالتے ہیں تو پایا جاتا ہے کہ ۱۲۵۶ف م ۱۸۴۷ء
سے قبل اضلاع کے عدالتی انتظام کی کیفیت یہہ تھی کہ مقتدر اشخاص اضلاع کے انتظام
کا ٹھیکہ لے لیا کرتے تھے جو تعلقدار کے نام سے موسوم ہوتے تھے یہ لوگ زر شخصہ میں سے حسب
قرارداد ایک رقم ملازمین کے خرچ کے نام سے وضع کر لیتے تھے اور اس غرض کے لئے
عموماً فی روپیہ ۲/ وضع کرکے باقی رقم بحق سرکار جمع کیجاتی تھی فوجی ملازم جو اضلاع میں متعین
ہوتے تھے ان کی تنخواہیں بھی اس سرکاری رقم یعنے باقی ۱۴/ میں سے ادا ہوتی تھیں بزمانہ
نواب سراج الملک ۱۸۴۷ء میں اضلاع میں بھی عدالتوں کا قیام عمل میں آیا اور اس کے
بعد وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی عدالتیں قائم ہوتی چلی گئیں اور مختلف عہدہ داران مثلاً صوبہ داران
تعلقداران اور عہدہ داران پٹہ اور کروڑگیری حتیٰ کہ پولیس پٹیلان کو بھی عدالتی اختیارات عطا
کئے گئے ۱۲۹۴ف میں جب عدالتوں کی تنظیم عمل میں آئی تو سب سے پہلے سمت غربی یعنی
صوبہ اورنگ آباد میں صدر عدالت قائم کی گئی اور عہدہ داران مال سے کل اختیارات دیوانی
لے لئے گئے (۲۵) سال کے اندر اندر یہ انتظام تمام ممالک محروسہ میں نفاذ کر دیا گیا جس کی

تفصیل آئندہ بیان کی جائے گی۔

بعض اسلامی عدالتوں اور اسلامی خدمات کا وجود حیدرآباد میں

اس وقت بھی اس ریاست ابد مدت میں اسلامی آئین و قوانین اور اسلامی عدل معدلت کی بعض ایسی یادگاریں باقی ہیں جو دوسرے ممالک کیلئے قابل تقلید و لائق اتباع ہوسکتی ہیں کیونکہ ان سے حقیقی انصاف رسانی میں خاص مدو ملتی ہے مثلاً۔

(۱) اسلامی اصول کے مطابق اب بھی عدالت عالیہ کے دیوانی و فوجداری مرافعات کی سماعت بتوسط جوڈیشل کمیٹی حضرت ظل اللہ جو عدل انصاف میں یگانہ روزگار ہیں بہ نفس نفیس فرماتے ہیں۔

(۲) موجودہ قانون شہادت ہند کی دفعہ (۱۳۴) کے لحاظ سے کسی واقعہ کے ثابت قرار دینے کیلئے گواہوں کی کوئی خاص تعداد کا ہونا ضروری نہیں ہے مگر ہمارے قانون شہادت کی دفعہ (۱۰۸) کے بموجب مقدمات قتل، نکاح، طلاق، مہر، ترکہ، خلع، نسب کے مقدمات میں دو گواہوں کی شہادت کا پیش ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے جو اسلامی قانون کا فیضان ہے۔ نصاب شہادت کا یہ اعلیٰ اصول صرف مسلم رعایا سے مختص نہیں کیا گیا ہے بلکہ جمیع رعایا بلالحاظ مذہب و ملت اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ جو اسلامی رواداری کا ایک بین ثبوت ہے۔

(۳) مقدمات قتل میں قصاص کی سزا بلامنظوری حضرت اقدس و اعلیٰ نہیں دیجاتی۔

(۴) عدالت عالیہ میں حسب احکام شرعی ایک مفتی مامور ہیں جو مقدمات قتل میں شرعی نقطۂ نظر سے (جو موجودہ قوانین سے بھی زیادہ سخت ہے) فتویٰ صادر کرتے ہیں جو بارگاہ خسروی میں پیش کیا جاتا ہے اور وہاں سے قطعی احکام نافذ ہوتے ہیں۔

(۵) شہر حیدرآباد میں دیگر عدالتوں کے علاوہ ایک عدالت دارالقضا بھی قدیم الایام سے قایم ہے جس میں مسلمانوں کے ازدواجی مقدمات طلاق، مہر، ترکہ، ثبوت نسب اور شفعہ وغیرہ کے مقدمات پیش ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ حق شفعہ شریعت اسلامی کا عطا کردہ حق ہے

اور اس ریاست ابد مدت میں اس سے نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بھی مستفید ہوتے ہیں اور
بلدہ اور اضلاع کی عدالتوں سے اس حق کا نفاذ کرا سکتے اور کراتے ہیں۔

(۶) دفتر صدر الصدور جسے محکمہ امور مذہبی کہا جاتا ہے زمانۂ قدیم سے قایم ہے
اس میں نہ صرف مساجد بلکہ معابد کے املاک وقف کے نزاعات پیش اور فیصل ہوتے ہیں
یہاں پر اہل خدمات شرعیہ یعنی قاضی، مفتی، محتسب، امام، موذن وغیرہ کی معاشیں
اور تنخواہیں اجرا ہوتی ہیں اور وراثت وغیرہ کے مقدمات کا تصفیہ کیا جاتا ہے۔

(۷) اب بھی اس ریاست میں (۱۳۴) قاضی ہیں جن میں (۳) اناث ہیں۔ (۱۵) مفتی
(۵۰) محتسب موجود ہیں۔ قضاۃ کے خدمات موروثی ہیں جو پشتہا پشت سے چلی آرہی ہیں
ان کی وراثت کی تحقیقات اور ان کی علمی قابلیت کا اطمینان کرنے کے بعد محکمہ امور مذہبی
سے ان کا تقرر عمل میں آتا ہے جہاں سے ان کے کام اور ان کے دفتر کی برابر وقتاً فوقتاً
تنقیح اور نگرانی ہوا کرتی ہے اگرچہ ان کا اصل ذریعہ اب نکاح خوانی رہ گیا ہے تاہم طلاق
و فارغطی وغیرہ کی صورت میں یہ شہادت یکر عورت کو نکاح ثانی کی اجازت دید یتے ہیں
تاکہ پردہ نشین عورتیں عدالتی کشمکش سے بچ جائیں یہ اختیار بعد استمزاج از عدالت عالیہ
محکمہ امور مذہبی سے ان کو عطا کیا گیا ہے جو یقیناً موجب سہولت اناث ہے۔

(۸) محکمہ امور مذہبی میں ایک صیغہ افتا کا بھی ہے جہاں ایک سرکاری مفتی متعین ہیں
جو مقدمات میں شرعی معاملات کے متعلق بغیر کسی فیس کے اہل اسلام کو تحریری فتاوی دیتے
ہیں ان فتاوی سے اکثر اوقات عدالتوں کو مسائل شرعی کی نسبت صحیح رائے قائم کرنے میں
بڑی امداد ملتی ہے۔

(۹) اگرچہ اس زمانہ میں محکمہ احتساب کی خدمات محکمہ جات کوتوالی و صفائی کے تفویض
کر دی گئی ہیں مگر پھر بھی سابقہ اسلامی طریقہ کے بموجب شہر حیدر آباد میں ایک محتسب مقرر
ہے اس عہدہ کا قدیم نام "نرخی" ہے یعنی سرکار کے مقرر کردہ نرخوں کی نگرانی کرنا اسکا

کام ہے تاکہ نرخوں میں کوئی کمی بیشی نہ ہونے پائے محتسب ماہ رمضان المبارک کی ۲۰ تاریخ کو شہر کے کوچہ و بازاروں میں گشت لگا کر، چرس، بیڑی، سگریٹ پینے والوں یا سامان خورد نوش بیچنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے۔

دور عثمانی میں اسلامی قانون کے بنیادی اصول کے مطابق عاملانہ اختیارات کی عدالتی اختیارات سے علحدگی کا نفاذ۔

صیغہ عدالت کو صیغہ انتظامی سے ہمیشہ علحدہ رکھنا انصاف رسانی کیلئے از بس ضروری ہے اس بیش بہا اصول کو غالباً سب سے پہلے فرمانروایان اسلام نے محسوس کیا تھا آغاز دور اسلامی میں خود خلیفہ وقت اور ان کے ماتحت افسر فصل خصومات کے فرائض انجام دیتے تھے۔

حضرت رسول خدا صلعم کے وصال کے بعد ایک عرصہ تک کوئی شخص قاضی کے عہدہ پر مقرر نہیں ہوا بلکہ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کام کو انجام دیتے تھے جیسا کہ اس سے قبل خود رسول خدا صلعم بذات خاص اس کام کو انجام دیتے تھے لیکن جب امور مملکت میں اضافہ ہو گیا تو بوجہ تنگی وقت حضرت ابوبکر نے اپنے عدالتی اختیارات حضرت عمر فاروق کے سپرد فرما دیئے اور حضرت عمر نے یہ اصول قرار دیا کہ "قانون کی حکومت اعلیٰ ترین حکومت ہے اس لئے عدالتوں کا انتظام ایسا ہونا چاہیئے کہ کسی کو عدالتی حکام پر مطلق اسکا شبہ نہ ہو سکے کہ وہ حکومت کے زیر ہدایت یا زیر اثر عمل کر رہے ہیں۔"

یہ ظاہر ہے کہ جب تک حکومت کا نظم و نسق کامل نہ ہو جائے ہر صیغہ کے احکام کی تعمیل رعب و داب کی محتاج رہتی ہے اسلئے حضرت عمر فاروق نے اپنی خلافت کے ابتدائی زمانہ میں کچھ عرصہ تک مشترکہ انتظامی و عدالتی اختیارات کے رواج کو جاری رکھا لیکن جب انتظام مملکت اچھی طرح قائم ہو گیا تو آپ نے صیغہ عدالت کو بالکلیہ الگ کر دیا اور تمام اضلاع میں عدالتیں قائم فرما دیں۔

ابتداءً سلطنت مغلیہ و مملکت آصفیہ میں بھی عدالتی کام قضاۃ کے سپرد تھا مگر بعد ایک زمانہ ایسا آیا کہ ممالک محروسہ میں دوسرے محکمہ جات مثلاً کوتوالی، پٹہ، کروڑگیری، اور مال کو بھی عدالتی اختیارات دیئے گئے کیونکہ حالات زمانہ کے لحاظ سے ہر محکمہ کے احکام کی تعمیل بغیر عدالتی اختیارات کے

خالی از وقت نہ تھی خصوصاً محکمہ مال کے عہدہ دار جن کے فرائض میں حصول مالگذاری وجمعبندی تھی اس قوت کے زیادہ حاجت مند ہو گئے تھے اور اسی لحاظ سے عہدہ داران مال کو سابق میں دیوانی و فوجداری دونوں قسم کے اختیارات دیئے گئے تھے ان کے سوا عدالتی عہدہ دار علحدہ موجود تھے ۱۲۹۴ف م ۱۸۸۵ء میں جب ست غربی (سمت اورنگ آباد) میں میر عدل (جج) اور منصف مقرر کئے گئے تو وہاں کے اول دوم وسوم تعلقداروں اور تحصیلداروں سے دیوانی اختیارات کا تعلق باقی نہ رہا اور حسب ذیل اصول قرار پایا :-

نظر اسلوبی انتظام مقدمات دیوانی کے لئے جداگانہ عہدہ داروں کا مقرر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے جس تعلقہ یا ضلع یا صوبہ میں مدارالمہام کی تجویز سے یہ انتظام جاری ہوا اس تعلقہ یا ضلع یا صوبہ میں عہدہ داران مال کے اختیارات نسبت تجویز مقدمات دیوانی باقی نہ رہیں گے۔ اور ان عہدہ داروں سے متعلق ہو جائیں گے جو مقدمات دیوانی کیلئے مقرر ہوں" اصول متذکرہ بالا پر چند سال تک عمل پیرا ہونے سے بجز تحصیلداروں کے جو اکثر تعلقات میں دیوانی میں اختیارات عمل میں لاتے تھے باقی تمام عہدہ داران مال سے دیوانی کام کا تعلق باقی نہ رہا البتہ وہ صرف فوجداری اختیارات استعمال کرتے رہے ۱۳۲۰ف م ۱۹۱۱ء اور اس کے بعد بھی ایک عرصہ تک عہدہ داران مال عدالتی فرائض بھی انجام دیا کرتے تھے صوبہ داران مال سیشن جج کے اختیارات استعمال کرتے تھے اول تعلقداران ناظم فوجداری ضلع یعنی (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) ہوا کرتے تھے تمام دوم وسوم تعلقداران اور تحصیلداروں کو فوجداری اختیارات حاصل تھے اکثر تحصیلداروں کو دیوانی اختیارات بھی تفویض تھے مگر اس دوعملی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عہدہ داران مال کو خود اپنے محکمہ کے متعلقہ فرائض کی وجہ سے اس قدر فرصت نہ ملتی تھی کہ وہ اہم فرائض عدالتی کی انجام دہی میں اپنا کافی وقت دیں بسا اوقات دورہ جمعبندی وغیرہ کی وجہ سے مقدمات کی پیشیاں مستقر سے دور دراز مقامات پر رکھ دی جاتی تھیں فریقین اور اہل مقدمات و گواہان سب کے سب اپنے سارے

کام دھندے چھوڑ کر انصاف کی تلاش میں ان عہدہ داروں کے پیچھے گاؤں گاؤں مارے پھرتے تھے ۔ پچیس روپیہ کے لئے پچاس روپیہ خرچ ہو جاتے تھے چھوٹے چھوٹے مقدمے برسوں چلتے تھے پیشیاں بدلی جاتی تھیں دوران بڑھتا جاتا تھا تجاراور ساہوکار دیوانی مقدمات دائر کرنے سے گھبراتے تھے مظلوموں کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے ڈر لگتا تھا عوام الناس گواہی دینے سے کوسوں دور بھاگتے تھے زیر دریافت ملزمین کو اس قدر زیادہ عرصہ تک حوالات میں رہنا پڑتا تھا کہ اگر ان کو سزا بھی ہو جاتی تو اس کو بھگت کر اس سے کم مدت میں رہا بھی ہو جاتے ۔

یہ ایک عجیب لطیفہ تھا کہ اول تعلقدار جو ایک طرف ناظم کو توالی تھا تو دوسری طرف ناظم عدالت ضلع (ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ) کی حیثیت بھی رکھتا تھا صبح کو ناظم کو توالی بنکر جس ملزم کے چالان کا حکم دیتا دوپہر کو مجسٹریٹ بنکر اسی ملزم کے مقدمہ کی خود ہی تحقیقات کرتا اور اس کی قسمت کا فیصلہ سناتا ۔ گویا بہ مصداق ۔ ’’ خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ ‘‘ ان ہی مشکلات کو محسوس کر کے جو اسلامی اصول عدل گستری میں حایل ہو رہی تھیں آج سے تقریباً ۳۰ سال قبل نواب سر نظامت جنگ بہادر نے بحیثیت ہوم سکریٹری علٰحدگی اختیارات عدالتی کی یہ تحریک پیش کی کہ :۔

’’ جب تک عہدہ داران مال سے عدالتی اختیارات نہ لئے جائیں اور جدید منصف مامور نہوں عدالتی کام میں اصلاح ناممکن ہے ‘‘

بعد رسل و رسائل یہ جامع اور اہم تحریک ابتداً اس حد تک بارگاہ خسروی سے منظور ہوئی کہ صوبہ ورنگل و میدک کیلئے دو سیشن جج مقرر ہوئے اوّل تعلقداران سمت ورنگل سے دیوانی اختیارات لے لئے گئے اور ان کے بجائے تین نظماء دیوانی اور پانچ جدید منصف مقرر ہوئے اور یہ تصفیہ ہوا کہ تاوقتیکہ قدیم و جدید منصفوں کی تعداد (۹۳) نہو جائے اس وقت تک ہر سال (۳۰) منصف مامور کئے جایا کریں اسکے کچھ عرصہ بعد ہمارے آقائے ولی نعمت

حضرت بندگانعالی نے جن کا مطمح نظر ابتدائے سند آرائی سے سررشتہ عدالت کی اصلاح اور رعایا کی فلاح اور جن کا مقصد اولین عدل گستری اور رعایا نوازی رہا ہے اور جن کی ایک نظر کیمیا اثر نے سے بصرف کثیر ایک عالیشان عمارت عدالت عالیہ کے لئے تعمیر ہو چکی ہے بتاریخ ۳؍ تیر ۱۳۳۰ف م ۱۹۲۱ء اسی اسلامی اصول کے مطابق کہ "قانون کی حکومت اعلیٰ ترین حکومت ہے" حسب ذیل فرمان مبارک صادر فرمایا جس میں ارشاد ہمایونی ہوا کہ: —

"کچھ عرصہ سے میری توجہ اس مسئلہ کی طرف مبذول ہوئی ہے کہ نظم و نسق ممالک محروسہ میں عدالتی اختیارات کو انتظامی عہدہ داروں سے علیحدہ کر دیا جائے اس مسئلہ پر کامل غور کرنے کے بعد اب میں نے یہہ فیصلہ کیا ہے کہ موجودہ انتظام میں یہہ اصلاح کر دی جائے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اس سے کام بھی عمدگی سے چل سکیگا اور یہہ طریقہ میری عزیز رعایا کے لئے زیادہ تر موجب آسائش و اطمینان ہوگا لہذا صدر اعظم باب حکومت مجاز کئے جاتے ہیں کہ حسب ہدایت صدر علیحدگی کا انتظام بلا تاخیر عمل میں لائیں۔ بہ تعمیل حکم خداوندی بزمانہ سر علی امام نواب سر نظامت جنگ کی اسکیم کو نواب مرزا یار جنگ بہادر پیر مجلس وقت نے بڑی تندہی کے ساتھ جامۂ عمل پہنایا اور ہمارے عدل گستر رعایا پرور شاہ ذیجاہ نے بتاریخ یکم خورداد ۱۳۳۱ف م ۱۹۲۲ء اسکیم مذکور کو اپنے ایک جنبش قلم سے نافذ فرما دیا جسکی وجہ سے حیدرآباد کی خوش نصیب رعایا کو وہ برکت اور نعمت نصیب ہو گئی جس سے دوسرے مہذب و متمدن ممالک کے باشندے باوجود مطالبات و سعی پیہم کے ابتک محروم ہیں اسکیم مذکور کے نافذ ہونے کی وجہ سے جملہ عہدہ داران مال سے تمام فوجداری و دیوانی اختیارات علیحدہ کر دیئے گئے (۵۱) جدید منصفین اور (۸) زائد نظما ضلع مامور کئے گئے اس طرح منصفین کی تعداد جو اسکیم سے قبل صرف (۳۹) تھی وہ (۹۲) ہو گئی اور ہر تعلقہ میں ایک منصف جس کو درجہ اول فوجداری کے اختیارات بھی دیئے گئے ہیں متقرر ہو گیا جس انصاف کی تلاش میں رعایائے آصفی پہلے کوسوں نکل جاتی تھی اب وہ

اس کو گھر بیٹھے ملنے لگا محکمہ عدالت ایک مکمل محکمہ بنگیا اس کے عہدہ دار ہمہ وقت
انصاف رسانی میں معروف رہنے لگے جملہ عہدہ داران عدالت بالکلیہ عدالت عالیہ
کے زیر نگرانی آگئے اور عدالتی کاموں کا انتظام بمقابلہ اس زمانہ کے جملہ عنان انصاف
ایسے ہاتھوں میں تھی جو عملاً محکمہ عدالت کے ماتحت نہ تھے بہت بہتر ہوگیا۔

عطائے منشور خسروی بہ عدالت العالیہ

جب اسکیم مذکور نافذ ہوگئی اور داد رسی اور عدل گستری کے ذرائع اور وسائل سہل تر
کر دیئے گئے تو حضرت اقدس و اعلیٰ نے ملک کی اعلیٰ ترین عدالت یعنی عدالت عالیہ
کے وقار و عظمت میں اضافہ کرنے کی غرض سے بتاریخ ۲۰ر فروری ۱۳۳۵ف
مطابق ۱۹۲۶ء ایک خاص دربار منعقد فرماکر اپنی مہر مبارک سے منشور خسروی عطا فرمایا۔
یہہ ایک ایسا خوشگوار واقعہ ہے جو تاریخ حیدرآباد میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔
اس منشور خسروی سے بغرض کامل اعتماد رعایا اس امر کی تصدیق اور توثیق فرمائی
گئی کہ عدالت عالیہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی اعلیٰ ترین عدالت ہے اس کے اختیارات
شاہی اختیارات کے اجزاء ہیں اور اراکین عدالت عالیہ بہ حیثیت نائبین بادشاہ
فرائض انجام دیتے ہیں اسکے احکام و ڈگریات قطعی ہیں اور بجز ان اختیارات شاہی
کے جو بصیغہ جوڈیشل کمیٹی نافذ ہوں کوئی اور محکمہ اس کے فیصلہ کی تنسیخ کا مجاز نہیں ہوگا

سیول جسٹس کمیٹی اور گشتی عدالت عالیہ کا نفاذ

یہہ ظاہر ہے کہ ایک عالیشان عمارت کی تعمیر محض بہترین قوانین یا کسی مفید اسکیم کا نفاذ
کر دینا ہی انصاف رسانی کا ضامن نہیں ہوسکتا بلکہ عدالتوں کی اصل کارگذاری اور
کامیابی کا راز مقدمات کے جلد از جلد فیصل پانے میں مضمر ہے۔ جیسا کہ یہہ مشہور مقولہ ہے کہ

"انصاف میں تاخیر کرنا انصاف سے انکار کرنیکے مترادف ہے"

اسکیم مذکور کا نفاذ ہونے کے بعد جس میں رعایا کی ہزاروں سہولتیں مضمر تھیں ہمارے محکمہ عدالت نے اس کو روبعمل لانے یعنی حقیقی معنوں میں کامیاب بنانے میں جو سعی بلیغ فرمائی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

برٹش انڈیا میں یہ عام شکایت تھی کہ مقدمات جلد تصفیہ نہیں پاتے جس سے اہل مقدمات کو کثیر مصارف اور سخت پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں لارڈ ریڈنگ جو انگلستان کے ایک مشہور و معروف چیف جسٹس تھے جب آپ بحیثیت وائسرائے ہندوستان تشریف لائے تو جناب ممدوح نے زیادتی دوران مقدمات کے اسباب معلوم کرنے اور مقدمات کے جلد تر فیصلہ کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے کلکتہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس دی آنریبل سر جارج کلاس رنکیں کے زیر صدارت ایک کمیشن بنام ''سیول جسٹس کمیٹی'' مقرر فرمایا جس کے اراکین بعض ہائیکورٹس کے حکام اور دیگر قابل عہدہ داران عدالتی و کلا تھے۔ اس کمیٹی نے برٹش انڈیا کے مختلف صوبہ جات کا دورہ کیا شہادتیں قلمبند کیں مختلف عدالتوں سے ضروری مواد حاصل کیا اور ایک سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک بسوط رپورٹ مرتب کی جس میں ایسی تجاویز پیش کی گئیں جن پر عمل کرنے سے دوران مقدمات میں معتد بہ کمی ہو سکے۔ یہ رپورٹ ۶۴۲ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جو تقریباً ۳ لاکھ روپیہ کے صرفہ اور متعدد قابل دماغوں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

یہ امر لائق تذکرہ ہے کہ کمیٹی مذکور کی تجاویز نے ہنوز برٹش انڈیا میں پورے طور پر عملی صورت اختیار نہیں کی تھی کہ نواب مرزا یار جنگ بہادر ممبر مجلس وقت نے ممالک محروسہ کے معاشی و اقتصادی حالات پر غور کرنے کے بعد ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ ان تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ فرما کر رپورٹ مذکور کے غائر و کامل مطالعہ کے بعد ایک تفصیلی مسودہ تیار کیا جس میں (۲۱) مختلف ابواب قائم کر کے ان کے ضمن میں متعدد امور کے متعلق اصلاحات تجویز کیں یہ مسودہ ایک کتابی شکل میں طبع کرا کے تمام ممالک محروسہ سرکار عالی

کے عہدہ داران عدالت و نیز سربرآوردہ وکلاء میں لغرض حصول آراد گشت کرایا گیا ان کے جوابات نے ایک ضخیم مثل کی صورت اختیار کرلی۔ ان سب پر غور اور چھان بین کرنے کے بعد ایک تفصیلی گشتی جو (۵۹) اصلاحات پر مشتمل ہے جاری کی گئی جو گشتی نشان ۱۳ بابتہ ۱۳۳۸ف م ۱۹۲۹ء کے نام سے مشہور ہے جو بہ منزلہ قواعد وضوابط تصور ہوتی ہے۔ ان امور کی تکمیل کو بلا کسی صرفہ کے پایۂ تکمیل کو پہنچادیا اور تمام عدالتوں سے اس گشتی پر نہایت پابندی کے ساتھ عمل کرایا جاتا ہے۔

مبارک دور عثمانی میں ہماری عدالتوں کی انصاف رسانی کی رفتار

دور عثمانی میں اس اسکیم اور ان اصلاحات پر عمل کرنے سے کیا کیا مفید نتائج برآمد ہوئے اور اس کا اثر رفتار کار انصاف رسانی پر کیا پڑا اوس کا صحیح اندازہ اس نقشہ "میزان عمل" سے ہوتا ہے جو میں نے اپنی تصنیف "تاریخ عدالت آصفی دو صد سالہ" کے ساتھ تیار کیا ہے جس کو آپ حضرات نے غالباً کمرۂ نمائش قانون میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

اس کے دیکھنے سے بہ یک نظر واضح ہوگا کہ حضرت بندگانعالی کی تخت نشینی سے تاریخ سلور جوبلی مبارک تک سالانہ بصیغہ دیوانی بجائے (۳۴۸۴۴) کے (۶۸۶۸۶) مقدمات رجوع ہوئے اور بجائے (۳۳۲۵۳) کے (۶۷۰۴۰) فیصل پائے۔ بجائے (۱۹۱) کے اوسط ایام دوران صرف (۱۱۹) یوم رہا۔

مقدمات فوجداری کا مرجوعہ بجائے (۲۳۳۳۰) کے (۶۰۷۹۵) اور تعداد منفصلہ بمقابلہ (۲۱۷۱۵) کے (۶۱۵۳۶) ہوگیا۔ اوسط ایام دوران (۵۴) سے گھٹ کر صرف (۲۷) رہ گیا۔ آمدنی بجائے (۲۰۸۰۹) کے (۱۹ ۲۵۴۷) ہوگئی اور سند یافتہ عہدہ داراں کی تعداد بجائے (۱۱۵) کے (۸۹) ہوگئی۔

ان شاندار نتائج سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس اسکیم سے جو اسلامی عدل گستری کے اعلیٰ اصول پر نافذ فرمائی گئی تھی اس مبارک دور عثمانی میں رفتار انفصال مقدمات میں جو

غیر معمولی تیزی پیدا ہو گئی اس کی نظیر کہیں بھی نہیں مل سکتی - اور یہ سب کچھ ہمارے شاہ دیجاہ کی (جو اسلامی عدل گستری، اسلامی رواداری، اسلامی مساوات اور اسلامی سادگی کے مجسم نمونہ ہیں، خاص توجہ کا نتیجہ ہے - معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے یہہ شعر اس مبارک دور عثمانی کے لئے کہا ہے -

"ہر چند جنس عدل گراں بود در جہاں - ارزاں بہ مار سید بہ بازار آصفی"

کوٹلیا کے ارتھ شاستر میں وزیر اعظم کے فرائض اور ذمہ داریاں

(از۔ ایچ گناڑے راؤ وایپتی۔ ناظم عدالت ضلع گدوال)

تمدن ہندستان کا پورا انحصار ویدوں پر ہے۔ ویدوں کی تلقین کے لحاظ سے انسان پر چار فرائض عائد کئے گئے ہیں۔ (۱) دھرم (۲) ارتھ (۳) کام اور (۴) موکش۔ پہلا دھرم یعنی مذہب ہے۔ مہرشی جیمینی نے دھرم کی تعریف اس طرح کی ہے: "ہر عمل جو بمتابعت احکام وید کیا جائے اور جس سے آخرت میں راحت (جنت) حاصل ہو، دھرم ہے۔" اس میں احکام دینیات و معاملات دونوں داخل ہیں۔ حصہ دینیات احکام شریعت و عبادت و الہیات تصوف وغیرہ پر مشتمل ہے۔ حصہ معاملات میں قانون صریحی اکیوٹی اور قانون رواجی داخل ہیں فرامین شاہی بھی بمنزلہ قانون تصور کئے گئے ہیں۔

دوسرا ارتھ یعنے جایداد۔ اس میں جائداد کی تحصیل اور اس کے تحفظ کے احکام مدون ہیں۔ معاشیات سیاسیات اور قانون بین الممالک اس میں داخل ہیں۔ کوٹلیا نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔

"ارتھ یعنے ملک (انسان کے بود وباش کا مقام) ملک کا حاصل کرنا، محصلہ ملک کی حفاظت کرنا اور محفوظ ملک کو ترقی دینا ارتھ شاستر ہے۔"

تیسرا کام۔ یعنے راحت جسمانی۔ اسمیں عورت کے ساتھ زندگی تولید بقائے نسل لذت جسمانی حواس پر قدرت اور اصول تحفظ صحت داخل ہیں۔ علاوہ اس کے (سائنس آف سیکس یا جنسیات) بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

چوتھا موکش۔ یعنے نجات اخروی۔ ترک دنیا، ذات کے وجود کو جسم و جسمانیت سے علیحدہ دیکھنا اور سرورِ مطلق میں محو ہونا اسمیں داخل ہے۔ سری ملبھاگو میں اس کی تعریف اسطرح کی گئی ہے۔ "غیر صحیح اور مہمل تصورات کو ترک کر کے ذات کی اصلیت کی طرف رجوع ہونا موکش ہے۔"

واضح ہو کہ ان چاروں میں تابع اور متبوع کی نسبت اس طرح قائم ہے کہ دھرم سب سے مقدم اور افضل ہے۔ ارتھ اسکا تابع اور کام دھرم اور ارتھ دونوں کا تابع ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ حصول جائداد کے جو طریقے اختیار کئے جاویں وہ بالالتزام دھرم شاستر یعنے اصول معدلت کے خلاف نہ ہوں۔ اور کام یعنی شہوت دھرم اور ارتھ دونوں کے خلاف نہ ہو۔ یعنے دھرم شاستر کے احکام متعلق ازدواج کے بھی خلاف نہ ہو اور اپنے مالی حالت سے بھی متجاوز نہ ہو۔ اس بارہ میں کوٹلیا کی یہ رائے ہے کہ دھرم ارتھ اور کام یہ تینوں مساوی حثیت رکھتے ہیں۔ اگر ایک کو بھی ترجیح دی جائے تو نہ صرف بقیہ دونوں بیکار ہو جائینگے بلکہ جس کو ترجیح دی گئی ہے اس کا بھی لطف جاتا رہے گا۔ کام شاستر کا آخر مصنف مہرشی واتساین بھی اس سے اتفاق کرتا ہے۔ مخفی مباد کہ کام شاستری موکش کو فرائض زندگی میں شمار نہیں کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ زندگی کے مقاصد صرف تین ہی ہیں یعنے دھرم ارتھ اور کام۔ اگر عورت نہیں ہے تو دھرم اور ارتھ دونوں نہ صرف بیکار ہیں بلکہ زحمت دہ ہیں لیکن دھرم شاستر کا تو یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب دھرم شاستر اور ارتھ شاستر دونوں کے احکام ایک دوسرے کے مخالف اور متضاد پائے جاویں تو احکام دھرم شاستر ہی کو ترجیح دی جائیگی۔ مگر اس کے خلاف کوٹلیا کہتا ہے کہ دھرم شاستر (جسمیں فرامین شاہی داخل ہیں) اختلاف ہو تو فرامین شاہی کو جو معقول وجوہ پر مبنی ہوتے ہیں ترجیح دیجائیگی۔ اس کے برخلاف دھرم شاستر کی تائید میں مشہور شارح وگنانیشور نے اپنے

متاکشرامیں یہ وضاحت کی ہے کہ ارتھ شاستر خود دھرم میں داخل ہے اسلئے کہ دھرم شاستر میں بادشاہ کے فرائض اور ذمہ داریوں کے احکام بھی مدون ہیں پس بصورت اختلاف احکام دھرم شاستر ہی کو ترجیح دی جائیگی۔ لیکن اس کے خلاف باوثوق طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ارتھ شاستر میں بھی دھرم شاستر کے احکام از قسم نصفت وسیاست درج ہیں اسلئے ارتھ شاستر ہی کو ترجیح دیجائے۔

واضح ہو کہ کوٹلیا نے اپنے قانون ملک میں چند ایسے قواعد وضع کئے ہیں کہ جو صریحی احکام دھرم شاستر کے خلاف ہیں۔ چنانچہ وہ نہ صرف بیوہ کے ازدواج ثانی کو جائز قرار دیتا ہے بلکہ مفقود الخبر شوہر کی زوجہ کو بھی ازدواج ثانی کی اجازت دیتا ہے۔ زوجین میں مخالفت زیادہ ہو تو طلاق کی اجازت دیتا ہے۔ قمار بازی کو اسلئے رائج رکھتا ہے کہ اس سے رعایا کی بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جو انتظام مملکت کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ طریقہ نیوگ کو فرقہ برہمن میں بھی رائج رکھتا ہے۔ دشمن اور باغیوں کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی سے پیش آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ دھرم شاستر کے مصنفوں نے بلحاظ اصول معدلت عامہ کوٹلیا سے اختلاف کیا۔ اور نیز جین فرقے بھی کوٹلیا کی تردید کی اسلئے کوٹلیا کی حیثیت زیادہ متاثر ہوئی۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح بھی ہو مگر میری رائے میں اس کا الزام کوٹلیا پر عاید کرنا مناسب نہیں ہے۔ اسلئے کہ یہ ایک اصولی اختلاف ہے۔ کوٹلیا چوتھی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے۔ اور آپستمبھ جو بلاشبہہ چھٹی یا پانچویں صدی قبل مسیح میں گذرا ہے، اپنے دھرم سوتر میں یہی اصول قایم کرتا ہے۔ اور صاف بیان کرتا ہے کہ "دھرم شاستر اور ارتھ شاستر کے احکام اگر باہم متضاد ہوں اور وقت واحد میں واجب التعمیل ہوں تو اگر کوئی شخص فرائض دھرم ترک کرے تو وہ بارہ سال تک جلا وطن کیا جائیگا پس یہ سلسلہ اختلاف قدامت سے جاری ہے۔ اور اپنے اپنے نکات نگاہ سے یہ تصادم ہمیشہ کے لئے رہیگا۔

اصول نصفت و معدلت عامہ کا اقتضا یہ ہے کہ ہر ایک عمل مبنی بر انصاف ہو بخلاف اس کے سیاسیان عملیت پسند اور مدبران پایہ بلند رموز سیاسی میں معدلت عامہ کو دخل نہیں دیتے ہیں۔ کوٹلیا تو کہتا ہے کہ ارتھ ہی نہایت وقیع اور اہم ہے۔ دھرم اور کام اسکے ذیلی اور ضمنی ہیں۔ کام یعنی راحت دھرم سے ہے۔ اور دھرم کی بنا پر ارتھ ہے۔ اسں کا منشار یہ ہے کہ اگر دولت ہے تو مذہب کے فرائض اور خیر و خیرات بھی ہے اور عورت کے ساتھ راحت بھی۔ مفلس کو مرشد بھی نہیں چاہتا اور عورت بھی دور کرتی ہے۔ الغرض یہ ارتھ شاستر کے بنیادی اصول ہیں اور یہ اسکے خصوصیات مخصوصہ ہیں۔

بلا خوف تردید محققان مغرب جنہوں نے محض یک طرفہ اور نا کافی مواد پر اپنے قیاسات قائم کئے ہیں، یہ کہا جائے گا کہ کوٹلیا چندر گپت بادشاہ کا وزیر اعظم تھا اور اس کا نام وشنو گپت تھا اور اسکو چانک بھی کہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوٹلیا اسں کا خاندانی نام ہے پرور درپن نامی کتاب میں کوٹلی نام کا ایک گوتر بھی پایا جاتا ہے۔ کوٹلیا نہایت ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ مذہب کا پورا معتقد، سیاسں تھا۔ یہ بالکل سادہ مزاج مگر عمیق، بالکل بے لوث مگر سچا خیر خواہ سلطان، ہمدرد مگر سیاسی امور میں بیحد سخت تھا۔ ارتھ شاستر بلا شبہہ کوٹلیا ہی کی تصنیف ہے۔ میرے خیال میں سنسکرت کے سارے تصانیف میں سلطنت اور سیاسیات کے موضوع پر اسں پایہ کی دوسری کتاب ہی نہیں ہے۔ یہ کتاب عمیق علمی مباحث اور زمانہ سابق کے حالات ملکی و معاشرتی کے تفصیلی معلومات سے مملو ہے۔ قدیم تمدن ہند کی عالمگیر وسعت کا صحیح اندازہ اسں سے ہوتا ہے۔ قدیم حکما کے سیاسیات کے اصول و ہدایات عملی کا پورا اختصار اسمیں کیا گیا ہے۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ شعبہ سیاسیات ہندستان میں ہزارہا سال کے قبل نہایت مستحکم بنیاد پر قائم تھا۔ اور اسں کی ترقی اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ اس کتاب کی زبان نہایت صاف اور بامحاورہ ہے۔ قانونی سیاسی اور معاشیاتی

اصطلاحات اسمیں زیادہ ہیں۔ اس سے اس زمانہ میں قوم کی مساعی اور سرگرمیوں کا پورہ اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یاگنہ ولکیہ سمرتی میں اور اسکی شرح متاکشرا میں مسائل قانونی زیادہ وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں نہ صرف پلیڈنگس کی تفصیل بلکہ امر منفصلہ بار ثبوت جزء متروک و مانع تقریر مخالف جیسے پیچیدہ اشکال بھی بتائے گئے ہیں البتہ مسائل علم کلام اور فلسفہ سے زیادہ بحث کی گئی ہے۔ بخلاف اس کے ارتھ شاستر کی زبان خالص قانونی ہے۔ خصوص ہر ایک باب کی آخری نظم نہیں بہت ہی نکیلے جامع سیاسی ضرب الامثال ہیں۔

کوٹلیا کے نقطۂ نگاہ سے ایک سلطنت (۸) عناصر پر مشتمل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ (۱) بادشاہ۔ جو تمام صفات شاہی سے متصف ہو (۲) قابل وزیر (۳) بہترین زرخیز ملک (۴) مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعہ (۵) کافی خزانہ (۶) جرار فوج (۷) وفادار دوست (۸) کم ہمت دشمن۔

بادشاہ میں جن اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے ان کا بیان نہایت تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کا اختصار یہ ہے کہ بادشاہ کو چاہئے کہ اپنے رعایا کی راحت ہی کو اپنی عین راحت خیال کرے۔ اور رعایا کی بہبودی میں ہی اپنی بہبودی سمجھے بادشاہ بالذات جس چیز کی خواہش کرے اس سے اس کو راحت حاصل نہیں ہوتی رعایا کو جس چیز کی ضرورت ہو اسی میں بادشاہ اپنی راحت کا تصور کرے۔ بادشاہ کو لازم ہے کہ وہ ہر وقت مستعد اور باخبر رہے اس کی سرگرمی ہی دولت اور اقبال کا اصلی سبب ہے۔ اور اس کی غفلت ہی زوال کا باعث ہے۔

مخفی مباد کہ کوٹلیا کا مسلک حکومت دستوری ہے۔ اور اس لئے وہ بادشاہ میں جن اوصاف کا لزوم بیان کرتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی نظر میں وزیر اعظم اور دیگر وزرا کس پائے کے ہونے چاہئیں۔

وساکھدت نے اپنے ناٹک مدرا راکشس میں نہایت قابلیت کے ساتھ کوٹلیا کے اس طرزِ حکومت کا ایک بہترین سین تبلایا ہے۔ بادشاہ نے ایک تقریب کا جشن اعلیٰ پیمانہ پر منانے کا حکم دیا تھا۔ مگر اس کو کوٹلیا نے رازمیں روک دیا۔ بادشاہ نے دریافت کیا کہ شاہی فرمان کو اس طرح روکنے میں کیا مصلحت تھی۔ اس کے جواب میں کوٹلیا بیان کرتا ہے کہ ارتھ شاستر میں تین قسم کی حکومت بیان کی گئی ہے۔ ایک وہ جسمیں بادشاہ مطلق العنان ہوتا ہے۔ یہ شخصی حکومت ہے۔ دوسری وہ جسمیں وزیر اعظم ہی ساری حکومت کرتا ہے۔ اس میں بادشاہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔ یہ حکومت دستوری ہے۔ تیسری وہ جسمیں بادشاہ اور وزیر دونوں ملکر حکومت کرتے ہیں۔ چونکہ اس سلطنت میں حکومت دستوری قایم ہے، اسلئے بادشاہ کو اس طرح وجہ تک دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے کوٹلیا کے ذاتی خیالات کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ وہ دستوری حکومت کا حامی ہے۔ برین ہم بادشاہ کو اصل مصدر حکومت تصور کرتا ہے۔

کوٹلیا ایک کلیہ قائم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سلطنت کے کاروبار دوسرے کی امداد کے بغیر انجام نہیں پاتے ایک ہی پہیے پر گاڑی چل نہیں سکتی۔ اسلئے بادشاہ کو لازم ہے کہ وزرار کا تقرر کرے اور ان کا مشورہ لے۔ انتخاب اور وزرار کے تقرر کے بارہ میں ایک دلچسپ اور نہایت مفید بحث کی گئی ہے۔

حکیم بہار دواج کہتا ہے کہ بادشاہ کو چاہئیے کہ وزرار کا انتخاب اپنے ہم مکتب اشخاص میں سے کرے۔ اسلئے کہ وہ ان پر ہر طرح اعتماد قایم کرسکتا ہے۔ ان کے عادات وصفات سے بادشاہ بذات خود واقف ہوتا ہے۔ وسالاکش اس کی تردید کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ہم مکتب میں کوئی غیریت کا احساس نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ کسی وقت بادشاہ کی تذلیل یا تحقیر بھی کریں۔ پس وزرائے ایسے ہوں جو بادشاہ کے ہم خیال ہوں چونکہ ہم خیال وہم جنس کے عادات وصفات ایک ہی ہوتے ہیں،

اس لئے وہ بادشاہ کے ساتھ بیوفائی یا بے حرمتی کی کوئی حسرکت نہ کرسکیں گے۔ اور کسی راز کا بھی افشا نہ ہونے پائے گا۔ اس پر پراشر کا اعتراض یہ ہے کہ جن جن اصحاب کو بادشاہ کی کمزوریوں سے اور رموز سے واقفیت ہوتی ہے اور جو بادشاہ کے رازدار ہوتے ہیں، ان تمام سے بادشاہ کو مسکنت ہوتی ہے۔ اور ہر وقت بادشاہ کو اپنے راز کے افشا کا خوف طاری رہتا ہے۔ اسلئے وزراء کا انتخاب ایسے لوگوں میں سے ہونا چاہیے جنہوں نے مشکل اور پریشانی کے وقت اپنے کو وفادار ثابت کیا ہو۔ اور اپنے جان تک کی پرواہ نہ کی ہو۔ پسون کہتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک خیر خواہی اور عقیدتمندی کی صورت ہے اس کو خدمت وزارت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس میں دانشمندی کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ پس وزیر وہ ہی ہو سکتا ہے کہ جسمیں ذاتی قابلیت ہو اور جس نے اپنے تدابیر اور دوراندیشی سے حقیقی طور پر سلطنت میں مالی فائدہ تیا یا ہو۔ کونپ دنت کہتا ہے کہ ایسے شخص میں دیگر صفات ضروری مفقود ہوتے ہیں۔ وزیر وہ ہو سکتا ہے جو اعلیٰ خاندان سے ہو اور جس کے آبا اجداد بھی خدمت وزارت پر ممتاز رہے ہوں۔ اور شاہی خاندان سے تعلقات رکھتا ہو اور سابقہ کارناموں کو پیش نظر رکھکر کسی وقت معتوب ہونے پر بھی اپنے آقا کے ساتھ وفاداری ترک نہ کرے۔ اس کے خلاف وات ویادھی کی یہ رائے ہے کہ اگر طبقہ امراء سے وزرار کا انتخاب ہو تو احتمال ہوتا ہے کہ وہ بغاوت کریں۔ پس وزرار ایسے ہوں جو اجنبی ہوں اور ماہر سیاسیات ہوں وہی بادشاہ کے پورے آداب کا لحاظ رکھ سکتے ہیں۔ ان تمام کے خلاف باصو دنتی سیاسہ کہتی ہے کہ ایسا شخص جو تعلیم یافتہ ہو مگر عملی تجربہ نہ رکھتا ہو وزارت کا اہل نہیں ہے۔ اس کی رائے میں وزیر وہی ہو سکتا ہے جو خاندانی خلیق، پاک دامن اور شجیع ہو اور بادشاہ کا جاں نثار ہو عموماً خدمات وزارت خاص صفات ذاتی پر مبنی ہوتے ہیں۔ کوٹلیا ان تمام سے اتفاق ظاہر کرتا ہے اور یہ اضافہ کرتا ہے کہ کسی شخص کی قابلیت کا اس کے کام کی اہلیت اور اہمیت

سے اور انجام دہی کار کی خاص صلاحیت اور خصوصیت سے کیا جاتا ہے۔

کوٹلیا کہتا ہے کہ بادشاہ کو چاہیئے کہ وزرار کے اختیارات اور اقتدارات کا تعین کرے اور انجام دہی فرائض کے لئے سررشتہ جات متعلقہ کے خاص اوقات اور مقامات مقرر کرے۔

وزرار کے علاوہ ارکانِ مجلس مشیراں بھی ہوں گے۔ ان میں بھی یہی اوصاف ہونگے جو وزرار کے لئے ضروری ہیں۔

علاوہ ان کے ایک اعلیٰ عہدہ دار مذہبی بھی ہوگا۔ وہ ایسا ہوگا جو اعلیٰ خاندان سے ہو شریف المزاج ہو اور چار وید اور چھ لوازمہ وید میں اسکو کافی عبور حاصل ہو۔ فال کھولنے میں (خواہ وہ قدرتی ہو یا اتفاقی) اچھی مہارت حاصل ہو۔ سیاسیات میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو منکسر ہو اتھروہ وید کے عملیات سے آفات آسمانی و انسانی کو رفع کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ بادشاہ کو چاہیئے کہ ایسے شخص کو اپنا مرشد بنائے اور اختیارات سررشتہ مذہبی عطا کرے۔ کوٹلیا ایک کلیہ قائم کرتا ہے کہ کوئی کھشتریہ یعنے اہل تیغ اگر برہمن کے زیرِ نگرانی قابل ارکان کا مشورہ حاصل کرے اور احکام شاستر پر اعتقاد سے عمل پیرا ہو تو وہ گو اسلحہ سے مسلح نہ ہو تاہم شاستر کی تلقین ہی بطور ہتھیار کے اس کی مدد کرے گی اور اس پر دوسرا کوئی غالب نہ آسکے گا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں ریاست کی فلاح وبہبودی کے لئے عالمگیر آفات کو رفع کرنے کے لئے اور دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے یہ حقیقی طور پر روحانی طاقت سے کام لیا جاتا تھا اور اس کا ایک مستقل صیغہ انتظام مملکت میں قائم تھا۔ رفتہ رفتہ مادہ پرستی زیادہ ہونے لگی اسلئے انسان اپنی پوشیدہ قوت کو جاننے اور اس کو عملی طور پر ظاہر کرنے اور اس سے کام لینے کی ترکیب بھول گیا۔ اسلئے آج ہم کو یہ ایک معمہ پُر از خرافات معلوم ہوتا ہے یہ زمانہ مادی ترقی کا ہے۔ سائنس میں تحقیق کرنے والوں کے آئے دن

حیرت انگیز ایجادات کو دیکھکر ہم کو تعجب ہوتا ہے مفید تحقیقاتی اور دفاعی کے بجائے تخریبی، تباہ کن اور مہلک اختراعات ہر روز معرض ظہور میں آرہے ہیں اگر مادہ کی یہ طاقت ہے تو غور فرمایا جائے کہ رُوح کی طاقت کو استعمال کرنے کی قدرت اگر ہم میں آجائے تو کیا حالت ہوگی ۔

ایک امیدوار خدمت وزارت کو صدارت عظمیٰ تک پہونچنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے اور اگر اتفاق سے اس کا تقرر ہو جائے تو اس کے فرائض کیا ہونگے اور اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہونگیں۔ اسکی نسبت کوٹلیا باوثوق طور پر ایک دستورالعمل قائم کرتا ہے۔ میرے خیال میں کوٹلیا اس پیرایہ میں اپنا ذاتی تجربہ ہی ظاہر کر رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مہاپدم کے فرزندوں نے یعنے نندوں نے نہایت شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔ ان کی سلطنت بہت بڑی تھی۔ مگر ان کے ظلم وستم سے رعایا ران سے ناراض تھی چندرگپت کا تعلق شاہی خاندان سے تھا لیکن وہ کسی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ باوجود اس کے کوٹلیا نے چندرگپت ہی کی وزارت قبول کی۔ بادشاہ وقت نند کے پاس جانا تک پسند نہیں کیا۔ اس نے اپنی قوت تخیلہ سے چندرگپت میں گو وہ ایک کمسن خارج وطن اور بے سہارا تھا، دانشمندی اور دوراندیشی اور استقلال کے آثار پائے۔

کوٹلیا یہ کہتا ہے کہ اگر کسی کو معاملات وحالات دنیوی میں کافی تجربہ حاصل ہو جائے تو اسکو چاہیئے کہ اولاً کسی باا ثر وسیلہ کے ساتھ دربار شاہی میں داخل ہوجائے اور بادشاہ کی جو تمام صفات شاہی سے متصف ہو اور جسکی سلطنت میں جملہ عناصر موجود ہوں نظر عنایت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس شخص کو چاہیئے کہ اپنا نظریہ ایسا قایم کرے کہ جس طرح وہ خود کسی سرپرست کا محتاج ہے اسی طرح بادشاہ بھی ایسا ہو کہ اس میں نیک نصیحت حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔ اگر بادشاہ افلاس اور عسرت میں مبتلا ہو اور لوازم سلطنت سے محروم بھی ہو تب بھی ایسے بادشاہ کی مصاحبت قبول کرے بشرطیکہ

اس میں نیک خصائل موجود ہوں مگر کسی حال میں ایسے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے جس میں اخلاق موجود نہ ہوں اور جو سیاسی رموز کے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو اور اپنے حواس پر قادر نہ ہو گو اس کی سلطنت بہت بڑی ہو۔ اس ایک خوش اخلاق اور قابل بادشاہ کی مصاحبت قبول کرنے کے بعد اس کو چاہیئے کہ بادشاہ کو اصول سیاست اچھی طرح ذہن نشین کرائے۔ اگر اس کی تردید نہ ہو تو سمجھئے کہ اس کی پوزیشن قائم ہے۔ اس کے بعد اسکو چاہیئے کہ مسائل سیاسی اور انتظامی پر بلا خوف تردید آزادانہ مباحث کرے اور ایسی رائے ظاہر کرے جو اصول دھرم اور ارتھ کے مغائر نہو یعنے قرین معدلت ہو اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے نہایت مفید ہو۔ وہ یہ تلقین کرسکتا ہے کہ ایک مجمع خلاف قانون کو گو وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو منتشر اور مطیع کرنے میں مطلق تاخیر نہ کی جائے۔ وہ بادشاہ سے ایسا اقرار کر سکے گا کہ اس کی راس ہدایت کی خلاف ورزی نہو۔ اور کوئی حرکت ایسی سرزد نہو جس سے اس کی حیثیت اور اس کا راز فاش ہو جائے۔ وہ یہ بھی اشارہ کرسکتا ہے کہ جب خود بادشاہ بامداد فوج دشمن کا مقابلہ کر رہا ہو تو اس وقت جس موقع پر یہ اشارات خاص سے آگاہ کردے تو فوراً ہتیار روک لئے جاویں۔

جب یہ مصاحب اپنا مفوضہ کام انجام دینا شروع کرے اس وقت اسکو چاہیئے کہ کبھی کوئی حرکت ایسی نہ کرے جس سے اپنے ہم مرتبہ اور ہم نشین کی معمولی ذلت بھی محسوس ہو اور کبھی ایسا بیان نہ کرے جو بے اصول ہو اس کو چاہیئے کہ کبھی آواز سے قہقہہ نہ لگائے گفتگو بھی آواز سے نہ کرے اور کسی کو اپنا رازدار نہ بنائے۔ ذو معنی الفاظ استعمال نہ کرے۔ بادشاہ کا لباس نہ پہنے۔ مغرور یا مسخرہ کی سی حرکت نہ کرے اپنی ترقی کے لئے یا کسی قیمتی شے کے سرفرازی کے لئے عوام میں درخواست نہ کرے۔ ایک آنکھ سے نہ دیکھے۔ ہونٹ نہ چبائے۔ بھوں ٹیڑھی نہ کرے بادشاہ کے کلام میں دخل نہ دے۔ کسی طاقت ور پارٹی کو اپنا مخالف نہ بنائے۔ عورت قرمساق، سفیر ریاست غیرہ

دشمن یا اس کے متعلقین، عہدہ دار برطرف شدہ، فطرتاً بدنیت اشخاص اور ہٹ دھرمی سے دور رہے۔ اگر کوئی امر ایسا ہو جس سے بادشاہ یا سلطنت کا واقعی فائدہ ہوتا ہو تو بلا کسی تعویق کے فوراً اس کو ظاہر کر دے۔ اپنی ذات کے فائدہ کی کوئی بات ہو تو اس کو اپنے دوستوں اور خیر خواہوں کی موجودگی میں ظاہر کرے۔ اگر کسی غیر کے فائدہ کی کوئی بات ہو تو اسکو مناسب وقت اور مقام پر ظاہر کرے۔ اور جو کچھ کہے وہ ایسا ہو کہ جو مفید بھی ہو اور پُر لطف بھی۔ مگر کبھی کوئی ایسی بات نہ کہے جو ناگوار خاطر ہو گو وہ ایک حیثیت سے مفید بھی کیوں نہ ہو۔ اگر بادشاہ خاص طور پر سننے کی خواہش کرے تو راز میں ایسی بات ظاہر کرے جو بُری ہو مگر مفید۔ خموشی بہتر ہے ایسے کلام سے جس سے نفرت پیدا ہو۔ اسلئے کہ ایسے امور کو پوشیدہ رکھنے سے جو بادشاہ کی مرضی کے خلاف ہوں معمولی لوگ بھی اعلیٰ مرتبہ کو پہونچ جاتے ہیں۔ اس کو چاہئے کہ دوسرے پر کوئی تہمت عائد نہ کرے۔ اور خود بھی دوسرے کی بدخواہی نہ کرے۔ دوسرے کے قصور کو معاف کر دے۔ اور زمین کی طرح اپنے میں تحمل کا مادہ بڑھائے۔ اور دوسرے کی رازداری میں دخل نہ دے۔ دانشمندی اسی میں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی ذات کی حفاظت کو مدنظر رکھے۔ بادشاہ کی ملازمت اختیار کرنا آتش کے اندر قدم رکھنے کے مانند ہے۔ آتش جسم کے ایک حصہ کو جلا دے گی یا زیادہ سے زیادہ سارے جسم کو خاک بنا دے گی۔ مگر بادشاہ کا عتاب سارے خاندان کو معہ متعلقین اور ملازمین کے تباہ و تاراج کر دے گا۔

اگر اس مصاحب کا تقرر وزارت پر ہو جائے تو اس کو چاہئے کہ توفیر آمدنی کے ذرائع کا خیال رکھے بعد وضع اخراجات خالص آمدنی میں اضافہ بتائے۔ معاملات خارجی و باطنی میں اور راز و عام میں اور نیز ایسے امور میں جن کے لئے زیادہ صرفہ کی ضرورت ہو اور نیز ایسے امور میں جو کلیتاً قابل نظر انداز ہوں اپنی رائے واضح

طور پر ظاہر کر دے۔ بادشاہ کے ساتھ شکار میں اور ہر قسم کے کھیل میں اور عیش و عشرت میں ہر وقت حاضر باشی کرے۔ اور موقع و محل پر بادشاہ کی توجہ بری عادات سے باز رکھنے کی طرف مبذول کرائے۔ اور بادشاہ کو دشمنوں کی سازشوں اور منصوبوں سے ہر طرح بچائے۔ وزیر کو چاہیئے کہ ہر وقت بادشاہ کے خارجی حرکات و کیفیات سے اس کے حالات و خیالات کو اچھی طرح جان لے اور اس کے لحاظ سے عمل کرے۔ اور جاں نثاری و اطاعت گذاری سے اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کرے۔ اگر بادشاہ اس کی تعلیم و تلقین سے ناراض ہوا ور اس کی کوششوں کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو اور اس کے اعزاز و وقار میں فرق آنے لگے تو وزیر کو چاہیئے کہ فوراً خدمت سے دست بردار ہو جائے۔ یا بادشاہ کے خصائل اور اپنی کمزریوں پر پورا تبصرہ کرکے اصلاح کی کوشش کرے۔ بادشاہ کے کسی حقیقی خیر خواہ کے پاس پہونچکر اس کے توسط سے مختلف تدابیر عمل میں لائے اور اس طرح بادشاہ کے عیوب کو مٹانے کی کوشش کرے اور اس کے بعد اپنی اصلی خدمت پر رجوع ہو کر کام کرنا شروع کرے خواہ اس وقت تک وہ بادشاہ زندہ ہو یا نہ ہو۔

وزیر کو لازم ہے کہ بادشاہ کے مصائب کو دور کرنے کی ہر طرح فکر کرے۔ اور بادشاہ کے دوست یا مورد عنایات کی امداد اور مشاورت سے بادشاہ کے زمانہ علالت میں قبل از قبل ملاقاتیوں کے ہجوم کو روکنے کا معقول انتظام کرے۔ جو اصحاب مشتاق ملاقات ہوں ان کو ایک یا دو ماہ میں صرف ایک مرتبہ باریاب ہونے کا موقع دے۔ یہ حیلہ کیا جا سکتا ہے کہ سرکار ایسے مراسم کی انجام دہی میں مصروف ہیں جو عالمگیر آفات کے ارتفاع کے لئے یا دشمن کی بیخ کنی کے لئے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ یا ایسے عمل میں مصروف ہیں جو ازدیاد عمر و اقبال کے لئے یا بقائے نسل کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ خاص حالات میں وزیر ایک مصنوعی بادشاہ بنا کر

بتا سکتا ہے۔ نہ صرف اپنی رعایا کے اطمینان کے لئے بلکہ ریاست ہائے غیر کے سفیروں کو بھی (خواہ وہ دوست ہوں یا دشمن) ایسے مصنوعی بادشاہ کے پاس باریاب کرائے۔ ایسا مصنوعی بادشاہ بھی وزیر ہی کو اپنا نائب تکلم بنائیگا۔ چوبدار یا عہدہ دار حرم کی وساطت سے شاہی فرمان حاصل کرنے کا بہانہ کرکے مناسب جوابات خود وزیر ہی ادا کریگا۔ خاطیوں یا باغیوں کے حق میں شاہی عتاب کا اظہار اسی طریقہ سے ہونا چاہیئے۔ خیرخواہ کے حق میں صرف سرفرازی اس طرح بالنیابت ہوگی۔ وزیر کو چاہیئے کہ خزانہ اور مرکزی فوج دونوں ایک ہی جگہ قایم کرکے خواہ اندرون قلعہ ہو یا کسی سرحدی مقام مناسب پر اور ان پر ایسے عہدہ دار مقرر ہوں جو حد درجہ معتبر اور رازدار ہوں۔ امرا یا شہزادگان کو کسی سرکش یا باغی کی گرفتاری کے لئے روانہ کرے۔ یا کسی غنیم کی سرکوبی کے لئے بھیجدے۔ یا بادشاہ کے عزیز یا دوستوں کی ملاقات کے لئے روانہ کرے اگر قرب وجوار کا کوئی امیر یا ریاست غیر کا بادشاہ چڑھائی کی دھمکی دے تو وزیر کا فرض ہوگا کہ اسکو کسی تقریب میں یا شادی میں یا ہاتھی کو پکڑنے کے حیلہ سے یا سوداگروں سے گھوڑوں کو انتخاب کرکے خرید کرنے کے لئے یا کسی تجارت کی غرض سے دعوت دے اور گرفتار کرکے رکھے۔ تاوقتیکہ مناسب شرائط پر مصالحت نہ ہو جائے اور تعلقات دوستانہ قایم نہوں یا بادشاہ کے کسی دشمن یا صحرائی فرقہ کے ساتھ جنگ قبول نہ کرے یا اپنے ملک کا ایک حصہ دے اس کو مخلصی نہ دی جائے۔

وزیر اعظم بادشاہ کو دیگر وزرا کے عادات وصفات کی جانچ کرنے میں بھی مدد دیگا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو ہر ممکنہ طرح سے ترغیب وتحریص دلائی جائیگی۔ اور ان کی اصلیت کا اطمینان کر لیا جائیگا۔ یہاں تک کہ خفیہ جاسوسوں کو ان کے پاس روانہ کرکے باور کرایا جائیگا کہ بادشاہ سخت ظالم ہے اس کو تخت سے اتار کر دوسرے

کسی کو تخت نشین کیا جائے یا بادشاہ کو قتل کیا جائے۔ اسی طرح انواع واقسام کی تحریصین مختلف اشخاص سے یعنی عورتوں سے، فقرا سے، منجمین سے یا دیگر ذرائع سے دلاکر اُس کا امتحان کیا جائے۔ اگر بادشاہ کی اطاعت میں وہ ثابت قدم رہے تو اس کا تقرر کسی خدمت وزارت پر کیا جائے۔ عہدہ داروں کے اوصاف وخصائل کی جانچ وتصدیق اصطلاح میں اوپر باسودہی (उपधाशुद्धि) کہلاتی ہے۔ زمانہ حال کے حلف دلانے کی رسم سے اسکی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

وزیر اعظم حالات خاص کے اعتبار سے ایسے خفیہ منجم کی پیشن گوئی کا لحاظ کرکے مصلحت سیاست کو مدنظر رکھکر عمل بھی کر سکے گا۔ جو اصحاب کسی معقول وجہ سے برانگیختہ ہوجائیں اور اپنے فرائض کی طرف توجہ کریں ان کو دولت وخطابات وغیرہ سرفراز کرکے ہموار کرلے گا اور جو بے وجہ رنجیدہ ہوجائیں یا جو بادشاہ کے خلاف بغاوت میں شریک ہوں ان کو رازمیں سزا دیگا۔

سیاسی رموز کا افشا سخت ترین گناہ ہے۔ کوٹلیا اُس کا سخت مخالف ہے۔ اُس کی رائے ہے کہ ایسے جرائم کے مرتکب کو خواہ وہ وزیر ہی کیوں نہ ہو سخت سزا دی جائے۔ یہاں تک کہ اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائینگے۔ وزیر بادشاہ کا عصائے حکومت ہے۔ اُس کا فرض ہے کہ کونسل میں امور سیاسی کے ہر ایک پہلو پر کافی غور کرے اور ان کے نتائج کا صحیح اندازہ لگائے۔ ارتھ شاستر میں اُس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے انتظام مملکت کے (۲۸) مختلف سررشتہ جات قائم کئے گئے ہیں۔ ان میں دیہی پنچایت صنعت وحرفت، کروڑگیری، اعداد وشمار، اوزان پیمانہ، آبکاری، داخلہ مال درآمد وبرآمد وغیرہ بھی داخل ہیں۔ ان سررشتہ جات کے اعلیٰ عہدہ داروں کے کام پر کافی نگرانی رکھنا وزیر کا فرض ہے۔ نگرانی کا طریقہ ایک دلچسپ تمثیل سے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ مچھلی پانی میں رہتی ہے۔

اسلئے وہ پانی ضرور پیتی ہے۔ مگر اس کے حرکات نظر نہیں آتے۔ بخلاف اس کے پرندے جب فصل ایستادہ پر اور ثمرہ دار درخت پر اوڑتے ہیں۔ تو ان کی پرواز اور دیگر حرکات۔ نظر آتے ہیں۔ پس دستور العمل کار ایسا واضح کیا جائے کہ عہدہ داروں کے حرکات مثل پرندوں کے نظر آئیں۔ مثل ماہی کے مخفی نہ رہیں۔ اس کے علاوہ وزیر کا فرض اولین یہ ہوگا کہ ملک کے اخراجات فیاضی کی ہر وقت تنقیح کیا کرے۔ فوج کی بھرتی کرے۔ دشمن اور لوٹیرے فرقوں کی سرکوبی کرے۔ ریاست کی ہر طرح حفاظت کرے۔ عام مصائب و آفات کو رفع کرنے کی کوشش بلیغ کرے۔

بادشاہ کے وارث جابر کی حفاظت کرے۔ اور ولی عہد کی تخت نشینی کا انتظام کرے۔ کوٹلیا صاف بیان کرتا ہے کہ ریاست کی تمام سرگرمیاں وزیر اعظم ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ رعایا کے تمامی کاروبار اطمینان بخش طریقہ سے اور کامیابی کے ساتھ انجام پائیں۔ نیز وزیر اس کا بھی ذمہ دار ہے کہ ہر طرح رعایا کے جسم و مال کی حفاظت ہو۔ اور اندرونی و بیرونی دشمن کے پنجۂ آہنی سے رعایا ہمیشہ محفوظ رہے اس کو چاہئے کہ نئے قبیلوں کی آبادکاری اور ان کی معاشرتی ترقی کا انتظام کرے اور ملک کے غیر زرعی حصہ کو ترقی دے۔ اگر وہ مناسب خیال کرے تو بلحاظ اہلیت و قابلیت عہدہ داروں کو خطابات عطا کرے۔

المختصر وزیر کی قابلیت کا معیار یہ ہے کہ ایک تیرانداز کے ہاتھ کا تیر صحیح نشانہ پر لگے یا ممکن ہے کہ خالی جائے مگر وزیر کی عقلی تجویز دشمن کے خاندان کے سارے ارکان کو بالالتزام تباہ کردے گی خواہ ان میں سے کوئی رحم مادر ہیں کیوں نہ چھپ جائے۔

وزیر خود یا امرار و اقربا بادشاہی کی امداد سے کسی وارث جائز کو تخت نشین بنا کر عوام میں اس کی تشہیر کرے یا ہر قسم کی رکاوٹ اور مزاحمت کو رفع کر کے عنان حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے۔

اگر قریب جوار کا کوئی بادشاہ تکلیف دیتا ہو تو وزیر کو چاہیئے کہ اس کو دعوت دے کر بلائے اور اطمینان دلائے کہ اُسی کو تخت نشین کیا جائے گا۔ اس طرح جب وہ پورے طور پر وزیر کے بس میں آجائے تو وزیر اُس کا خاتمہ کر دے۔ یا جب تک وہ راہ راست پر نہ آجائے اس کو قید ہی میں رکھے۔

وزیر کا فرض ہے کہ بسہولت تمام اولاً ریاست کا بار وارث جائز کے دوش پر عائد کرے۔ اور اس طرح پورا انتظام کرنے کے بعد بادشاہ کے اس عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف سفر کرنے کی خبر شائع کر دے۔ اگر اتفاق سے بادشاہ کا انتقال کسی دشمن کے علاقہ میں ہو جائے تو وزیر یہ ظاہر کرے کہ بادشاہ کو اس سے سخت عداوت تھی۔ اور اس طرح دشمن سے صلح کر کے اولاً اپنی مخلصی حاصل کرلے۔ اور اس بعد قرب وجوار کے کسی شہزادہ کو لا کر قلعہ کے اندر ہی اس کو تخت نشین کرے۔ یا کسی وارث جائز کو حقیقی طور پر بادشاہ بنائے۔ اور خود آزادہ کر فوج لیکر دشمن کا مقابلہ کرے۔ اس طرح کوٹلیہ کی یہ رائے ہے کہ وزیر خود پورے اختیارات شاہی استعمال کرے۔ (राजैश्वर्यममात्य: कारयेत्)

ایک سیاس بھاردواج کی رائے ہے کہ چونکہ وقت کا اقتضا یہ ہے کہ موقع صرف ایک ہی مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ بار بار نہیں آتا۔ اس لئے طالب موقع کو چاہیئے کہ ایسے موقعوں پر خود ہی بادشاہ بن جائے۔ کیونکہ اپنی ذات سب سے پیاری ہوتی ہے۔ مگر کوٹلیا اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صریحی

ناانصافی ہے۔ اس کو مقبولیت عامہ کا درجہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس عمل سے رعایا مشتعل ہو جاتی ہے۔ اس لئے وزیر کو چاہئے کہ ایسے موقع پر کسی ایک ایسے لڑکے کو تخت پر بٹھائے جس میں شاہی اوصاف پائے جاویں۔ اگر ایسا کوئی دستیاب نہ ہو تو شاہی خاندان کے کسی شخص کو تخت پر بٹھائے۔ گو اس کے اخلاق اچھے نہ ہوں۔ یا بادشاہ کی دختر کو یا ملکہ کو جو حاملہ ہو تخت پر بٹھائے۔ اور دوسرے وزرا سے مخاطب ہو کر کہے کہ "یہ آپ کی امانت ہے۔ آپ اس لڑکے کے باپ کا خیال رکھئے۔ نیز آپ اپنے سابقہ کارناموں کا اور اپنے خاندان کے اعزاز کا لحاظ کیجئے۔ لڑکا کیا ہے صرف ایک نشان ہے۔ دراصل آپ ہی مالک ہیں۔" اس کے ساتھ ہی بعض اصحاب جن کو پہلے ہی سے اشارہ ہوتا ہے فوراً "آمین" کہیں۔ اور یہ بھی کہیں کہ بجز آپ جیسی ہستی کے بھلا کون ایسی بڑی سلطنت کو اور رعایا کو جس میں معزز ومحترم برہمن شجیع کہشتریہ دولت مند ویشں اور قابل قدر شودر ہوں پرورش کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔" جب اس طرح خیالات ظاہر کردے جاویں تو دیگر وزرا کو بھی "آمین" کہنا لازم آتا ہے۔ اور یہ انتظام قائم رہ جاتا ہے۔ اس موقع پر وزیر اعظم کا کام ہے کہ دیگر وزرا اور افسران فوج کی تنخواہ میں اضافہ کرے۔ اور یہ بھی وعدہ کرے کہ جب یہ لڑکا بالغ ہوگا تو مزید اضافہ کیا جائیگا۔

اس کے بعد وزیر اس لڑکے کی تعلیم کا معقول انتظام کرے۔ دختر کو تخت نشین کرنے کی صورت میں اس کی شادی اسی قوم کے کسی ذی اثر لڑکے کے ساتھ کرائی جائے۔ اور اس کے بطن سے جو لڑکا پیدا ہو وہ تخت نشین کیا جائے گا۔ اگر ملکہ (جو حاملہ ہو) تخت نشین ہوگی تو شاہی

خاندان کا کوئی خوش اخلاق اور خوبصورت شخص بطور نائب شہزادہ کے مقرر کیا جائے گا۔ وزیر اعظم کو چاہیئے کہ اپنی آسایش کی غرض سے کسی پُرلطف شئے کا خود استعمال نہ کرے۔ البتہ بادشاہ کے لئے نئی وضع کی سواریاں، بہترین گھوڑے، قیمتی زیورات، خوش لباس، خوبصورت عورت اور اعلیٰ ترین ایوان شاہی وغیرہ مہیا کر سکتا ہے۔

بعد بلوغ شہزادہ کو اختیار ہے کہ اس وزیر سے ناراض ہو جائے یا اس کی تلقین پر عمل پیرا ہو۔ اگر بادشاہ امرار کے اثر میں آجائے اور ان کا مطیع بن جائے تو وزیر کا فرض ہوگا کہ وہ ایسے اصحاب کے توسط سے جو بادشاہ کے مقرب اور منظور نظر ہوں بادشاہ کو اصول سیاست کی تعلیم دلانے کی کوشش کرے۔ اور قدیم تاریخ تمدن وغیرہ سے بہترین تمثیلات دیکر رموز سلطنت اچھی طرح ذہن نشین کرائے یا خود کسی سادھو یا فقیر کی شکل میں ظاہر ہوکر بادشاہ کے دل پر اثرات قایم کردے۔ اور جن اصحاب نے بادشاہ کے اخلاق بگاڑے ہوں ان کو سخت سزا دے۔ اور اگر وزیر کو خود نفرت پیدا ہو جائے تو اس کو چاہیئے کہ دنیا سے کنارہ کش ہو جائے مذہبی ریاضت میں مشغول ہو یا جنگل میں جاکر تپسیا کرے۔

یہ بالکل مختصر بیان ان فرائض اور ذمہ داریوں کا ہے جو کوٹلیا ایک ریاست کے وزیر پر عائد کرتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کوٹلیا کی ہستی کس بلند پایہ کی تھی۔ وہ حکومت دستوری کا پورا حامی تھا مگر ساتھ ہی بادشاہ کا پورا معتقد تھا۔ بلکہ سچا خیر خواہ اور جان نثار بھی تھا۔ امور سیاسی میں وہ بےحد سختی کے ساتھ پیش آتا تھا مگر ساتھ ہی وہ بالکل بےلوث اور صوفی منش تھا۔

کوٹلیا کی عظمت کا اندازہ کمترین ناچیز کے اس مختصر بیان سے ہونا ممکن نہیں ہے۔ وہ درحقیقت ایک لاثانی سیاسی تھا۔ وہ سلطنتوں کی بنا رقائم کرتا تھا۔ اور بادشاہ کو حقیقی طور پر بادشاہ بناتا تھا۔ کوٹلیا قدیم بھارت ورس کے فن حکمرانی کا کامل استاد مانا جاتا ہے۔ علوم سیاسیات و معاشیات میں اس کے قایم کردہ اصول عالمگیر اور ناقابل تغیر ہیں۔ فن سفارت میں اس کے تجاویز قطعی ہیں۔ کامل ڈھائی ہزار سال کے قبل اس نے ایسے عملی نکات ظاہر کئے ہیں۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد بھی آج اسی اصلی حالت میں واجب التعمیل ہیں۔ کامندک نیتی سار اور تنتر اکھیایکا وغیرہ مستند کتابوں میں کوٹلیا کی جو عظمت ظاہر کی گئی ہے وہ حقیقت سے خالی نہیں ہے۔ مشہور شاعر کالیداس نہ صرف ارتھ شاستر کے اصطلاحات کو بلکہ اصول سیاسیات کو بھی پرلطف پیرایہ میں ظاہر کرتا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ قدیم زمانہ میں ہندستان میں اس علم کی تعلیم وتدریس کا طریقہ اعلیٰ پیمانہ پر قایم تھا۔ دسویں صدی تک بھی کشمیر وغیرہ ممالک میں اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا پایا جاتا ہے۔ مگر شومیٔ قسمت سے آج ہم اس سے بے بہرہ ہیں۔ دو تین شرح کوٹلیا کے ارتھ شاستر پر لکھی جاچکی ہیں مگر وہ نامکمل ہیں۔

حال میں ریاست ٹراونکور کے پنڈت گنپت ساستری نے ایک شرح لکھی ہے لیکن ارتھ شاستر کے مسائل پر جیسا کہ چاہیئے کافی غور نہیں ہوا ہے۔ اس کتاب سے نہ صرف امور سیاسی بلکہ زمانہ قدیم کے عام حالات معاشرتی، طریقہ تعلیم، مختلف مذاہب، طریقہ انفصال

مقدمات اور زبانِ عدالت وغیرہ ضروری امور اپنی اصلی حیثیت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پر ہر پہلو سے غور ہو کر ایک جامع شرح کے لکھے جانے کی سخت ضرورت ہے۔ میں عرض کرونگا کہ سب سے پہلے اس کتاب کا اُردو زبان میں ترجمہ کیا جائے تاکہ عوام کو اس کی عظمت کا حقیقی طور پر احساس ہو۔

بلدی قوانین حیدرآباد کا ارتقاء

(از محمد فاروق نائب معتمد سیاسیات حیدرآباد)

بلدی قوانین حیدرآباد کے ارتقاء کا کوئی تذکرہ بلدہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی تاسیس اور آبادکاری کی طرف اشارہ کئے بغیر شروع نہیں ہوسکتا۔ مورخین راوی ہیں کہ شہر کا نقشہ ایسا چھایا گیا ہوا تھا کہ قرون وسطی میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ شہر کے عین مرکز میں چار مینار کی عمارت کی چاروں جانب سیدھی سڑکیں نکالی گئیں کہ جن سے حدود شہر کے چار حلقے قائم ہوسکے جا بجا متساوی الاضلاع چوراہے قائم ہوے۔ شہر میں آب رسانی کا ایسا عجیب انتظام تھا کہ بلند عمارتوں تک بھی پانی پہنچ سکتا تھا۔ بارش کے پانی اور غلیظ پانی کے نکاس کے لئے جو موریاں تعمیر ہوئیں وہ آج بھی ماہرین تعمیرات کے لئے موجب حیرت ہیں۔ شہر میں مسافروں کے قیام کے لئے کارروان سرا، مریضوں کے علاج کے لئے دارالشفاء کے ساتھ ساتھ دائرہ میر مومن بھی قائم تھا تاکہ شہر کی آبادی کی ضرورت تدفین کی تکمیل ہو۔ شہر کے انتظام کے لئے کوتوال کو ذمہ دار کیا گیا تھا۔ شہر میں داخلے کے موقع پر سامان کی تنقیح بھی اسی سے متعلق تھی تاکہ مفسدین پر روک رہے نیز چنگی وصول کی جاسکے۔

یہہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں خواہ وہ ہندو مہاجاؤں کا دور ہو کہ مسلمان بادشاہوں کا زمانہ شاہی پایہ تخت یا صوبہ دار کے مستقر جس جگہ بھی قائم رہتے وہاں کی آبادی کے لئے آبنوشی کی خاطر باولیاں، بیماروں کے لئے شفاخانے، دینداروں کے لئے عبادتگاہیں

لڑکوں کے لئے مدارس اور مکتب مسافروں کے لئے سرائیں اور سڑکیں تاجروں کے لئے منڈیاں اور گنج حکومت کی طرف سے قائم ہوتے تھے اور حکومت ہی ان کی نگہداشت کرتی تھی البتہ آبادیوں کے داخلی انتظامات قیام امن رفع خصومات اور دادرسی کی حد تک باشندوں کی اپنی اپنی پنچایتیں قائم تھیں یہہ پنچایتیں ہر مفاد کے لیے الگ الگ ہوتی تھیں اور ہر مفاد خاصا منظم تھا۔ ان حکومتوں کے اس طرز عمل سے ایک طرف ان کے شہروں میں صحت وعافیت کی وجہ خوشحالی رہتی دوسرے امن وامان بھی قایم رہتا کہ جس سے دارالسلطنت کی ساکھ رہتی لیکن شرقی غربی سواحل ہند پر جو برطانوی آبادیاں آباد ہوئیں وہاں بہت عرصے تک ان تاجروں نے جنھوں نے وہاں تجارتی کوٹھیاں قایم کی تھیں ان صالوں مزدوروں اور راڑھیتوں کے محلوں اور بود و باش کے مقامات کی صفائی و آسایش کے طرف توجہ نہیں کی تھی چنانچہ یہہ واقعہ ہے کہ فورٹ سینٹ جارج مدراس کے قریب کی دیسی آبادی کا نام بلاک ٹاون تھا وہاں اس عدم توجہ کی بناء پر ہیضہ اور دوسری بیماریاں لوگوں کو ستاتی تھیں یہی حال بمبئی وکلکتہ کے اطراف بھی تھا۔ بلاحاظ ارباب کمپنی کو کچھ نہ کچھ انتظام ناگزیر ہوا۔ چنانچہ بمبئی اور کلکتہ کی آبادیوں میں یہہ صرف حکام کمپنی تالاب تیار ہوئے کچھ عملہ خاکروبی اور خاشاک برداری کے لئے بھی انھوں نے مقرر کیا۔

لیکن روز بروز کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی اس طرح تکمیل کے معنے اخراجات میں بھی اضافے کے تھے۔ چنانچہ جلد ہی دیسی آبادی سے وجاہت اور اثر رکھنے والے عمائدین کو نامزد کیا گیا اور اس کے بعد ہی مقامی مجالس کی طرح ڈال دیگئی۔ تاکہ وہاں رہنے والوں سے ہی یا وہاں اسباب تجارت لانے والوں سے مقامی محاصل وصول کئے جاکر ان کے چند نمایندوں کی شرکت اور مشاورت سے شہری ضروریات کی تکمیل کی جائے۔ یہہ امر قابل ملاحظہ ہے کہ جو مقامی مجالس اس طرح قائم ہوئیں انکو فصل خصومات دادرسی یا قیام امن سے تعلق نہ تھا بہت دنوں کے بعد جب ان بڑے شہروں میں مجالس آرایش شہر

قایم ہوئیں تو ان کے اخراجات کے لئے بھی چند مقامی محاصل کو مختص کیا گیا یہ نہ ہوا کہ حکومت اپنے موازنے سے ان مصارف کی تکمیل کرتی۔ خلاصہ یہہ کہ ہندوستان کے سب سے زیادہ آباد شہر بمبئی کی جملہ شہری ضروریات اہلِ شہر نے ہی مقامی محاصل کی ادائی سے فراہم کی ہیں۔ دوسرے شہروں کا بھی یہی حال رہا ہے اور وہاں کے بلدی قوانین اور مقامی حکومت کے ارتقاء کا ماحصل ہی یہی ہے۔

اِن اصلاحات کے مدِنظر جو نواب سالار جنگ اول کے ساتھ منسوب ہیں بلدہ حیدرآباد بلکہ ساری ریاست کے اِس بلدی نظم و نسق کا جس کے ارتقاء کو قلمبند کرنا اِس نوشتے کا ماحصل ہے آغاز نواب مرحوم نے ہی کیا۔ ۱۲۷۹ف یعنی ۱۸۶۹ء میں (واضح ہو کہ لارڈ رپن نے ۱۸۸۰ء ۱۸۸۴ء میں ہندوستان میں مقامی حکومت کا آغاز کیا تھا) ایک مجلس صفائی و درستی راستہ جات بلدہ کی خاطر قائم ہوئی اِس مجلس میں ساہوکاروں اور عوام کی طرف سے نمایندے شریک تھے نیز پائیگاہوں اور اسٹیٹوں کے نمایندے بھی شریک تھے۔ رود موسیٰ کے شمالی حصے کو حدود صفائی میں داخل کیا گیا اور ایک مہتمم اور عملے کا تقرر ہوا۔ واضح ہو کہ اس سے پہلے قدیم روایات کے لحاظ سے یہاں کے کوتوال سے یہہ امر متعلق تھا اور ان ہی کے تحت عملہ صفائی اور خاکروب یہہ کام کرتے تھے رفتہ رفتہ اِس مجلس کی ترکیب اور اس کے اراکین کی تعداد میں اضافہ اور تغیر ہوتا رہا۔ ۱۲۹۷ف یعنی ۱۸۸۸ء میں رقبہ چادر گھاٹ کے لیے جہاں برطانوی رزیڈنٹ اور دیگر انگریز حکام و تجار کی سکونت تھی ایک علحدہ کمیٹی قائم کی گئی اور اسی میں اس کے صدرنشین کے سوا گیارہ اراکین شریک تھے بلدے کی کمیٹی ۱۳۰۸ف میں (۱۹) اراکین پر مشتمل ہو چکی تھی جس میں (۹) سرکاری پانچ غیر سرکاری اور پانچ عہدہ دار ارکان شریک تھے۔

سرکار سے اِن کمیٹیوں کو اپنے اخراجات کی تکمیل کے لئے محاصل مسایر (چنگی) کی آمدنی سے جسے حکومت سرکارِ عالی اپنی نگرانی میں وصول کرتی تھی مختص رقومات ڈیڑھ لاکھ و ڈھائی لاکھ علی الترتیب ادا ہوتی تھیں۔ ۱۲۹۷ف مطابق ۱۸۸۸ء میں یہہ امر بہ اجلاس کونسل آف اسٹیٹ

پیشگاہ بندگان اعلیحضرت غفران مکان مرحوم سے منظور ہوا کہ مجالس صفائی کو برطانوی ہند کے مماثل حدود بلدیہ کے مکانات پر محاصل امکنہ وصول کرنے کی اجازت دی جائے چنانچہ اس کے لیے ان مجالس کے عہدہ دار بمبئی بغرض کارآموزی روانہ ہوئے لیکن بہر طور ۱۳۰۰ف ہی میں قواعد حاصل صفائی نافذ ہو سکے۔ یہہ قواعد گاڑیوں اور چوپایوں کے محاصل سے متعلق نہیں تھے اور صرف محصول امکنہ کی وصولی کو جائز کر رہے تھے۔ ابتداءً صرف تین فیصدی شرح سے یہہ محصول وصول ہونا طے ہوا۔ گاڑیوں اور چوپایوں کے محاصل کی وصولی کے احکام اس کے بعد نافذ ہوسکے ۱۳۱۳ف میں رقبہ چادرگھاٹ اور رقبہ بلدہ کی مجالس کا انضمام ہو کر ایک میر مجلس ۱۵ سرکاری ۱۲ غیر سرکاری اور ۱۳ ارکان منتخب عہدہ پر مشتمل مجلس قائم ہوئی۔ میر مجلس صدر المہام صیغہ ہوا کرتے اور کسی نائب میر مجلس کا انتخاب ارکان مجلس کر سکتے۔ اراکین کی نشستوں کے خالی ہونے کی صورت میں مجلس کی سفارش پر جدید رکن نامزد ہوتا۔ غیر سرکاری اراکین زیادہ تر مفادات سے متعلق تھے۔ یہہ انضمام اس طور پر ہو سکا کہ رقبہ چادرگھاٹ کے بورڈ کے کمشنر کو رقبہ بلدہ کا بھی نگران کر دیا گیا۔ رقبہ چادرگھاٹ میں ایوان رزیڈنسی کے وقوع کی بناء پر جو مجلس مقرر تھی اس کے عہدہ دار اکثر انگریز ہی ہوتے تھے۔ باوجود انضمام رقبہ رزیڈنسی بازار رزیڈنٹ بہادر کے زیر انتظام ہی رہا اور ۱۳۴۲ف میں انہیں مسترد کیا گیا۔

جہاں تک کہ محاصل امکنہ کا تعلق ہے اسے اہل بلدہ نے طبعاً بہت دنوں تک قبول نہیں کیا اور ادائی بہت وقت سے ہوتی رہی۔ غرباً طوعاً کرہاً اسے ادا کرتے رہے لیکن امرا اس سے بالکل سبکدوش رہے۔ کونسل آف اسٹیٹ میں جب دستور العمل محاصل کا تعین ہو رہا تھا حضرت اقدس و اعلی مرحوم نے یہہ ارشاد فرمایا تھا کہ میں خود املاک شاہی اور گاڑی گھوڑوں کا ٹیکس عنایت فرماؤں گا (مراسلہ دفتر معتمدی عدالت (۲۹۲) مورخہ ۲۰ فروردی ۱۳۰۴ف) لیکن اس کے باوجود تمام علاقے یہ محاصل نہیں دے رہے تھے۔

مسلسل کارروائی اور معروض کے بعد آخر مبارک دور عثمانی میں جو فرمان خسروی شرف صدور

لایا وہ حیدرآباد کے بلدی قوانین کے تذکرے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

یہہ فرمان درج ذیل ہے ۔

کنگ کوٹھی

مدار المہام سالار جنگ بہادرؔ

بلدہ میں ٹیکس صفائی سب سے وصول کرنے کی نسبت عرضداشت معروضہ ۹ رجمادی الاول ۱۳۳۱ھ کے متعلق معتمد صاحب صرفخاص مبارک کی عرضی معروضہ ۱۶ رجمادی الاول ۱۳۳۱ھ ملفوف ہے حسبۂ ٹیکس صفائی صرف خاص سے لینے کے عوض اس علاقہ کی وہ رقم کروڑگیری جس کا حوالہ معتمد صاحب نے دیا ہے اس میں سالانہ پندرہ ہزار روپیہ حالی بطور امداد اخراجات صفائی کے لئے آغاز سال حال سے اٹھائے جائیں اور تمھاری رائے کے مطابق بلدہ کے تمام امراء و اعزہ کے علاقہ جات سے بھی ٹیکس صفائی حسب ضابطہ آغاز سال حال سے بلا استثناء وصول کرلی جائے۔ اس حکم کی ایک ایک نقل پائیگاہ و دیگر بڑے علاقوں کے پاس میرے حسب الحکم اطلاعاً و تعمیلاً بھیجدی جائے۔ معتمد صاحب صرفخاص کے پاس بھی ایک نقل اطلاعاً میرے حسب الحکم بھیج دی جائے۔ بشرحہ دستخط مبارک ۔

۲۳ رجمادی الاول ۱۳۳۱ھ

اس فرمان مبارک میں صدرالمہام علاقہ صرفخاص مبارک راجہ فتح نواز ونت آنجہانی کی جس عرضی کا حوالہ ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے اور درج ذیل ہے ۔

بعز عرض اقدس اعلیٰ بشرف صدور فرمان مبارک مرقومہ ۱۱ رجمادی الاول ۱۳۳۱ھ خانہ زاد بہ ادب عرض پرداز ہے کہ مدارالمہام بہادر جس اصول پر یہہ ٹیکس طلب فرما رہے ہیں فی زمانہ کے غربی اصول سے بالکل واجبی ہے چنانچہ ان کی تحریر سے ظاہر ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضرت غفرانمکان نے خود زبان مبارک سے ارشاد فرمایا تھا کہ یہہ محصول میں خود ادا کروں گا تاکہ دوسروں کو ادائی میں تامل نہ ہو۔ معززکمیٹی صرف خاص کی تحریک شاہی

امکنہ وصاحبزادگان کے نجی امکنہ سے متعلق ادائی ٹیکس کے خلاف ہے یہہ رائے ترقی خیالات کے مطابق درست ہے کہ بادشاہ تو خود محصول قائم کرتا ہے بادشاہ پر ٹیکس کا مطالبہ کیسا مگر جبکہ انتظام حالیہ صفائی غربی اصول پر مبنی ہے۔ غربی اصول کی پابندی بھی قرین مصلحت ہے ورنہ امراء بھی ادائی میں تامل کریں گے چنانچہ پائیگاہ نے ابتک ایک حبہ ادا نہیں کیا۔ خانہ زاد کی رائے میں ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ ہر دو اصول مصرح بالا کی رعایت ملحوظ رہے وہ طریقہ یہہ ہے کہ ایک رقم مستدیہ مداخل کروڑگیری بلدہ سے بطور امداد صفائی بلدہ سالانہ سررشتہ صفائی کو عطا ہو جو ان محصولات کا بدل کافی ہو جائے کروڑگیری بلدہ میں دو طرح کے محصولات شامل ہیں اول محصول کروڑگیری اس مال پر جو بیرون ممالک سے آتا ہے۔ یہہ محصول شاہی ہے دوسرا محصول اس مال پر جو اندرون ممالک سرکار عالی سے بلدہ میں آتا ہے یہہ محصول لوکل ہے جو از روئے اصول زمانہ حال حق صفائی کا سمجھا جاتا ہے اس محصول بلدہ میں سے سالانہ (صہ ۔۔۔) امداد صفائی بلدہ کو دیا جائے تو جس محصول کا مطالبہ ہے اس کا بدل کافی ہو جاتا ہے کہ تیرہ سالہ محصول کی تعداد (مالہ صہ) درج عرضداشت دیوانی ہے اس کا تیرہواں حصہ بارہ ہزار روپیہ سے خفیف ہی سا زاید ہے مگر آئندہ کی بیشی کی رعایت اور تیرہ سال سے محصول ادا نہ ہوا بقایا حذف کرکے سالحال سے (صہ ۔۔۔) سالانہ امداد صفائی کو عطا ہو تو مناسب ہوگا۔

پائیگاہ اور رسالار جنگ اسٹیٹ کو صریح حکم پیشگاہ اقدس سے ہو تو مناسب ہے کہ بلاعذر یہہ محصول ادا کریں زیادہ حد ادب معروضہ ۱۶ - جمادی الاول ۱۳۳۱ھ

عرضداشت مدارالمہام بہادر واپس گزرانی جاتی ہے عریضہ خانہ زاد

شرمد ستخط

مرلیدہر

۱۳۳۱ف سے ۱۳۴۳ف تک مجلس صفائی کی ترکیب وغیرہ میں کوئی تجاوز یا اضافہ نہیں ہوا۔

لیکن اس کے معنے یہہ نہیں ہیں کہ اس دوران میں بلدی ارتقاء کو بھی سکوت تھا۔

طغیانی رود موسی نے حیدرآباد کے بلدی ارتقاء میں خاص حصہ لیا ہے انسداد طغیانی کے لیے رود موسی اور رود عیسی پر بند تعمیر ہوئے جن کی وجہ عثمان ساگر و حمایت ساگر کے خزانِ آب محزونانی کی شکل اختیار کرسکے اور آج بلدہ کا نظام آبرسانی ان پر مبنی ہے۔ دوسری طرف طغیانی سے متاثر شدہ محلوں کے لیے مجلس آرائش بلدہ قائم فرمائی گئی۔ اب یہہ امر راز نہیں رہا کہ مجلس آرائش بلدہ کی ابتدائی تشکیل میں کرنل سر آر تھر پینے رزیڈنٹ حیدرآباد نے غیر سرکاری طور پر بڑی دلچسپی لی اور ان کی مشاورت و تبصرہ کا اس میں بڑا دخل رہتا تھا۔ مجلس آرائش بلدہ کے ساتھ ساتھ سررشتہ ڈرینج بلدہ بھی قائم ہوا اس سے بہت پہلے سررشتہ برقی اور سررشتہ ٹیلیفون قائم ہو چکے تھے یہاں ان امور کی طرف صرف اس لیے اشارہ ضرور ہوا کہ اپنے دور مسعود میں جلالت مآب حضرت بندگانعالی مدظلہم العالی نے ان ترقیات کے مدنظر علاقہ صرفخاص مبارک کی طرف سے ایک اور فیاضانہ اقدام فرمایا یعنی اس آمدنی کے منجملہ جو محاصل کروڑگیری بلدہ و سکندرآباد کی بابت مد داخل حضور پرنور میں شمار ہوتی اور گزرانی جاتی تھی ایک ربع حصہ ہر سال بلدہ کی ترقیات کے لیے مختص کر لینے کی منظوری صادر فرمائی۔ یہہ رقم تقریباً (۵ تا ۶) لاکھ اوسطاً ہوتی ہے اور اب تک غالباً ایک کروڑ سے متجاوز ہو چکی ہے اس کا معروضہ سر ریجینالڈ گلانسی نے بارگاہ خسروی میں گزرانا تھا اور اس کے چند اجزا قابل سماعت ہیں "علاقہ دیوانی کو ان تمام اخراجات کی سبیل کرنی پڑتی ہے جو انتظام صفائی کے لیے درکار ہو صفائی کے معمولی ٹیکسوں سے نہایت ہی خفیف رقم وصول ہوتی ہے اور سرکار سے انتظام صفائی کے لیے سالانہ (۵ لاکھ) روپیہ کی امداد دی جاتی ہے اس کے علاوہ (۲ لاکھ) سالانہ کی رقم اسکیم آراستگی شہر کے لیے مختص کر دی گئی ہے مزید برآں ایک کروڑ سے زاید رقم اسکیم گنڈی پیٹہ پر صرف کی جارہی ہے جس سے یہہ مقصود ہے کہ بلدہ میں آئندہ طغیانیوں کا سدباب ہو اور صفائی کو سربراہی آب نوشی اور بدررون کے جدید طریقہ سے مہیا کیا جائے بالآخر کوتوالی بلدہ کے پورے

اخراجات رقمی (۶ لاکھ) سالانہ و نیز دیگر مختلف اخراجات متعلق سررشتہ جات تعلیمات وطبابت دیوانی بھی برداشت کرتی ہے۔

"پس یہ امر از بس واجبی ہے کہ علاقہ صرف مخاص اخراجات نظم ونسق شہر میں حصہ لے لہذا یہ تجویز پیش کی جاتی ہے کہ خالص آمدنی کروڑگیری کے فیصد پچاس روپیہ کو نظم ونسق صفائی کے لیے دیوانی میں رکھے لیے جائیں۔" ۱۳۴۲ف میں قانون بلدیہ حیدرآباد کو پیشگاہ حضرت اقدس و اعلیٰ بندگانعالی متعالی مدظلہم العالی سے شرف منظوری حاصل ہوا اس قانون کی رو سے مجلس بلدیہ حیدرآباد قائم ہوئی اس کو اتنے ہی وسیع اختیارات عطا ہوے جتنے اختیارات بلدیہ بمبئی کو جو ہندوستان کی سب سے بڑی بلدیہ شمار ہوتی ہے، حاصل ہیں یہ امر بھی بطور خاص اظہار کے قابل ہے کہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں مثلاً ٹراونکور کوچین میسور کی ریاستوں کے صدر مقامات میں جو بلدیات اس زمانے میں قائم تھیں ان سے بھی بلحاظ اختیارات و دایرہ عمل بلدیہ حیدرآباد پیش پیش تھی اور بلدی امور کی انجام دہی مثلاً تعدید محاصل منظوری موازنہ حصول قرضہ حصول جائداد تقررات، جدید خدمات کا قیام تنقیح حسابات تکمیل کارہائے تعمیری نیز ترتیب قواعد کی حد تک بلدیہ حیدرآباد کو بہت ہی مکمل قسم کی آزادی عمل حاصل تھی۔

لیکن غالباً اس لیے کہ قانون بلدیہ کا مسودہ بہت پہلے مرتب ہوا تھا اور نقش اول تھا اس میں بعض بنیادی اسقام رہ گئے اور کئی ایک تفصیلات نظرانداز ہوگئی تھیں جن سے خود قانون پر عمل کرنے میں مشکلات کا سامنا ہو رہا تھا گذشتہ ۱۰ سال کے دوران میں یہ اسقام روزبروز عیاں ہوتے رہے چنانچہ کمیٹی اصلاحات نے جس کے صدرنشین اور نیز دو ارکان اور معتمد بلدیہ کے رکن تھے ۱۳۴۸ف میں متفقہ طور پر یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جب تک بلدی عاملہ مضبوط نہ ہوگا اور اس کے لئے دوررس پالیسیوں کو بروئے عمل لانے کی پوری سہولتیں حاصل نہ رہے گی ایسے ادارے کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ چنانچہ قانون بلدیہ کے ان اسقام کے ارتفاع کے لئے سرکار عالی نے ناظم بلدیہ کو اسپیشل ڈیوٹی پر متعین کرکے اپنے تجربات نیز

برطانوی ہند کی بلدیات کے قوانین کو سامنے رکھتے ہوئے کمیٹی اصلاحات کی سفارشات کے مطابق جدید قانون مرتب کرنے کے احکام اجرا فرمائے۔ چنانچہ جدید قانون کا مسودہ تیار ہو چکا ہے اور اب زیر تنقیح ہے۔

اب یہاں اس کا اظہار ضروری ہے کہ پایۂ تخت سے باہر ملک سرکار عالی میں بلدی تنظیم و نسق کا کیا ارتقاع ہوا۔ نواب سالار جنگ بہادر نے بلدے کے ساتھ اہم قصبات ملک سرکار عالی میں بھی مجالس صفائی قائم فرما دی تھی اور حکام مال ان کی صدارت کرتے تھے۔ ۱۲۹۷ف میں محصول مالگزاری کے ساتھ ساتھ لوکل فنڈ کی وصولی کا تصفیہ حضرت غفران مکان نے باجلاس کونسل آف اسٹیٹ فرمایا۔ ساتھ ساتھ مجالس تعلقہ مجالس ضلع اور صدر مجلس لوکل فنڈ کا قیام عمل میں آیا۔ اس صدر مجلس کو بعد میں برخاست کر دیا گیا۔ اس امر کے منجملہ جو مالگزاری کے ہر روپیہ کے ساتھ ساتھ لیا جاتا تھا اولاً ۳ پائی کو توالی کے لیے ۲ پائی تعلیم کے لیے ۲ پائی سڑکوں کی تعمیر کے لئے اور ۳ پائی رفاہ عام کے لئے مختص ہوئیں اور اب ۲ پائی رفاہ عام کے لیے تین پائی تعلیم کے لئے اور ۲ پائی صحت عامہ اور طبابت کے لئے مختص ہوتی ہیں۔

مجالس تعلقہ اور مجالس اضلاع کے سوا مجالس صفائی کا ۱۳۱۷ف سے اہم قصبات ملک سرکار عالی میں قیام ہونے لگا۔ ۱۳۴۴ف میں مجالس صفائی اور مجالس اضلاع کے موازنے اور ذرائع آمدنی کو الگ کیا گیا اور ان کے دایرۂ عمل کا بھی تعین ہوا۔ چھوٹے قصبات کے لئے مجالس قصبہ قائم ہوتی ہیں کہ جہاں تحصیلات قائم نہیں اس کے ساتھ مجالس صفائی اور مجالس قصبات کو اپنی حدود میں مقامی محاصل مثلاً گھر پٹی روشنی پٹی۔ نل پٹی۔ سواری پٹی۔ بار برداری پٹی وصول کرنے سے متعلق قواعد مرتب اور نافذ ہوئے نیز ان کے اختیارات کی صراحت کی گئی۔ اسی زمانے میں سرکار عالی نے زرعی مارکٹوں کے بہتر انتظامات کے لئے بھی خود اختیار کمیٹیاں تشکیل دیں جن میں فروخندوں کے اور خریداروں کے نمایندوں کے سوا مقامی مجالس اور سرکار عالی کے نمایندے شریک رہکر مارکٹوں میں خرید و فروخت اوزان و پیمانہ جات

نیز بار کٹوں کے انتظامات صفائی و روشنی اور گوداموں کی تعمیر پر توجہ کی جاتی ہے باور کیا جاتا ہے کہ ان زرعی کمیٹیوں کی حد تک بھی حیدرآباد کو ہندوستان بھر میں کافی اولیت حاصل ہے ان سے قطع نظر خود قصبات اضلاع سرکار عالی میں آبرسانی۔ کندیدگی باولیات۔ آرائش شہر کی حد تک سرکار عالی کی امداد و اعانت میں مثالی کام ہوسکا۔ رفتار زمانہ نے ہندوستان میں یہہ رجحانات پیدا کر دیئے کہ حکومت ملک ملکی باشندوں کے ہاتھ منتقل ہو سواراج کی صدائیں چو طرف بلند ہونے لگیں تو حکام انگریز کو بھی ان رجحانات کا ساتھ دینا پڑا اور چنانچہ منٹو مارلے اور مانٹفرڈ اصلاحات کے بعد صوبہ داری خود مختاری کے قدم اٹھائے گئے ۔

مانٹفرڈ اصلاحات سے متعلق عام تبصرہ یہہ رہا ہے کہ اس نے صوبجاتی حکومتوں میں دوعملی کو رواج دیا۔ اور یہہ تاثرات بھی قلمبند ہوتے رہے ہیں کہ اصلی ذمہ داری محفوظ صیغہ جات کے ساتھ وابستہ رہی اور منتقلہ صیغہ جات ہمیشہ دست نگر اور تشنہ رہے کبھی کبھی تصادم بھی ہوا وغیرہ وہ بلدی قوانین جو برطانوی ہند میں اس زمانے میں نافذ ہوئے ہیں ان کا اگر تجزیہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ خود مقامی حکومت کی حد تک بھی دوعملی بلکہ سہ عملی رائج کی گئی ۔ ۱۹ ویں صدی کے آخری عشرے میں جو بلدی قوانین کلکتہ، مدراس، بمبئی کے حدود میں نافذ تھے ان میں بلدی ادارات ایک میر مجلس اور ایک مجلس پر مشتمل رہتے تھے۔ میر مجلس سرکاری عہدہ دار ہوتا اور سرکار سے مقرر ہوتا تھا مجلس کی صدارت کرتے ہوے وہ نہ صرف مباحث کی رہنمائی کرتا بلکہ جملہ اختیارات عاملانہ بھی اسے ہی حاصل ہوتے تھے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے ان تین بڑے شہروں کی بلدی ترقی اسی زمانے کا ماحصل اور ثمرہ ہے اور وہاں ان ہی میران مجلس کے وجود سے بلدی نظم ونسق برتری اور استواری حاصل کرسکا۔ برطانوی ارباب سیاست کے پاس سواراج یا اختیارات حکومت ہندوستانی ہاتھوں میں منتقل کرنے کی تحریک کو مقامی مجالس کی حد تک اس طرح قبول عطا ہوا کہ تین جدا جدا اور مساوی الاقتدار کارفرما ادارے تجویز کئے گئے۔ بلدیہ۔ قایمہ۔ ناظم بلدیہ۔ بلدیہ کی صدارت کو عوام کے

کن کے لئے مختص کر دیا گیا تو ناظم کا تقرر حکومت نے اپنے سے متعلق رکھا کہیں کہیں بلدیہ کا صدر اختیارات عاملانہ بھی رکھتا تھا تو کہیں وہ صرف بلدیہ کے مباحث کی قیادت اور صدارت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ غیر سرکاری صدر بلدیہ بصورتیکہ وہ با اختیار ہوتا اپنی دوسری سیاسی یا کاروباری مصروفیات کی وجہہ پورا وقت بلدیہ کو دینے سے قاصر رہتا تھا اس کے سوا اسے وہ تجربہ بھی نہ ہوتا جو کئی سال کی کارآموزی اور ذمہ دارانہ کارفرمائی سے کسی سرکاری عہدہ دار میں موجود ہوتا ہے نیز چونکہ وہ غیر سرکاری ارکین کی اکثریت کا اپنے انتخاب کے لیے ممنون رہتا لہذا اس اکثریت کو راضی رکھنے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ تجاوز کرنا پڑتا تھا اور اگر سوء اتفاق سے صدر یہ طے کرلیتا کہ چند روزہ اقتدار سے استفادہ مناسب ہے تو پھر اس نے بددیانتی اور استحصال سے بھی بہرہ کار رکھا ہے اور ایسی صورت میں کہ صرف ناظم بلدیہ سے عاملانہ اقتدار متعلق رکھا گیا مجلس بلدیہ اور ناظم بلدیہ میں اقتدار کے استعمال کرنے اور اس کی تحدید کرتے رہنے کا لامتناہی اور ناخوشگوار سلسلہ جاری رہا تصادم کا زور رہا اور بلدیات ایک طرح کا کھلونا یا دنگل ہوکر رہ گئیں۔ ایک آدھ مثال ہی ایسی ملتی ہے کہ جہاں شہری رائے عامہ کے تربیت یافتہ ہونے نے بلدی نظم و نسق کی خوبی اور ہم آہنگی کو باقی رکھا۔

دراصل برطانوی ہند کی سیاست کا یہ امتیازی نشان ہے کہ برطانوی عہدہ داروں کو الگ کرتے اور ہندوستانی ہاتھوں میں حکومتی مشنری کے منتقل کرنے کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری فرق و اختلاف کو بڑی شدت دے دیگئی حتیٰ کہ کسی تحقیقاتی مجلس کا صدر اگر سرکاری عہدہ دار ہو تو اور اگر کوئی غیر سرکاری شخص صدر بنایا جائے تو رائے عامہ کا رجحان بھی بدلا ہوا رہتا تھا یہ امر وہاں کے بلدی نظم و نسق کو بھی متاثر کرسکا ورنہ بڑی مناسبت کے ساتھ کسی ہندوستانی صدر بلدیہ یا کارگزار شہری کو افسر عاملۂ بلدیہ سرکار سے ہی ہی تقرر کردیا جاسکتا تھا۔ بلدیہ میں ساتھ ساتھ عوام کے نمایندوں کی اکثریت کی شرکت بھی مناسب

ہوتی یہ ہندوستانی صدر کو اپنے تقرر کے لیے شہری نمایندوں کی رائے دہی کا دست نگر نہ رہتا لیکن شہری نمایندوں کے عدم اعتماد کے اظہار پر یا اور طرح سے فرایض کی انجام دہی میں اپنے قاصر رہنے کی صورت میں وہ علحدہ ہو جاتا نیز رقمی منظوریات یا تقررات کے لیے اسے اپنی مجلس یا اس کی ذیلی مجلس کی رائے اور مشورے پر عمل کرنے کی پابندی اسے مطلق العنان یا خود سر نہ ہونے دیتی یقیناً اسی طرح عمل ہوتا بلدی حکومت کی انجام دہی کو تصادم اور الجھنوں سے دور رکھتا۔

یہہ ایک حسن اتفاق اور خوش آیند ابتدا ہے کہ ہمارے ہاں کی مقامی حکومت کے لئے اسی اصول کو بطور اساس اختیار کر لیا گیا ہے۔ واقعہ یہہ ہے کہ ملک کے مختلف مفادات اور حکومت کے مابین زیادہ سے زیادہ موثر اشتراک کے ذرایع فراہم کرنا بطور ایک اصول موضوعہ کے ہمارے ہاں حضرت جلالت مآب کی بارگاہ سے مسلم ہو چکا ہے اور اس کی پیش رفت میں علاوہ مقننہ میں توسیع۔ ضلع کانفرنسوں کی ترویج کے مجالس اضلاع۔ مجلس بلدی۔ مجالس قصبات اور پنچایتوں کی نئے قالب میں تشکل ہو رہی ہے۔ لیکن اس منشا کی تکمیل کا طریقہ یہہ نہیں ہو سکتا تھا کہ نظم و نسق سے مفادات کو مربوط کرنے کی جگہ نظم و نسق ہی ان کے سپرد کر دیا جائے اور امور مملکت وغیرہ کی انجام دہی کی توقع ایسے نمایندوں سے یا ان کے موقتی اجتماعات سے کی جاتی کہ جن کو نہ تو اس کے لئے پورا وقت حاصل ہے اور نہ وہ اس کے لئے مطلوبہ فنی اور خصوصی تجربہ یا واقفیت رکھتے ہیں۔ بلدیات کی حد تک جہاں بھی ایسا تجربہ برطانوی ہند میں ہوا ہے۔ اس کے نتائج محض ناخوشگوار بلکہ افسوسناک رہے ترقی کی جگہ پس روی عمل میں آئی حتی کہ حکومتوں کو انسدادی تدابیر اختیار کرنی پڑیں کسی شہر کا انتظام جہاں لاکھوں افراد علحدہ علحدہ طبقات اور مفادات میں منقسم سکونت کرتے ہیں مجتمعاً شہریوں کے سپرد کیونکر کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک موضع اور ایک گھرانے میں بھی کوئی نہ کوئی فرد اپنی صلاحیت بزرگی اور مرتبے کے لحاظ سے انتظامات کا بطور خاص ذمہ دار رہتا ہے

اگرچہ کہ سب اہل خانہ کی رائے لیجاتی ہے اور ان کے مشوروں پر عمل ہوتا ہے ہمارے ہاں کی
مقامی مجالس اضلاع کی صدارت اعلیٰ عہدہ دار مال کو بطور پالیسی سپرد کی جاتی رہی ہے اور
یہی امر آیندہ بھی قایم رکھا گیا ہے۔ مجالس کی صدارت مجلس کے اختیارات و فرایض کی عملی
طور پر انجام دہی کے سوا مجلس میں امور تصفیہ طلب پیش کرنے اور مجلس کے تصفیے کتاب روداد
میں قلمبند کرنے کی ذمہ داری اسی سے متعلق رکھی گئی ہے بہہ امر بہ آسانی قیاس کیا جاسکتا ہے
کہ کسی مستقر ضلع میں وہاں کے اعلیٰ عہدہ دار مال کو ایسی ذاتی حیثیت اور وجاہت حاصل
رہتی ہے کہ اس کی وجہہ رعایا میں بھی وہ خاص اثر کا حامل رہتا ہے اور اس لیے مجلس بلدیہ
یا مجلس ضلع کی صدارت کرتے ہوئے اسے ارکین کے سامنے امور تصفیہ طلب اور تحریکات
کو پیش کرتے ہوے توضیح و تفہیم نیز ایوان کا رجحان معلوم کرنے میں بڑی سہولت رہتی ہے
ایک ایسی مجلس میں جہاں کا صدر کوئی اور ہو اور معتمد کوئی اور۔ ایک غیر رکن خواہ وہ ناظم الملۃ
کے لقب سے موسوم کیوں نہ ہو اور قانوناً شریک اقتدار کیوں نہ رہے اپنی طرف ایوان
کی توجہات مبذول کرنے اور ہم قبول حاصل کرنے میں لقیناً دقت اور دشواری کا سامنا
کرتا ہے۔ ہماری جدید مقامی مجالس کے حسابات کی تنقیح حکومت نے اپنے سے متعلق رکھی ہے۔
مجالس کی تحلیل انفرادی ارکین کو الگ کر دینے قرار دادوں کو کالعدم کرنے مرافعوں کی سماعت
کرنیکے اختیارات بھی محفوظ رکھے گئے ہیں۔ تقررات کی حد تک جہاں بضمن منظوری مواز نہ نیز
اور اوقات میں ان کو بلدی عملے پر اعتراض کرنے کا حق حاصل ہے وہاں ان کو اعلیٰ افسر عملہ
کے خلاف سفارش کسی ماتحت کے لئے نہ تو کسی قسم کی مزمت کا موقع ہے اور نہ وہ جدید
خدمات کے قیام یا تقررات سے متعلق تصفیے کے جھیلوں میں شریک ہیں آمدنی کا ۱۲ فی صدی
حصہ سرکار میں جمع ہو کر تعمیرات صفائی۔ حفظ صحت اور محاسبی کے صیغہ جات کے ذمہ دار کارکنو
کی مملکتی مقامی سرویس قائم ہے اس سروس میں تقرر تبدل تعیناتی کو سرکار نے اپنے اختیار میں
رکھا ہے البتہ میر مجلس کی رائے پر اس کا تبادلہ اور اس کے خلاف انتظامی کارروائی بھی ہو سکتی ہے

یہہ سب اس کا ضامن ہے کہ بلدی عہدہ دار و ملازمین اپنی توقعات و ترقیات کے لیے ارکین بلدیہ کے دست نگر ہو کر اپنی کارکردگی اپنی دیانت کو متاثر نہ کر دیں نیز بلدی نظم و نسق بہتر با ہم آہنگی کے ساتھ پورا ہو۔ یہہ امر کہ ہمارے بلدی قوانین کا یہہ مرحلہ ارتقاء ایک برطانوی عہدہ دار کا مجوزہ ہے کہ جسے برطانوی ہند کا کافی وسیع تجربہ حاصل تھا ایک اشارہ ہے کہ ہمارے ہاں خدا ماصفا پر عمل ہوا ہے۔ اس مضمون کو مسٹر گرگسن صدارالمہام مال و حکومت مقامی کے چند فقرات پر ختم کیا جاتا ہے۔ موصوف نے اصلاح ملک سرکارعالی کی جدید مجالس مقامی کے آئین بحیثیت اسپشل افسر مرتب کئے تھے۔ اس لیے ان کے یہہ فقرات خاص معنی اور اہمیت کے حامل ہیں :۔

"تاریخ حیدرآباد میں گزشتہ پندرہ سال تعمیر و تخلیق کے رہے ہیں اور حکومت مقامی کے ادارات سے بڑھ کر اس کا مظاہرہ دیگر شعبہ ہائے حیات میں کم ہوتا ہے۔ مجالس ضلع، میونسپل اور ٹاون کمیٹیاں اگرچہ اب بھی سرکاری میر مجلس اور سرکاری رہنمائی و امداد سے کام کرتی ہیں لیکن ان میں غیر سرکاری اکثریت ہونے لگی ہے۔ اصلاحات کے تحت قائم شدہ مجالس کو اکثر کثیر رقم بجٹ میں ملی ہے۔ اس سے چاہیں تو سابق کے برخلاف اب اقتدار اور موقع ہے کہ شہروں، قصبوں اور دیہات میں ترقیات کا کثیر کام انجام دیا جاوے۔

چونکہ خوش قسمتی سے حیدرآباد میں حکومت مقامی کے کام کے سلسلے میں حکومت اور بلدیات میں کوئی افتراق نہیں ہے (جو برطانوی ہند میں ہے اور غالباً وہاں کے بہت سے ادارات حکومت مقامی کی ناکامی کا باعث بنا ہے) اس لیے سرکاری صدرنشین اور سرکاری نامزدہ ارکان اب حیدرآباد کے جدید ادارات مقامی میں اس کی حوصلہ افزائی کر سکیں گے کہ ایسی منصوبہ بندی میں پہل دکھائیں۔ اب یہہ ان کا کام ہے (خاص کر ٹاون پلاننگ دفتر کا جو ملک کے جدید نظام حکومت مقامی کا جزء ہے) کہ غیر سرکاری اکثریت کو دیہات شہروں اور ضلعوں کی منصوبہ بندی کی قدر و قیمت سے واقف کرائیں۔ ایک چیز یقینی ہے۔ ایسی منصوبہ بندی

کامیاب ہو تو اس کی طلب بڑھے گی اور ممالک محروسہ میں جہاں کہیں گندہ حصّوں کی صفائی اور دیگر ترقیات سے لوگوں کی خوشحالی میں اضافہ ہوا ہے تو اس منصوبہ بندی کے فوائد کو تسلیم کرنے میں لوگوں نے کبھی سستی نہیں دکھائی ہے۔"

ہندوستان سے آئے ہوئے کسی متعلم نظم و نسق کو ملک سرکار عالی کے چند امور فوراً اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں مثلاً یہہ کہ یہاں ذریعہ تعلیم اردو زبان مقرر ہے نیز کاروبار سرکاری بھی اردو زبان میں طے ہوتا ہے۔ یا یہہ کہ یہاں عدلیہ اور عاملہ الگ الگ حکام کے سپرد ہے یا یہہ کہ یہاں سررشتہ ریلوے کو ہی سڑکوں پر بھی حمل و نقل اور مسافروں کو لانے لیجانے کا انتظام سپرد ہے۔ یہہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ہمارے ہاں کے مقامی حکومت کا طریق بھی اس قسم کی اہمیت کا حامل ہوتا جارہا ہے اور وہ دن دور نہیں کہ جب اسے بھی بطور مثال ہندوستان میں نمایاں کیا جانے لگے۔

ہندو قانون کی ماہیت

شیخ حمید بی۔اے۔ ال ال ایم (عثمانیہ) معتمد مقامی کل ہند کانفرنس قانون

ہندو قانون کی ماہیت کے متعلق تین تصورات پائے جاتے ہیں :۔

(۱) ہندو قانون مذہبی اور مقدس قانون ہے۔ جو خدا کی جانب سے انسانوں کی رہبری کے لیے نازل کیا گیا ہے۔

۲۔ ہندو قانون اقتدار اعلیٰ کا حکم ہے۔

۳۔ ہندو قانون ایک ارتقاء ہے۔

کیا ہندو قانون مذہبی اور مقدس قانون ہے ؟

ہندو مقننین کا یہ خیال ہے کہ ہندو قانون اپنی ماہیت میں، مذہبی اور مقدس قانون ہے جس کو برہما نے مقدس رشیوں پر نازل کیا۔ اس مکتب خیال کے علمبردار اپنی تائید میں برہمناس اور منو سمرتی سے حسب ذیل اقتباسات پیش کرتے ہیں :۔

برہما نے چار جاتیوں کو پیدا کر کے اپنا کام ختم نہیں کیا بلکہ اس (برہما) نے حکمران جماعت کی ہدایت و رہبری کے لیے ایک مجموعہ قانون مدون کیا

" قانون حکمرانوں کا حکمران ہے۔ قانون حکمران سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ قانون سے بڑھ کر کوئی صاحب اقتدار نہیں "۔

برہما نے قوانین کو مدون کیا ابتداءً مجھے (یعنی منوجی کو) یہہ قوانین سکھائے گئے۔ میں (منوجی) نے (MARICA) اور دیگر ۹ رشیوں کو یہہ مقدس قانون سکھایا۔"

کیا ہندو قانون اقتدار اعلیٰ کا حکم ہے؟

آسٹن کے "نظریہ تحکمی" کا اعلان ہندو قانون پر نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ ہندو حکمران کو قانون سازی کا حق حاصل نہیں تھا۔ برہما قانون ساز ہے۔ راجہ کا فریضہ عدل گستری اور قیام امن مجرمین کو سزا دینا اور دشمنوں کے خلاف جنگ کرنا ہے۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے منوسمرتی باب۔ راجہ کے فرائض)۔ اسی وجہ سے حکمران کو "چھتری" اور "راجن" کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان اصطلاحات سے راجہ کے فرائض کی توضیح ہوتی ہے۔

ہندو قانون میں (King can do no wrong) کا تصور نہیں پایا جاتا۔ معمولی رعایا اور مطلق العنان حکمراں سب ان مقدس قوانین کے تابع فرمان ہوتے ہیں۔ راجہ بھی اپنی غلطیوں کی بنا پر اسی طرح سزا کا مستوجب ہوتا ہے، جس طرح کہ معمولی رعایا۔

ہندو قانون اپنی ماہیت میں کبھی اقتدار اعلیٰ کا حکم نہیں رہا ہے چنانچہ سرہنری مین کے الفاظ ہیں:

"ہندو قانون کبھی اقتدار اعلیٰ کا حکم نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ جیسے مطلق العنان حکمراں تک جو ذراسی خلاف ورزی پر سر قلم کرنے سے دریغ نہ کرتا تھا کبھی آسٹن کے مفہوم میں احکام جاری یا قوانین نافذ نہیں کئے۔"

البتہ برطانوی دور حکومت میں ہندو قانون کی ماہیت میں فرق پیدا ہوا۔ گرو داس بنرجی کے الفاظ میں "تحکمی نظریہ کا اطلاق ہندو قانون پر برطانوی حکومت کے قیام کے بعد سے ہونے لگا ہے۔ چنانچہ ہندو قانون صرف خاص خاص صورتوں میں شہنشاہ ہند کے خصوصی احکام کی بناء پر ہندوؤں سے متعلق کیا جاتا ہے اور دیگر تمام معاملات میں مقننہ کے مدونہ قوانین نافذ اور رائج ہیں۔ ناردہ سمرتی اور کوٹلیا کی" ارتھ شاستر" میں راجہ کے احکام و فرامین کو قابل پابندی قرار دیا گیا ہے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقننین " نظریہ تحکمی " کے قائل تھے لیکن جیسوال نے یہہ توضیح کی ہے کہ نارد ہ اور کوٹلیا کی پیش کردہ رائے دراصل اُس زمانہ کے حالات کی آئینہ دار ہے جس میں کہ وہ رہتے اور بستے تھے۔ شاہی اختیارات میں گوناگوں اضافہ ہوچکا تھا۔ اور عملاً شاہی فرامین کو فوقیت حاصل ہوگئی تھی چونکہ ان فقہا نے صرف اپنے زمانہ کے حالات کو پیش کیا ہے، لہٰذا نارد ہ اور کوٹلیا کے تصورات کی روشنی میں ہندو قانون کی ماہیت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

واقعہ یہہ ہے کہ ہندو قانون کے دو مکاتب پائے جاتے ہیں :۔

۱ - مکتب دھرم

۲ - مکتب ارتھ

دھرم اسکول کے متبعین قوانین کو مقدس اور ناقابل تبدیل بیان کرتے ہیں۔ اس خصوص میں منو، یاگنولک، گوتم اور بودھائن کا نام لیا جاتا ہے۔

کوٹلیا، بھردواجا، اسوناس (USUNAS) وغیرہ ارتھ اسکول کے علمبردار ہیں یہہ شاہی احکام کو فوقیت دیتے ہیں۔ مترجم کا خیال ہے کہ ان کے پیش نظر معاشری نظم و افادیت تھے۔

ہندو قانون کی تہدید (sanction) کا مطالعہ کریں تو ہندو قانون کی ماہیت کی پوری توضیح ہوتی ہے۔

ہندو قانون کی تہدید

بنتھم، آسٹن اور ہالینڈ کا خیال ہے کہ "قانون کی تہدید، اقتدار اعلیٰ کی قوت جبر اور خوف سزا" ہے۔ ہندو قانون پر اس تصور کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ مقدس رشیوں نے "اپوروا" (APURVA) کا تصور پیش کیا ہے۔ کولبروک نے اس کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے:۔

یہہ ایک ایسی قوت ہے جس کا اثر غیر ظاہر طور پر فعل کی نوعیت کے لحاظ سے اس دنیا یا دوسرے جنم میں جزاء یا سزا کی صورت میں ظاہر ہوگا

کسی فعل کے ختم ہونے کے بعد اس کا اثر باقی رہتا ہے۔ اور اس فعل کی حیثیت کے بموجب (اس جنم میں یا دوسرے جنم میں) جزا یا سزا ملے گی۔"
اسی کو" اپورداکا نظریۂ تہدید" کہا جاتا ہے۔

نظریہ تہدید کے مطالعہ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ ہندو قانون اپنی ماہیت میں اقتدار اعلیٰ کا حکم نہیں ہے بلکہ مذہبی اور مقدس قانون ہے۔ چنانچہ قانون کی تہدید کے سلسلہ میں بھی عذاب اور ثواب کے تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ یہہ صورت حال صرف ہندو قانون ہی میں نہیں پائی جاتی بلکہ تمام مذہبی نظام ہائے قوانین میں اس کا پتہ چلتا ہے۔

ہندو قانون ایک ارتقاء ہے

ہندو قانون کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اس ادعا کی تائید ہوتی ہے کہ ہندو قانون ایک ارتقاء ہے جو زمانہ کے ترقی پذیر حالات کے بموجب بدلتا اور ترقی کرتا رہا ہے۔ اس کی ترقی مقدس رشیوں کی مرہون منت ہے۔

مقدس ویدوں کے متعلق یہہ عقیدہ ہے کہ وہ سب سے قدیم اور اہم ترین مجموعہ ہائے قانون ہیں جو سمرتی ویدوں کے احکام کے خلاف ہو وہ قابل پابندی نہیں۔ لیکن اگر ہم اس امر کا مطالعہ کریں کہ مقدس ویدوں میں کیا قانون پایا جاتا ہے تو نتیجہ کچھ امید افزا نہیں معلوم ہوتا چنانچہ گلاب چند رسرکار ساستری کا خیال ہے کہ (ویدوں میں معنوں کا کوئی قانون نہیں ہے) اس کے برعکس سمرتیاں اہم ترین مجموعہ ہائے قانون ہیں۔ اس خصوص میں جیسوال کی" منو اور یاگنولک" کا مطالعہ مفید ہوگا جس میں مختلف قانونی ادارات کا متقابلہ مطالعہ کیا گیا ہے اور اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح مختلف قانونی ادارات رفتہ رفتہ ترقی کرتے رہے ہیں اور ضروریات زمانہ کے بموجب قانون مدون کیا جاتا رہا ہے۔

نظام قانون اس ارتقاء میں" شسٹاچارا اور تعبیر قانون" کو بہت اہمیت حاصل ہے چنانچہ استری دھن کا مطالعہ ہمارے اغراض کے لیے کافی ہے۔ رگ وید کے ایک قصہ میں یہہ درج ہے کہ "ماں کی وفات کے بعد متوفی کے زیورات بیٹی پاتی ہے"۔ کہا جاتا ہے کہ یہی حکم دراصل

نظام استری دھن کا ایک بنیادی قانون ہے۔

سمرتیوں میں سب سے اہم منو سمرتی ہے اس کی اہمیت کے متعلق یہہ کہا جاتا ہے کہ "منو سمرتی ویدوں کے صحیح احکام پر مبنی ہے جو حکم منو سمرتی کے خلاف ہو وہ قابل عمل نہیں"۔ منو سمرتی میں استری دھن جائداد کی ۶ قسمیں گنائی گئی ہیں۔ یاگنولک سمرتی میں بھی منو سمرتی کی بیان کردہ اقسام کو گنا دیا گیا ہے اور ایک اصطلاح (Adyen) یعنی "وغیرہ" زاید بھی رکھ دی ہے اس طرح رفتہ رفتہ استری دھن جائداد کے اقسام میں اضافہ عمل میں آتا رہا۔ یاگنولک سمرتی کے شارح وگیانیشور نے اپنی مسلم الثبوت شرح "متاکشرا" میں اصطلاح استری دھن کی حسب ذیل توضیح کی ہے:۔

استری دھن کی جو شش گانہ نوعیت منوجی نے بیان کی ہے وہ اس بات سے تو روکتی ہے کہ اس کم تعداد لی جائے لیکن اس بات کو خارج نہیں کرتی کہ اس سے زیادہ تعداد لی جائے۔ اس تعبیر و توضیح کا نتیجہ یہہ ہے کہ ہر وہ جائداد جو عورت کے قبض و تصرف میں ہو استری دھن شمار کی جا سکتی ہے اس ایک مثال سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو قانون کی ارتقائی ترقی میں مقدس رشیوں کی تعبیر و توضیح کو کس قدر نمایاں اہمیت حاصل رہی ہے۔

ہندو قانون کی ارتقائی ترقی کے سلسلہ میں قدیم رواجات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر ہنری سمنر مین کا خیال ہے کہ "رواجات قانون کو معاشرہ کے تبدیل پذیر حالات کے مطابق بناتے ہیں"۔ "ہندو قانون" کی بھی یہی صورت حال ہے۔ ہندو معاشرہ میں رفتار زمانہ کے بموجب جوں جوں تبدیلی ہوتی گئی رواج اور قدیم عمل درآمد قانون اور معاشرہ میں یکسانیت اور مطابقت پیدا کرتے رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے قدیم احکام بے عمل ہو گئے اور انکی جگہ جدید رواجات مسلم ہو گئے۔

قدیم رواجات کے قابل پابندی ہونے کے متعلق بھی ایک دلچسپ دلیل گرودھا مرجی نے پیش کی ہے:۔

تمام قدیم رواجات یقیناً وید کے ایسے احکام پر مبنی ہیں جو امتداد زمانہ کی بناء پر

گم یا تلف ہوگئے یا انسانی حافظہ کی کمزوری کی بنا پر یاد سے باہر ہوگئے ہیں"۔

غرض ہندو قانون میں رواج کو بہت اہمیت حاصل ہے چنانچہ منوسمرتی میں بھی یہہ نص پایا جاتا ہے کہ قدیم رواج سب سے بہتر قانون ہے۔ مختصراً یہہ کہا جاسکتا ہے کہ رواج کو ہندو قانون کی ارتقائی ترقی سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اور یہہ سلسلہ برابر جاری ہے اور نظام قانون میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس خصوص میں پنجاب کے رواجات کو کسی طرح بھلایا نہیں جاسکتا جن کی بنا پر ہندو قانون میں بعض دلچسپ ابواب کا اضافہ ہوا ہے۔

قانون کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔ قوانین بھی امتداد زمانہ کے بموجب فرسودہ اور بے عمل ہو جاتے ہیں۔ ہندو قانون میں "شسٹا چارا" کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً مناسب تبدیلی کی جاتی رہی اور ہندو نظام قانون بہت زیادہ لچکدار بنیادوں پر قائم رہا۔ لیکن موجودہ نظام عدل گستری میں رواجات کے جواز پر بہت سی پابندیاں عائد کی گئی ہیں جو نظام قانون کی ارتقائی ترقی میں سدراہ ثابت ہو رہی ہیں۔

پراسرا سمرتی کے حسب ذیل نص سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ہندو قانون ایک ارتقا ہے:۔

"منوسمرتی میں ستیا یوگ سے متعلق قانون پایا جاتا ہے۔ گوتم ترتیا یوگ میں مسلم ہے۔ دواپر یوگ کا قانون سنکھا اور لکھتا میں درج ہے۔ پراسرا سمرتی میں کلی یوگ سے متعلق قانون بیان کیا گیا ہے"۔

پراسرا کے مندرجہ بالا متن کی توضیح ایک شارح نے یہہ کی ہے کہ منوسمرتی میں اس قدر مکمل قانون درج نہیں جو کلی یوگ کی ضروریات کے لیے کافی ہوسکے نتیجۃً ہر دور کی ضروریات کے لحاظ سے جدا جدا مجموعہ ہائے قوانین مدون کئے گئے ہیں۔

مختصراً یہہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندو قانون ایک ارتقا ہے۔ اس کی تدوین مختلف ادوار میں مختلف رشیوں کی جانب سے ہوتی رہی ہے، جو نظام قانون کی تعبیر و توضیح کے سلسلہ میں ترقی پسند اصولوں اور معاشری افادیت کے تصورات کو ملحوظ رکھتے تھے۔ ہندو قانون

کی ترقی کا یہہ سلسلہ برطانوی حکومت کے قیام تک برابر جاری رہا۔ اب نظام قانون غیر تبدیل پذیر اور استوار ہو گیا ہے۔ قانون کی تعبیر و توضیح کے سلسلہ میں سب سے پہلا معیار جو آجکل عموماً پیش کیا جاتا ہے وہ معاشری افادیت سے کہیں زیادہ مذہبی عقاید پر مبنی نظر آتا ہے۔

رسم ورواج اور قانون

(از مولوی محمود عبدالقدیر۔ سشن جج علاقہ سالارجنگ)

یہ عنوان دو اجزا رواج اور قانون پر مشتمل ہے۔ چونکہ قانون کی تدوین میں رسم و رواج کو مسلمہ طور پر اولیت حاصل ہے؛ اس لیے رسم و رواج کا تاریخی تجزیہ مختصراً مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فہم عام میں رسم و رواج کسی معاشرے یا سوسائٹی کے اس طریقہ کار کو کہا جاتا ہے جس سے انفرادیت کا رشتہ حیات اجتماعیت سے منسلک کیا جائے۔ رسم و رواج اپنے اندر علٰحدہ علٰحدہ بالتخصیص ادراکی مضمرات رکھتے ہیں۔ گو عرفیت عام میں بالتعمیم رسم و رواج کو معاشرے یا سوسائٹی کا طرز تمدن سمجھا جاتا ہے۔ رسم و رواج کے تمدنی تفہمات کے لیے اُن ممالک کی اجتماعیت پر تفکر و تفحص کی ضرورت ہے، جو فی زمانہ منظر عام پر موجود ہیں۔ اس لیے دنیائے مدنیت میں ہم کو بآسانی تمدن ہند اور تمدن عرب سے امداد مل سکتی ہے جن میں رسم و رواج کے انقیادات کا مطمح نظر مختلف بھی ہے۔

رسم و رواج کو اصطلاح شاستری میں "ست آچار" یا "سدا آچار" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "سدا اچار" لفظی معنوں میں "ہمیشہ عمل" یا "عمل ہمیشگی" اور "ست آچار" "نیک عمل" کو کہتے ہیں۔ اس لیے رسم و رواج کو مترادف الفاظ میں "سدا آچار" ہی بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ منو یاگنہ ولک نے تشریح کی ہے۔ "سدا آچار" منفرد معنی ہے۔ رسم و رواج مختلف الاسم ہیں۔

جس کے لئے رسم کے ساتھ رواج کا ربط "اور" کے عطف سے کیا گیا ہے۔ اور فی زمانہ مروجہ کتب ہائے شاستری میں رسم و رواج کا لفظ ہی استعمال کیا گیا ہے جو محتاج تحقیق و تجسس ہے۔

رسم و رواج کا اثر جماعت یا سوسائٹی پر محیط ہوتا ہے۔ اور سوسائٹی یا جماعت انفرادیت کا اجتماع ہے جو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

رسم وہ طریقہ ہے جو مدنیت میں رائج رہے۔ چنانچہ رسم و رواج کی تاریخ کو ابتدائے مدنیت کے بعد موجودہ طریقہ تمدن سے تمیز کیا جائے تو آج بھی ایسے ان گنت رسم و رواج صفحات تاریخ پر محفوظ ہیں جن کو ارتقائے تمدن کی ہر منزل پر ناقابل عمل قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ہم رسم و رواج کی پابندی کے لیے اس کی قدامت اور تسلسل کے ساتھ ساتھ پسندیدگی کی شرط لازم پاتے ہیں۔ اسی طرح رسم و رواج، ہر سوسائٹی یا جماعت کے ذہنی شعور کی اس پیداوار کو کہا جائے گا جس پر عمل رہا ہو۔ رسم و رواج کے لیے عمل کا ہونا لابدی ہے۔ اور عمل انفرادی تخیل یا اقدام سے جاری نہیں ہو سکتا۔ تاوقتیکہ اس سوسائٹی یا جماعت میں قبولیت عامہ حاصل نہ کرے جس کے ماحول میں اس کا دخل مقصود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیات میں بھی بدرجہ آخر بہ ضمن تبویب فقہ اجماع امت سے ایسے رسم و رواج کو متعلق کیا جا سکتا ہے جو کتاب اللہ اور سنۃ الرسول کے منافی نہ ہوں۔ چنانچہ ابن نجیم نے شرع شریف کا احصاء (۹۹) بنیادی اصولوں میں کیا ہے۔ جن میں سے ایک رواج بھی ماخذ قانون قرار دیا گیا ہے یعنی استعمال الناس حجۃ یجب العمل بہا۔ رسم و رواج کی یہہ تحدید شاستر میں بھی پائی جاتی ہے۔ جہاں دگنانیشور اور کلوک بھٹ رسم و رواج کے لیے یہہ شرط لازماً عائد کرتے ہیں کہ وید اور سمرتی کے خلاف نہ ہو۔ مگر مقول رسم و رواج کے لئے مشہور ویدانتی نارو جی نے رواج کو مذہبی قوانین پر تفوق دیا ہے۔ جس کی تائید برہسپتی نے بھی کی ہے۔ لیکن علمائے میمان جنھیں میمانسک بھی کہتے ہیں وہ رسم رواج کو مذہب کے ہمہ گیر مسائل کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

رسم و رواج کا نشوو ابتدا آج دنیا میں اس وقت سے پایا جاتا ہے جبکہ انفرادیت نے آدمی

کے لیے انسانیت کا احساس پیدا کیا اور یہی احساسِ انسانیت مدنیت کی بنیاد ہے اور ارتباط باہمی وانس جنسی ورشتہ تعلقات اسی شجرۂ مدنیت کے شاخیں ہیں جس کی ابتدا اس حرکت سے ہوئی جس کو خانہ بدوشی وصحرا نوردی کہا جاتا ہے جس نے رفتہ رفتہ ودرجہ بدرجہ ملکیت کے تصورات کے ساتھ ربع مسکون کے داغ بیل کا خط کھینچا۔ جس میں افراد کا وجود سوسائٹی پر منتج ہوا جس کے باہمی میل جول رفتار گفتار میں نظم وضبط کے لئے رسم پیدا ہوا اور عمل سے رواج پایا۔ اور یہی رسم و رواج کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کو عملاً سماج کے رسم و رواج کا ساتھ دینا پڑتا ہے جس کا تصور اس لیے اضافی ہے کہ نفس قانون سوسائٹی کا منتہی نصب العین قرار دیا گیا ہے۔ جو صرف سماج کی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قانون کو ادراک مشاہدات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جس کی توضیح کے لئے واقعات اور سوسائٹی کے جغرافی اثر کا خمیر لازمی ہے۔

مشہور مقننین نے نفس قانون کی مختلف تعریفات کی ہیں۔ کوئی اس کو خالص عقل کی پیداوار بتاتا ہے۔ کسی کے نزدیک قانون، قانون قدرت ہی کا نام ہے۔ کہیں قانون کو اقتدار اعلیٰ کی مرضی یا اس کے مظہر ہونے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور بعض تو قانون کو حالات کی مجرد پیداوار سمجھ کر حصول مقصد کا ایک ذریعہ بیان کرتے ہیں۔ مگر بعض مرتبہ اس سے مزیل مقصد کے نتائج بھی مشاہدہ ہوتے ہیں۔ فی زمانہ یہہ سوال کہ "قانون کیا ہے"۔ بڑی پیچیدہ صورتِ حال کا منظر پیش کرتا ہے۔ اس کے لیے دو ذہنیتیں کار فرما ہیں۔ ایک مادی۔ دوسری تصوراتی بظاہر بین اہل منقول کے نزدیک یہہ دونوں باہم مختلف ہیں لیکن قانون داں معقولیین اس کو ایک ہی تصویر کے دو رخ سمجھتے ہیں جو عمل اور ردعمل پر مشتمل ہے۔

تصوری ذہنیت پر اضافیت کا روغن وغازہ پایا جاتا ہے۔ جو قانون قدرت سے الگ ہے۔ جس میں امتیاز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ طریقہ ہائے مطالعۂ قانون سے واقفیت نہ ہو۔ مطالعۂ قانون کے جو مختلف طریقے متعین ہوئے ہیں اُن میں تاریخی اور تقابلی طریقو

کو بڑی اہمیت ہے۔ جس میں قانون کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لیے تحلیلی طریقہ بھی لازمی ہے۔ قانون حاضرہ میں تبادلہ طریقہ قانون کا جدید ترین رجحان ہے جس سے مختلف نظام ہائے قوانین تک رسائی ہو سکتی ہے۔

یہہ امر بھی مسلمہ ہے کہ قانون ہر شعبہ زندگی پر حاوی نہیں ہے۔ اس کے لیے معاشرہ کے چند اہم شعبے چن لیے گئے۔ بعض افعال و اعمال کو منتخب کیا گیا جو براہ راست سوسائٹی پر اثر انداز ہو سکتے تھے۔ اگر ایک قانون پرست شخص اپنی روزمرہ حرکات کو بلا استثنا روزنامچہ کی شکل میں درج کرتا جائے اور پھر اُن پر غور کرے کہ اس کی ایک دن کی مصروفیات کے منجملہ کن کن افعال پر قانون سازی ہوئی ہے تو یہہ واضح ہو گا کہ اکثر اندراجات روزنامچہ سے قانون ساکت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر فعل اور ترک فعل پر اسی وقت مکمل قانون سازی ممکن تھی جب تنوع فطرت انسانی کا خاصہ نہ ہوتا یا سارے انسان مشین کے پُرزوں کے طرح زندگی گذارنے پر مجبور ہوتے۔ شادی، بیاہ، تبنیت اور وراثت، جیسے اہم امور میں آج بھی قانون سے زیادہ رسم و رواج کو اہمیت دی جاتی ہے اور قانون میں استثنائی دفعات کا اضافہ کم و بیش ہر ملک کے قوانین میں موجود ہے۔

کمسنی کے بیاہ اور مے نوشی کے مُضر صحت نتائج سے کونسا ذی شعور ضمیر بے چین نہیں ہے اس کی الم انگیزیاں الم نشرح ہونے کے باوجود قانون کا اثر و نفوذ بنتیجۂ شعور عامہ کی کم مائگی نے زائل کر دیا۔ اور یہہ اس امر کی بین دلیل ہے کہ معاشرہ اس تغیر کے ادراک محاسن سے محروم اور رسم دیرینہ کے رواج پر مُصر ہے جس میں اس وقت تک رد و بدل ممکن نہیں جب تک کہ سوسائٹی میں ارتقائے ذہنی کا انقلاب نہ ہو۔ قانون کی بنیاد رسم و رواج کی اساس پر ہے جس کی بناء قانون رومائے قانون دوازدہ الواح پر مستحکم ہوئی ہے جو اس سوسائٹی کے مروجہ مراسم کا مجموعہ تھا۔

عرب مُجادلہ اور عرب معاربہ کے جنگجو و متوحش دور میں بھی رسم و رواج ہی کا پرچم

لہلہاتا نظر آتا ہے جس میں سہیم حیات کا رشتہ شغار کی رسم سے جوڑ لیا جاتا اور زمانۂ قتال وجدال میں بھی محاربین رسماً بعض خاص ایام میں پر امن قاعدین ہو جاتے تھے ۔

موجودہ نظام ہائے قوانین نافذہ کو متقابلہ طریقے سے دیکھا جائے تو اس وقت رُبع سکون میں انہیں نظام ہائے قانون کی دُہائی ہے جن میں اس ملک کے معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل کی گئی ہے اور جو اس سوسائٹی کا منتہی نصب العین ہے ۔ یہہ ظاہر ہے کہ اس نصب العین کا دارومدار معاشرہ کے ذہنی ارتقاء پر ہوگا جو سوسائٹی کے رسم و رواج کے ساتھ مربوط ہے ۔ اسی بناء پر قانون کو ازلی و ابدی نہیں سمجھا جاتا ۔ جو قانون ماضی کے لئے ہو وہ حال کیلئے اور حال کا قانون مستقبل کے لئے کار آمد نہیں سمجھا جاتا ۔ اس طرح جب قانون سندِ دوام سے بربنائے ذہنی ارتقائے عوام محروم ہے تو یقیناً قانون رسم و رواج کے تابع اور مدنیت کا معرب قرار پاتا ہے ۔

نظام قانون میں فقہا کا مقام اور انکے فرائض و ذمہ داریاں

(از ڈاکٹر میر سیادت علیخاں)

یلوپلش ( ) نے کہا تھا کہ ہر شریف آدمی کو حق ہے کہ وہ الفاظ کے ہجے اپنی مرضی کے موافق اور اپنے طریقہ پر کرے اور اسی سے استفادہ کرتے ہوے راسکو پونڈ نے کہا ہے کہ ہر قانون داں کو اپنے اصطلاحات وضع کرنے کا حق ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امریکی قانونی کتابوں میں نئے نئے اصطلاحات کی وہ بھرمار ہے کہ خدا کی پناہ۔ میں اس بدعت میں صرف اس حد تک شریک ہوں گا کہ فقہا کے معنوں میں نہ صرف واضعانِ قانون، جج، جورسٹ۔ بلکہ قانون پیشہ وکلا کو بھی شریک کروں گا۔ عصر حاضر کے فقہا کی ذمہ داریوں کا سرسری خاکہ کھینچتے ہوئے میں لارڈ اچکینٹن نے (جن کی عشق و رومان کی زندگی ایک فضول طرح حسین بیوی کی وجہ سے بارونق ہوگئی تھی) اس قول کو پیش نظر رکھوں گا کہ فقہا کے مطالعہ کی اصل چیز انسانوں کے زندہ خیالات ہوتے ہیں نہ کہ مردہ قوانین یا مُردہ کتب۔ اور اسی لئے جہاں میں قانون معاہدہ اور جائداد کی چند اہم دشواریوں کو اس ممتاز جماعت کے غور و فکر کے لیے پیش کروں گا، وہاں میں ماضی میں فقہا کے مقام اور کام کو بہت ہی اختصار سے بیان کرتے ہوئے ان کے غور و فکر کی ایک آدھ مثال بھی دوں گا اور یہہ مختصر مضمون ختم ان خیالات پر کروں گا جو آجکل کم و بیش ہر فکر کرنے والے انسان کو ستا رہے ہیں اور سماج کی بھلائی و اصلاح پر منتج ہوتے ہیں تو عدالگستری

کے نظام کو آسان اور انسانی ضروریات کے مطابق کرنے بھی۔

معاہدہ - قانونی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ابتدا میں قانون کو اقرارات یا خلاف ورزی اقرارات سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چنانچہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ہیوڈامس ( ) نے کہا تھا کہ قابل نالش امور صرف تین ہوتے ہیں یعنی ضرر، توہین اور قتل انسان۔ ان تینوں امور میں زور حفظ امن پر تھا۔ لیکن بہت جلد جائداد سے متعلق نزاعات اور مذہبی کے اثرات کی وجہ سے اقرارات قابل پابندی سمجھے جانے لگے چنانچہ ؤسیتی نے کہا تھا کہ تو قرض لے کے نہ دے تو اگلے جنم میں غلام، نوکر، عورت یا چوپایہ کی شکل میں جنم لے گا۔ جائداد سے متعلق نزاعات اور مذہبی اثرات کی وجہ سے جب اقرارات کو قابل پابندی سمجھا جانے لگا۔ تو ابتدا اقرارات یا معاہدات دو قسم کے ہوتے تھے۔ ۱) وہ جن میں کوئی نہ کوئی ضابطہ ہوتا تھا اور ۲) وہ جن میں کوئی ضابطہ نہیں ہوتا تھا۔ صرف اوّل الذکر ہی ایسے معاہدات سمجھے جاتے تھے۔ جن کی پابندی کرانا ضروری تھا۔ موخر الذکر کو اقرار محض (nudum pactum) سمجھا جاتا اور ان کی پابندی نہیں کرائی جاتی تھی۔ کیونکہ ابتدائی تمدن میں ضابطہ کا بہت اثر تھا اور ضابطہ ہی سبب قانونی (causa civilis) سمجھا جاتا تھا۔ محض ارادہ کی بنا پر مجرد اقرارات کی تعمیل کی قانون کو فرصت تھی اور نہ وہ اس کو ضروری سمجھتا تھا۔ رفتہ رفتہ فقہا پر یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ قانون کا یہ اصول ہے کہ اقرارات کی پابندی کرانی چاہیے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے سے کوئی معاہدہ کرے تو اس کو یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ معاہدہ کی پابندی کی جائے گی۔ رومن فقہا تمام ان اقرارات کی پابندی کرانے لگے جن کے لیے کوئی سبب قانونی ہوتا تھا اور مقررہ ضابطہ کی پابندی ہی کو وہ سبب قانونی سمجھتے تھے۔ لیکن اقرارات کے تنوع اور تجارتی ضروریات کی روز افزونی نے رومن فقہا کو بہت جلد نامی معاہدات (nominal con.) کے دایرہ سے باہر اور بے نامی معاہدات ہی کو تسلیم کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ بلکہ ہر مجرد اقرار کو جو ارادی ہو قابل عمل سمجھنے پر بھی اسی کو اقرارات کا موضوعی نظریہ (Will Theory of Contract) کہا جانے لگا۔ رومن

فقہا جار کار میں بھی اضافہ اور توسیع کرنے پر مجبور ہوئے نہ صرف مالی ہرجانے عام طور پر دلانے لگے بلکہ تعمیل مخصوص بھی دینے (actia arbitraria) اور اس کی توسیع شدہ شکلوں کے ذریعہ سے لیکن اقرارات کے موضوعی نظریہ کے تحت ہر مجرد اقرار کو قابل تعمیل سمجھنے میں فقہا بہت جلد دشواریاں محسوس کرنے لگے اور وہ یہ سوچنے لگے کہ آخر وہ کونسے اصول ہیں جن کی بناء پر اقرارات کو قابل پابندی تصور کرنا چاہیے۔ سترہویں صدی میں قانون قدرت کو ایک ایسا اصول سمجھا گیا۔ انسان کو ایک اخلاقی ہستی ہونے سے اپنے اقرار کا پابند سمجھا گیا۔ لیکن یہ توجیہ بھی عملاً قابل تشفی نہیں پائی گئی ۱۸ ویں صدی میں اقرارات کے نظریہ عوض (Equivalent Theory) کو فروغ ہوا یعنی قرار دیا گیا کہ کچھ عوض دیا جائے تو اقرار قابل پابندی ہوگا ورنہ نہیں۔ حجت کی گئی کہ بغیر معاوضہ کے اقرار کرنا زود باز ہے اور قانون زود بازوں کی مدد نہیں کرتا۔ نیز بغیر معاوضہ کے اقرار کرنا دل سے اقرار کرنا نہیں ہوتا ہے۔ لہذا اس کی پابندی نہیں کرانی چاہیے۔ بالمعاوضہ کے اقرار کی پابندی اس لیے کرانی چاہیے کہ ورنہ متقرلہ کو مالی نقصان ہوتا ہے۔ اس نظریہ عوض کا انگریزی امریکی قانون پر بہت اثر ہوا۔ اور بعض اساتذہ اسی کو نظریہ بدل کی ابتدا سمجھتے ہیں۔

اس طرح پر انیسویں صدی تک اقرارات کی تعمیل کے متعلق یہ دو نظریے تھے یعنے موضوعی نظریہ اور عوضی نظریہ۔ ان کے تحت اقرارات کی تعمیل ارادی ہونے یا عوض دیئے جانے کی وجہ سے کرائی جاتی تھی۔ انیسویں صدی میں کانٹ نے بہت سے فلسفیانہ مباحث کے بعد یہ دکھلایا کہ اقرارات کی پابندی محض اقرار ہونے کی وجہ سے کرانا ممکن نہیں ہے۔ بلکہ پابندی اس لیے کرانی چاہیے کہ انسان کو جو مفاد بہ حیثیت شخص ہونے کے حاصل ہوتے ہیں ان میں اقرار کرنے کی قابلیت بھی داخل ہوتی ہے۔ گویا اقرار انسان کے مفاد یا جائداد ہوتے ہیں اس طرح پر انیسویں صدی میں معاہدہ جائداد پر قایم کیا گیا۔ ہیگل کی توجیہ بھی کچھ کانٹ جیسی ہی تھی کہ اس نے بھی معاہدہ کو جائداد سمجھا۔ اور اقرار کو مفاد یا جائداد کا تصرف قرار دیا۔ غور کرنے سے ظاہر ہوگا کہ کانٹ ہیگل یا دیگر مابعدالطبیعاتی اساتذہ کی توجیہات میں اس سوال کا جواب نہیں ملتا کہ آخر وہ کونسے اصول ہیں

جن کے مطابق ہونے پر اقرارات قابل تعمیل قرار دے جا سکتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر کن اقرارات کو قابل پابندی قرار دینا چاہیئے اور کن کو نہیں اور کن اصولوں کے مطابق انیسویں صدی کے تاریخی اساتذہ نے قانونی تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر کی کہ انسان کی ترقی حیثیت سے معاہدہ کی طرف ہوئی ہے اور اقرارات کی آزادی انسان کا فطری اور تاریخی حق ہے۔ یہ اس کو حاصل ہونا اور زیادہ سے زیادہ اقرارات کی پابندی کرانی چاہیے۔ افادیت پسند اساتذہ کو بھی تاریخی اساتذہ سے اتفاق تھا۔ ان کے نزدیک بھی فرد کی آزادانہ مرضی کے زیادہ سے زیادہ اظہار ہی میں زیادہ سے زیادہ خوشی اور خوشحالی مضمر ہوتی ہے اسی لیے وہ بھی آزادی معاہدہ پر زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ انسان کو حتی الامکان آزادی ہونی چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے عمل کرے اور اسی لیے وہ اقرارات کے زیادہ سے زیادہ تعمیل کرائے جانے کے حامی تھے۔ سر جارج جسل ماسٹر آف رولس کے الفاظ میں قانون اور مصلحت عامہ کا اعظم اصول ہے کہ عاقل و بالغ و سمجھدار شخص کو آزادی معاہدہ ہونی چاہیے اور اس کے اقرارات کی تعمیل کرانی چاہیے۔ ہربرٹ اسپنسر کے ایجابی اساتذہ کا بھی یہی موقف تھا وہ بھی آزادی معاہدہ پر زور دیتے تھے۔ اور قرار دیا کہ یہ مقتضائے انصاف ہے کہ ہر شخص کو سودوں انتقالات و اقرارات کے قدرتی اختیارات کی آزادی ہونی چاہیے۔ سوائے اس صورت کے جب کہ وہ دوسرے اشخاص کے ایسے ہی قدرتی حقوق میں مداخلت ہو۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے ان سب اساتذہ کی توجیہات کے بعد بھی ان اصولوں کا تعین نہ ہو سکا جن کی مطابقت پر اقرارات قابل تعمیل یا جن کی عدم مطابقت پر اقرارات ناقابل تعمیل قرار دے جا سکتے ہیں۔ اور آج تک بھی انگریزی اور امریکی قانون میں مشکل ترین قوانین کے یہ امور تعین طلب اور عصر حاضر کے فقہا کے غور کے محتاج ہیں۔ میں ذیل میں مختصراً یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ متذکرہ صدر دو نظریے یعنی موضوعی نظریہ اور عوضی نظریہ وغیرہ وغیرہ اور نظریے یعنی کاروباری نظریہ اور رہبری نظریہ سے بھی موجودہ انسانی ضروریات اور موجودہ قانون کی توضیح نہیں ہوتی ہے۔ اور ابتک علم اصول قانون کوئی ایسا نظریہ نہیں بنا سکا ہے جس سے موجودہ قانون کی توضیح ہو اور

اقرارات کی تعمیل کا کوئی جامع اور مانع نظریہ ہاتھ آجائے۔

موضوعی نظریہ (will theory of cont) جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ رومی فقہا کا نظریہ ہے اور اس کا بہت کچھ رواج ہے۔ قانون روما اپنے عروج کے زمانہ میں اس نتیجہ تک پہنچا تھا کہ ہر بالعمد اقرار کی تعمیل کرانی چاہیے۔ اس موقف کے مضرات میں یہ امر داخل ہے کہ جن متعین امور کے متعلق تراضی طرفین حاصل ہوئی ہو تو ان کی تعمیل کرانی چاہیے لیکن بہت سے ممالک میں قانون تو یہ ہے کہ معاہدات کی تعمیل بلالحاظ تراضی طرفین کی جاتی ہے۔ مثلاً ان صورتوں کا خیال کیجئے جن میں ایک ایجاب کیا جاتا ہے۔ جن کو ایک معقول آدمی ایک معنی میں معقول طور پر سمجھتا اور اسی معنی میں قبول کرتا ہے لیکن ایجاب کنندہ کا مطلب جدا ہوتا ہے یا آپ ایجاب کو قبول کرکے ایک تار دفتر تار برقی کے حوالے کر دیتے ہیں وہاں غلطی سے دوسرے ہی مطلب کا یا آپ کے مطلب کو بگاڑ کے دوسرا ہی تار دیا جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں در اصل کوئی تراضی طرفین نہیں ہوتی ہے لیکن قانوناً معاہدہ ہو جاتا ہے۔ امریکہ میں ایسی صورتوں میں معاہدہ ہو جانے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ گو امریکہ میں انیسویں صدی میں ذمہ داری کے نظریہ کو بھی موضوعی کر دینے اور (No liablity with out fault) کے اصول کو قائم کرنے کی کوشش میں معاہدہ کے موضوعی نظریہ کو کچھ رسوخ حاصل ہوا تھا لیکن اگر امریکی قانون پر نظر غائر ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ یہ کوشش بالکل ناکام ثابت ہوئی۔ امریکی قانون میں آجکل استناد رومی قانون تحویل (bailment) سے نہیں کیا جا رہا ہے اور قانون تحویل میں بھی بجائے رومی معیار احتیاط اور مدارج غفلت کے جو شخصی اور موضوعی ہوتے تھے۔ قانون عمومی (کامن لا) کے حدود و معیار غفلت پر جو خارجی اور معروضی ہوتے ہیں عمل ہونے لگا ہے۔ کم از کم امریکہ میں اقرارات کا معروضی نظریہ روایتی نظریہ ہو گیا ہے اور وہاں کے تحلیلی اساتذہ نے اس کی شرح و بسط میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ کوئی مابعد الطبعیاتی نظریہ قانون کے اس میلان کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے اور دوسرے ممالک میں بھی اقرارات کے

معروضی نظریہ (objective theory) کو عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

۲۔ عوضی نظریہ (Equivalent) یا اس کی ترقی یافتہ شکل کاروباری نظریہ ہی قانون عمومی اور اس کے ممالک میں زیادہ شایع ہو گیا ہے۔ اس کی رو سے ہر اقرار جو کاروباری نوعیت کا ہو قابل نفاذ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے تحت مہری معاہدات (Contract under seal) نہیں آتے کیونکہ ان میں کوئی عوض ہونا ضروری نہیں ہوتا ہے۔ اور بلا کسی بدل عوض کے بھی یہ واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ اور ان کی تعمیل کرائی جاتی ہے لیکن اس نظریہ کے اثر سے خود باضابطہ معاہدات مہری ہتیار ڈالتے جا رہے ہیں اور یہ بھی تصور کیا جا رہا ہے کہ مہر یعنی "ضابطہ" خود کسی بدل یا عوض پر دلالت کرتا ہے۔ امریکہ میں بہت سے مقامات پر باضابطہ معاہدات مہری کو قانون سازی کے ذریعہ سے موقوف اور بے اثر کر دیا گیا ہے اور بہت سے مقامات پر ان کا صرف یہ اثر سمجھا جا رہا ہے کہ یہ کسی معاملے کی بادی النظری شہادت ہوتے ہیں۔ جن کی تردید شہادت سے کی جا سکتی ہے کہ در اصل کوئی بدل نہیں دیا گیا۔ عدالتہائے نصفت میں کم از کم ان کے اصول کے ظواہر کے لحاظ سے معاہدات مہری کی تعمیل کے لیے قانون عمومی کا مقررہ بدل ضروری ہوتا ہے۔ قانون تاجراں (Law Merchant) کے معاہدات مہری یہ ثابت کرتے ہیں کہ بدل نہیں دیا گیا۔ ناقابل نفاذ ہو جاتے ہیں۔ سوائے ایک صورت کے یعنی جب کہ ان کے دستاویزات قابض بامعاوضہ اور بلا اطلاع کے ہاتھ میں ہوں لیکن اس صورت میں ہی "بدل گزشتہ" دیکھا جاتا ہے۔

لیکن کاروباری نظریہ کی اس ہمہ گیری کے باوجود معاہدات سادہ کی بہت سی ایسی شکلیں ہیں جو اس کے تحت نہیں آتی ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ امریکی اور انگریزی عدالتیں بہت سے ایسے اقرارات کو بھی نافذ کر رہی ہے جن کی نوعیت معاملہ یا سودے (بارگین) کی نہیں ہوتی ہے مثلاً چندہ دینے کے اقرارات۔ بلا بدل اقرارات جن پر بعد میں عمل کیا گیا ہو۔ اقرارات جن کا بدل اخلاقی ہو۔ قرض کے خارج المیعاد یا دیوالگی کی وجہ سے ناقابل

حصول ہو جانے کے بعد نئے اقرارات۔ بلا[5] بدل کے امانت قائم کرنے کا اقرار۔ کسی[6] دین کے ضامن ہونے۔ یا بیوی[7] یا بچہ پر جائداد لکھ دینے کی صورت میں تعمیل مخصص۔ ضامن[8] جب اپنی مرضی سے جوابدہی نہ کرے تو اقرار کی تعمیل کرانا۔ اور[9] دست برداری کی دوسری شکلیں۔ امریکہ[9] کی بعض ریاستوں میں محض اقرار کی بناء پر ذمہ داری سے سبکدوش کردینا۔ واہب[10] کے ورثا کے خلاف ہبوں کی تعمیل کرانا۔ مقدموں[11] میں فریقین اور ان کے وکلا کے اقرارات یہ سب ایک کافی بڑی اور اہم فہرست ہے جن میں کوئی عوض نہیں ہوتا ہے تاہم اقرارات کو نافذ کیا جاتا ہے۔ اس فہرست میں تیسرے[12] اشخاص کی نالشوں یعنی الف اور ب کے درمیان اقرار سے ج کو فائدہ پہنچنے کی صورت میں ج کی نالشوں اور ایسی[13] نالشوں کے نفاذ کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے جن میں معاہدہ کا بدل فریقین معاہدہ کے سوا شخص ثالث کی جانب سے فراہم کیا جاتا ہے۔ مثلاً لٹرس آف کریڈٹ کی شکل جس کے قابل نفاذ قرار دینے کے امریکہ میں بہت سے اساتذہ حامی ہیں۔

سطور بالا سے ظاہر ہو گیا کہ کاروباری نظریہ جو عوض نظریہ کی ترقی یافتہ شکل ہے معاہدات سادہ کی کل شکلوں پر حاوی نہیں ہے۔ اس سے موجودہ قانون کی پوری وضاحت نہیں ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں عوضی ونیز ہرجی نظریوں سے موجودہ قانون کی اور بھی کم وضاحت ہوتی ہے۔ عوضی نظریہ کے راستہ میں پہلی مشکل یہ ہے کہ قانوناً بدل کا ناکافی ہونا کچھ اہمیت نہیں رکھتا جس کی وجہ سے بدل یا عوض پر اصرار کرنا صرف خالی الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ عدالت لصفت نے ایک مقدمہ میں بیس ہزار ڈالر کی مالیتی جائداد کی دو سو ڈالر میں بیع کو نافذ کیا ہے۔ نیز اوپر کاروباری نظریہ میں جن معاملات کی فہرست دی گئی ہے کہ ان میں کوئی سودا (بارگین) نہیں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود عدالتیں ان معاہدات کو نافذ کرتی ہیں وہی فہرست عوضی نظریہ کے اساتذہ کیلئے بھی باعث مشکلات ہے۔ نیز مزید چند مثالیں بھی دی جاسکتی ہیں۔ مثلاً جب ضامن کی

جواب دہی ہو کہ اس نے داین کو وقت دیا تھا کہ وہ کسی دوسرے ضامن کو مقرر کر لے۔ لیکن داین نے کسی دوسرے کو ضامن نہ بنایا ہو۔ اور عدالت ضامن پر ذمہ داری عاید کرنا چاہیے اور ضامن کو عذر نہ ہو تو یہاں بھی نہ کوئی بدل ہوتا ہے اور نہ امر مانع تقرر مخالف اسی طرح کفالت نامہ جس کی تکمیل میں کوئی نقص رہ گیا ہو۔ یا زوجہ کے نام تملیک جائداد یا بچوں کے لیے عطیوں میں نہ کوئی بدل ہوتا ہے اور نہ ان کی جزئی تعمیل ان کے نافذ کیے جانے ضروری ہوتی ہے۔ اس طرح مہری خیارات (option under seal) عدالتہائے نصفت میں محض مہر کی بناء پر قابل تعمیل سمجھے جاتے ہیں۔ امانت جو بلا بدل قائم کی گئی ہو محض اعلان ہی سے عدالت نصفت کیلئے وجہ دست اندازی ہوتی ہے۔

در اصل انگریزی امریکی قانون میں بھی قانونی موقف وہی ہوتا جاتا ہے جو قانون روما میں اس کے عروج کے زمانہ میں تھا۔ اول الذکر قانون میں معاہدات تین قسم کے ہیں:۔

۱۔ باضابطہ معاہدات جن میں معاہدات مہری۔ عدالتی مچلکے اور قانون تاجران کے معاہدات داخل ہیں۔ ۲) اصلی معاہدات (Real contract) قرض و تحویل۔ ۳) سادہ معاہدات جس میں کوئی ضابطہ نہیں ہوتا ہے۔ لیکن بدل دیکھا جاتا ہے۔ تیسری قسم ہی روزافزوں ہے قابل نفاذ سادہ اقرارات اتنے گوناگوں ہو گئے ہیں کہ ان کو کسی نظام میں معین اصولوں کے تحت مرتب نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح جس طرح قانون روما تمام قابل نالش اقرارات (actionable conts.) کو مرتب نہ کیا جاسکا۔ معاملات کے تحفظ اور معاشری مفاد کے پیش نظر عدالتوں کی یہ کوشش کہ اشخاص کو ان کے اقرارات کا پابند کیا جائے مختلف نظریوں اور قیاسات و تشبیہات کے ذریعہ سے جاری ہے اور ان سب نظریوں یا قیاسات میں اتفاق ہے تو اس امر پر ہے کہ کاروبار کے سلسلہ میں انسان کے قول کو اس کی دستاویز سمجھنا چاہیے اور اگر معاشی نظام کو کارکردگی کے ساتھ قایم رکھنا ہے تو اس کے بنی نوع کے لیے یہ ممکن ہونا چاہیے کہ اس کے قول پر بھی وہ اتنا ہی بھروسہ کر سکیں جتنا کہ اس کے دستاویز پر کیا جاتا ہے یہ صاف

طور پر عیاں ہے کہ اکثر عدالتیں شعوری یا غیر شعوری طور پر ڈنلاپ بنام سلفرج کے مقدمہ میں لارڈ ڈینیڈن کے اس قول عدالتی کے ساتھ ہمدردی رکھتی ہیں کہ اس نظریہ کے ساتھ کوئی الفت نہیں ہو سکتی جس کی رو سے مقر کے لیے یہ ممکن ہو کہ وہ اپنے ایسے اقرار سے روگردانی کر سکے. جو بالارادہ کیا گیا ہو اور جو بنفسہ منصفانہ ہو اور جس میں مقر لہ کو قوم کے دوسرے اشخاص کی معمولی سمجھ کے مطابق ایک جائز مفاد ہو۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ گو نظریہ بدل پر چار سو سال سے نظریہ بازی ہو رہی ہے لیکن بدل کی کوئی جامع مانع تعریف نہیں کی جا سکی ہے یا وہ معاہدات میں اس کے ایک معنی ہوتے ہیں اور سب اساتذہ اس معنی پر متفق بھی نہیں ہیں۔ دستاویزات قابل بیع و شری میں دوسرے۔ انتقالہائے جائداد میں تیسرے۔ اور مقدمات نصفت میں ایک چوتھے۔ اور ٹھیک طور پر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کونسے چوتھے۔

نظریہ بدل انگریزی امریکی قانون میں دو وجوہ سے معاہدات سادہ میں اب بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ایک تو قانون دانوں کا یہ احساس کہ قانون عمومی فطرت کے مطابق ہے اس کے اصول قوانین قدرت ہیں۔ ۱۸ ویں صدی تک بلاکسٹن پڑھائی جاتی تھی اور یہ خیالات اس کی وجہ سے قانون دانوں کے خیالات تھے۔ پھر انیسویں صدی میں تاریخ اساتذہ کے خیالات کی وجہ سے کہ نشو و نما اسی بنیاد پر ہوا ہے یہ خیالات اور راسخ ہو گئے۔ قانون داں تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے اور تغیر میں وہ خطرہ سمجھتے ہیں لیکن تغیر بہت ہوا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ معاہدات سادہ کی تعمیل کا کوئی منظم اصول نہیں ہے۔

دوسری وجہ زیادہ قانونی ہے۔ عدالتیں محسوس کرتی ہیں کہ معاملہ کے وقت بہت کچھ آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے اور معاہدہ سے پہلے جو کیا جاتا ہے اس میں سے بہت کچھ قیمت بڑھانے کی غرض سے بائع کے اپنے مال کی بے اندازہ تعریف پر مبنی ہوتا ہے اس سے دراصل اس کا مطلب نہیں ہوتا ہے کہ مشتری سب کچھ صحیح سمجھ لے اور نہ مشتری اس کو صحیح سمجھتا ہے ان صورتوں میں اقرارات محض "نمائشی" ہوتے ہیں ارادہ کسی قابل پابندی اقرار کا نہیں

ہوتا ہے۔ عدالتیں ایسی گفتگو پر غفلت کے مماثل ذمہ داری عاید کرنا۔ قرین انصاف نہیں سمجھتی ہیں۔ یہ ٹھیک سہی۔ لیکن ہماری دانست میں اس نمائشی گفتگو کا ضرورت سے زیادہ لحاظ کیا گیا ہے اور (Derry v. Peek) میں وضع کردہ اصول انسانی باتونی پن کے ضرورت سے زیادہ لحاظ پر مبنی ہے۔ کیونکہ اس مقدمہ میں کمپنی کے پراسپکٹس کے غلط اندراجات کے باوجود جس سے بہت سے اشخاص کو نقصان پہنچا کوئی ذمہ داری عاید نہیں کی گئی ہماری دانست میں چونکہ انسان باتونی پن سے بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ یہہ تصور کرنا کہ کاروباری اشخاص بھی کاروبار کے متعین مواقع پر محض نمائشی گفتگو کرتے ہیں صحیح نہیں ہوگا۔ موضوعی نظریۂ اقرارات کو قبول کئے بغیر اس سے ایک سبق لیا جا سکتا ہے۔ اور ان اقرارات کو قابل نفاذ قرار دیا جا سکتا ہے جن کو معمولی سمجھ کے مقر لامعقول طور پر تصور کریں کہ وہ قانونی ذمہ داری پیدا کرنے کے ارادے سے کئے گئے تھے۔ ہماری رائے میں معاہدات کا تحفظ زیادہ آسانی سے اور زیادہ موثر طریقہ پر بہ نسبت بدل پر زور دینے کے ثبوت کی ضروریات پر زور دینے سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً جس طرح کہ قانون انسداد فریب میں زور دیا گیا ہے۔

ان حالات میں اکثر اساتذہ کی رائے میں علم اصول قانون کا بیسویں صدی میں سب سے بڑا موقع انگریزی امریکی قانون معاہدہ میں ہے کہ وہ اصول وضع کرے جن کے مطابق اقرارات کی تعمیل ہونی چاہیے۔ محض قانون کا اعادہ یا بیان اگرچہ وہ پروفیسر (Williston) کی بلند پایہ تصنیف کے معیار کا ہو کافی نہیں۔ کیونکہ جو چیز موجود ہی نہ ہو اس کا اعادہ یا بیان کس طرح کیا جا سکتا ہے اور یہہ واقعہ ہے کہ اب تک قانون بدل کیا ہے۔ اور یہ کن صحیح اصولوں پر مبنی ہے یقین و تعیین کے ساتھ نہیں کہا جا سکا۔ اگر بدل کا یعنی ان اصولوں کا جن کے مطابق اقرارات کی پابندی کرائی جانی چاہیے کوئی جامع و مانع نظریہ علم اصول قانون پیش کر دے تو عدالتیں اپنے قانونی تجربے اور قانونی عقل میں اس کو ڈھال لیں گی اور اقرارات کی تعمیل کے متعلق ایک نظام قایم ہو جائے گا اس خصوص میں ممکنات کا اندازہ قدیم قانون ٹارٹس کا

انیسویں صدی کے آخر کے قانون ٹارٹس سے مقابلہ کرنے پر ظاہر ہوگا۔ قدیم قانون ٹارٹس میں چند معین افعال ناجائز۔ نالش مداخلت بیجا اور اس کی توسیع شدہ شکل (Trespass on case) کی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہ نظریہ قایم ہوا کہ ذمہ داری ضرر پر مبنی اور اس کے لحاظ سے ہوگی اس سے نہ صرف قانونی نظریہ کی وضاحت بلکہ عدل گستری میں سہولت ہوی۔ بیسویں صدی میں بھی علم اصول قانون ایسی خدمت فقہا کی توجہ سے انجام دے سکتا ہے یعنی اگر وہ نیک نیتی کے حدود نیز اور اقرارات قابل تعمیل کے کوئی اصول یا معیار قابل قبول شکل میں وضع کرسکیں جس پر جج واضعان قانون فقیہ اور وکلا عمل کرسکیں۔ اور جس سے قانون کا نصب العین متعین و ظاہر ہوجائے اور قانونا قابل تعمیل معاہدات کا دایرہ وسیع اور متعین ہوجائے۔

جائداد۔ وقت کی تنگی کے باعث مجھے جائداد سے متعلق اپنے بیان کو بہت ہی مختصر کرنا ہوگا۔ جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں۔ آج کل عام طور پر اعتراض ہو رہا ہے کہ صرف ہوا۔ روشنی اور آب رواں ہی کیوں (Res communes) ہوں اور اراضی اشیاء خوردنی۔ آلات صنعت اور سرمایہ بھی کیوں نہ اجتماعی ملک کے قابل اشیا سمجھے اور قرار دیے جائیں اسی لیے جائداد کے خانگی حق کی کیا توجیہ کی جائے اور اس کے حدود کو کس طرح تعین کیا جائے مشکل قانونی مسائل ہوگئے ہیں جن کے بیان سے متعلق کم از کم چھ نظریے یعنی قانون قدرت پر مبنی نظریے۔ مابعد الطبیعیاتی نظریے تاریخی نظریے۔ ایجابی نظریے نفسیاتی نظریے۔ اور عمرانی نظریے رائج ہوے ہیں۔ اول الذکر دو نظریوں کی جائداد سے متعلق خانگی حق کی توجیہ لاریمر کے اس جملے میں بیان کردی جاسکتی ہے کہ "زندہ ہونے اور زندہ رہنے کے حق میں زندگی کے لیے یعنی ضروریات کا حق بھی داخل ہے (The right to be and to continue to be implies a right to the conditions of existence

یا ہیگل کے اس جملہ میں کہ (Property is a realisation of the idea of liberty یعنی جائداد تصور آزادی کی ظاہر یا تکمیل شدہ شکل ہے۔ ہربرٹ اسپنسر کا ایجابی نظریہ ان دونوں نظریوں سے مختلف نہیں ہے البتہ تاریخی نظریہ کے اساتذہ نے قانونی تاریخ کے وسیع مطالعہ کے بعد اس

حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ واقعاتی قبضہ یا (SEISIN) سے قانونی ملکیت کا تصور پیدا ہوا یہ ملکیت ابتداءً اجتماعی ۔ یا قبائلی ہوتی تھی ۔ کیونکہ ابتدائی معاشرہ میں قبیلے ہی قانونی اکائیاں ہوتی تھیں ۔ آہستہ آہستہ دو تصورات اجتماعی مفادات کی شکست و ریخت اور افراد کے خانگی حقوق جائداد کے تسلیم کئے جانے کے باعث ہوئے یعنی ایک تو تقسیم خاندان کا تصور ۔ اور دوسرے ذاتی یا مکسوبہ جائداد کا تصور خاندانوں کی تقسیم ان کے بہت بڑے ہو جانے کی وجہ سے ضروری ہوئی اور خاندان کی تقسیم کے ساتھ جائداد کی تقسیم بھی کی جاتی تھی ۔ اب بھی دھرم شاستر میں تقسیم سے مراد خاندان کی تقسیم ہوتی ہے ۔ اور ضمنی طور پر جائداد کی تقسیم مراد لی جاتی ہے ۔ قانون روما میں بھی تقسیم کی پرانی نالش کو تقسیم خاندان کی نالش کہا جاتا تھا ۔ خاندانوں میں تقسیم کے بعد افراد میں تقسیم ہونے لگی مثلاً قانون روما میں پدر خاندان کے انتقال پر ہر لڑکا جو اس کے اختیار پدری میں ہوتا تھا تقسیم کی نالش کر سکتا اور خود پدر خاندان ہو جاتا تھا ۔ چاہے وہ خاندان کا تنہا فرد ہی ہو ۔ ابھی شادی کیا ہو اور نہ اس کے اولاد ہوئی ہو ۔ اس طرح پر خانگی ملکیت بجائے خاندانی ملکیت کے معمول ہو گئی ۔ اس نتیجہ میں ذاتی مکسوبہ جائداد کا تصور بھی ظہر ہوا ۔ دھرم شاستر اور قانون روما کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ بہادری یعنی جنگی خدمات یا علم و فن کی بناء پر پیدا کردہ جائداد ذاتی مکسوبہ جائداد تصور کی جانے لگی اور جائداد کی عدم مساوات کے متعلق فرض کیا گیا کہ وہ "زیادہ طاقت ۔ زیادہ ذہانت اور زیادہ محنت" کی وجہ سے ہے ۔

اس طرح پر اب ہر ترقی یافتہ نظام قانون میں جائداد کا خانگی حق عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے تاریخی اساتذہ کے نزدیک یہ واقعہ ملکیت کے قبضہ سے ترقی پانے کے واقعہ سے مل کر اس تصور کو ظاہر کرتا ہے جو عدل گستری کے انسانی تجربے سے ظاہر ہوا اور جو مابعد الطبیعیاتی اساتذہ کے موقف کی توثیق کرتا ہے یعنی یہ خانگی جائداد آزادی کا ایک لوازمہ ہے ۔ اور بغیر خانگی جائداد کے تصور کے قانون کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اس استدلال کے مابعد الطبیعیاتی جزء کو ہم ترک بھی کر دیں اور اس کے متعلق قانونی تاریخ کی تمثالی اور سیاسی تعبیر ہی کریں تو انیسویں صدی کے تاریخی اساتذہ کا نظریہ بہت کچھ وقعت کا

حائل نظر آتا ہے۔ لیکن قانون کے چند جدید رجحانات کا جب ہم خیال کرتے ہیں تو ہمیں توقف کرنا پڑتا ہے مثلاً مالک کے حقوق ملکیت کو گھٹانے کا رجحان جو اصل انتقال بذریعہ تحریر ظہری (
اور اس اصول کی ترقی سے کہ قبضہ بظاہر ملکیت ہے۔ (Possession vant titre)
یا بعض دوسرے طریقوں کے رائج ہو جانے سے ظاہر ہو رہا ہے جن میں معاملات کی حفاظت اور معاشری مفادات کی اہمیت اور ان کے تحفظ کی ضرورت کی وجہ مالک کے حقوق ملکیت کو گھٹایا جا رہا ہے اور جس کی ایک مثال یہ دی جا سکتی ہے کہ چار سو پونڈ کی ایک ہمیر گاڑی کو مالک نے ایک فیکٹر کے پاس اس ہدایت کے ساتھ رکھوائی کہ وہ چار سو پونڈ سے کم میں نہ فروخت کی جائے۔ فیکٹر دیوالیہ ہو رہا تھا۔ چالیس پونڈ میں فروخت کر دیا عدالت نے قرار دیا کہ ملکیت منتقل ہو گئی کیونکہ فیکٹر بظاہر مالک تھا اس طرح پر قانون روما کے وہ اصول جن میں مخالفانہ قبضہ سے ملکیت کے حصول کو بہت محدود کیا گیا تھا اور مالک کو یہ حق حاصل تھا کہ عام طور پر بلا قید میعاد کسی وقت بھی اپنی ملکیت کو واپس حاصل کر سکتے اب نہایت واضح قوانین میعاد سماعت کے تابع کر دیے گئے ہیں۔ جن میں مالک کے حقوق ملکیت زائل ہو جاتے ہیں۔ قانون میعاد سماعت کا یہ فیصلہ کن اطلاق ان ممالک تک محدود نہیں ہے جن کے قوانین قانون روما سے ماخوذ ہیں۔ بلکہ انگریزی قوانین میں بھی جہاں اٹھارہویں صدی تک قانون میعاد سماعت کو معاندانہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اب اس کو اچھی نظروں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسی طرف اختیار تصرف (Jus abutendi)
پر قیود کو مثلاً قدرتی مناظر و ذرائع کے تحفظ کے لیے مالکان اراضی پر قیود لگانے کو تاریخی اساتذہ ایک رجعت قہقری تصور کرتے ہیں لیکن یہ واقع ہو رہی ہے۔ اور آج کل کے بحیثیت منظم سماج میں جماعتوں کی تعداد اور ان کے اثر میں ترقی سے رجحان یہی ظاہر ہے کہ ان کے قانونی وحدت نہ ہونے کے باوجود ان کی جائدادیں تسلیم کی جائیں اس سے ظاہر ہے کہ تاریخی اساتذہ ہی نے جس تجربہ پر بھروسہ کیا تھا کہ انسانی تجربہ شاہد ہے کہ خانگی جائداد کی طرف ترقی ہوئی ہے وہ بہت ناکافی اساس پر مبنی تھا۔ چنانچہ عمرانی نظریے کے ممتاز استاد ڈگوئی نے مختصراً بتایا ہے کہ قانون

جائداد اشتراکی کر دیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ملکیت جائداد اجتماعی ہوتی جا رہی ہے
اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہم جائداد کو ایک خانگی حق یا مفاد تصور کرنا کم کر دے رہے ہیں اور اس کو
ایک معاشری وظیفہ سمجھنے لگے ہیں۔ اگر اس میں شبہہ ہو تو امریکہ کی لگان سے متعلق جدید قانون سازی ملاحظہ
کی جائے جس کا اثر یہ ہے کہ لگان پر اٹھانا ایک ایسا کاروبار سمجھا جا رہا ہے جس میں پبلک کا مفاد
ہوتا ہے اور اسی وجہ سے صرف معقول کرانے ہی مثلاً بجلی یا آبرسانی کے کاروبار کے وصول کیے جا سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں انیسویں صدی میں انگریزی و امریکی قوم کے خیالات اور تصورات کے مطالعہ سے
ظاہر ہے کہ مجملہ اور امور کے کمزوروں کے لیے احساس ذمہ داری اور معاشری مساوات کی طرف
ترقی ہوئی ہے اور اس سے ۱۹ ویں صدی کے قانون سازی کے تصورات کی توثیق ہوتی ہے۔
جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ اس صدی میں آزادی کا تصور کارفرما رہا اور اس صدی کی قانون سازی
اسی تصور کے تحت ہوئی۔ اس سے بہت کچھ اصلاحیں ہوئیں لیکن قدیم معاشری برائیاں کماحقہٗ دور
نہیں ہوئیں اہم بات یہ ہے کہ ان کا شعور روزافزوں ہے۔ اور ان سے مقابلہ کے عزم صمیم میں اضافہ
ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا مفلسی جہل بے وقوفی اور جرائم سے بچا نہیں جا سکتا
وہ پسینہ بہانے والے مزدوروں کے تنگ و تاریک حجروں زنان بازاری کٹہرہ کے قیدیوں
جاہل کاشتکاروں کو ایک نئی اور بے چین کرنے والی شخصی ذمہ داری کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ چند
لوگ ہی نہیں بہت سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا یہ درست ہے کہ چند اشخاص عیش میں گزاریں اور
بہت سے لوگ حد درجہ تنگ دستی میں وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ کیا زندگی کی اچھی چیزوں کی
تقسیم بجائے بخت و اتفاق کے انصاف کے اصولوں پر نہ کی جانی چاہیے۔ نیز وہ یہ بھی جاننا چاہتے
کہ کیا بہتر قابلیت بے اندازہ دولت کے لیے کوئی ایک اچھی حقیقت ہے۔ اور کیا کام کے لحاظ
سے معاوضہ سے بہتر کوئی اور تصور انسانی خدمات کے معاوضہ کا نہیں ہے۔ یہ سوالات صرف
مفکرین ہی کے نہیں ہیں۔ بلکہ ہر طبقے کے مرد اور عورتیں یہ سوالات کر رہی ہیں۔ یہ ایک الہامی
بے چینی ہے۔ جو ہر خطرہ سے خالی نہیں اور جو اصلاحات کہ کی جا چکی ہیں۔ ان کی اہمیت کو

گھٹاتی ہیں تاہم اس سے بیسویں صدی کو انیسویں صدی سے جو تصورات ترو کہ میں ملتان کے پائدار اثر کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

اور خلاصہ جائداد سے متعلق ہماری بحث کا یہ ہے کہ آجکل مثل مملکت کے اقتدار کے جائداد کا خانگی حق معرض بحث میں ہے جائداد کی مابعد الطبعیاتی اساس قابل اطمینان سمجھی جا رہی نہ تاریخی اساس۔ اور اسی میں فقہا کے لئے دعوتِ عمل ہے کہ وہ جائداد کے متعلق خانگی حقوق کے جواز کا نیز کا مملکت کے اقتدار کے استعمال کے حدود کا اس طرح تعین کریں کہ معاشری برائیاں دور ہوں۔ اور معاشری انصاف ہو سکے۔ فرد کی انفراویت کل کی خوشی و خوشحالی کے ساتھ ساتھ قائم رہے ڈارون کے نظریہ ارتقاء سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کشمکش حیات بقائے اصلح کا موجب ہوتا ہے وہیں اس نظریہ سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ ساری زندگی ایک ہے۔ بنی آدم ایک دوسرے کے اعضاء ہیں۔ کل سماج ایک عضویت ہے۔ غرض جائداد کے خانگی حق۔ اس کے عدم مساوات کی وجہ سے معاشری نا انصافی کا جو احساس ہے اس کا ہمت جرأت اور وسعت نظر سے مقابلہ کرنا ضروری ہے اور اس میں فقہا کے لیے میں پھر کہوں گا کہ دعوتِ عمل ہے۔

فقہا کے لیے اسلیے کہ گو آج کل یہ صداقت مسلمہ ہے کہ قانون پہلے قوم میں پیدا ہوتا ہے اور جج یا فقیہ کو ہمیشہ ایسے اعمال سے سابقہ ہوتا ہے جو اولاً واقعی معاشری تعلقات سے قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم فقہا کے تخلیقی اثر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخی اسکول کے استاد ساویں یی نے کہا ہے کہ فقہا کی قانون سازی عوام کے نمائندہ کی حیثیت سے ہوئی اور عوام کے بنائے ہوئے قانون کے دائرہ کے اندر ہی رہتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جب کوئی مثلاً حکم نامہ احضار شخص جاری کرتا ہے اور یہ کہہ کے جاری کرتا ہے کہ انگریزی قانون کا یہ بہت ہی بنیادی اور قدیم اصول ہے کہ حبس بیجا سے ہر شخص آزاد رکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسے اصول کو بیان کر رہا ہے جو تمام برطانویوں کے ایقان میں موجود ہے اور اس خصوص میں وہ عوام کا نمائندہ ہے لیکن جب وہ قانون ارضی کے کسی اصطلاحی اور سخت پیچیدہ امر کا مثلاً

[illegible]) کا فیصلہ کرتا ہے تو یہ کہنا کہ یہ بھی قوم کے ایقان میں داخل ہے اور اس میں بھی وہ قوم کی نمائندگی کرتا ہے صحیح نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ امر قوم کی سمجھ سے کوسوں دور ہوتا ہے۔ اس طرح پر قانون کے اہم مسائل میں یہ کہنا کہ جو جس کے ذہن میں ہوتا ہے وہ عوام کے ذہن میں بھی ہوتا ہے۔ یا زبانِ فقیہہ زبانِ خلق ہے، صحیح نہیں ہے۔ قانونی تاریخ کے تبدی پر بھی یہ امر روشن ہے کہ تعبیر کنندوں یا فقیہوں کا اثر قانون پر کتنا گہرا ہے۔

رومن فقہا کو لیجیے کہ انھوں نے قانون روما کی شکل میں جریدۂ عالم پر ایک لافانی یادگار چھوڑی ہے جو نہ جدید ہے نہ قدیم بلکہ ہر زماں اور ہر مکاں میں اس کے اصول اتنے بے مثال ہیں کہ ان سے ثابت ہے کہ ذہن کے لافانی ہونے کے سامنے مادہ کا لافانی ہونا کوئی شے نہیں ہے فراموش نہ کیجیے کہ یہ رومن فقیہہ نہ حکمراں تھے نہ اوتار نہ قانون ساز اور نہ ان کی یاد باقی رکھنے کے لیے کوئی اہم واقعات عوام کے دلوں میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان سخت محنت کرنے والے عہدہ داروں اور فقیہوں کا اثر یورپ کے قانونی اداروں سے ان دو ہزار سالوں میں کبھی کلیتہً زائل نہیں ہوا ہے۔ جب تیسری صدی عیسوی میں آخری فقیہہ الپین نے اپنا کام ختم کیا تو روما میں زوال آغاز اور جاگزیں ہو چکا تھا اور چوتھی اور پانچویں صدی میں سلطنت روما میں سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان فقیہوں کی یہ سب محنت رائگاں گئی لیکن جسٹینین کے ہاتھوں یہ پھر زندہ ہوئے۔ اور دنیا کا عظیم ترین (یہ نہ ہی تو عظیم ترین مجموعوں میں سے ایک) مجموعہ قانون ایسے فقیہوں کے تصانیف سے بنایا گیا جو دو تین چار پانچ صدی پہلے مر چکے تھے لیکن یہ احیا بھی بظاہر دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ پھر پانچ صدیوں تک یورپ پر تاریکی چھا گئی۔ عہد قدیم کے ان فقیہوں کی شمع محض ایک چراغ ہو گئی جس میں نہ روشنی رہی نہ گرمی۔ اس کے بعد پروانس لمبارڈی، راوینا اور بولونہ میں دوسرا احیا ہوا ایسا کہ یورپ کا کوئی ملک حتیٰ کہ انگلستان بھی جہاں اس کا اثر نسبتاً کم رہا ہے اس کے اثر سے بے نیاز نہیں رہا۔ انگریزی ازمنۂ وسطی کا قانون بولونہ کا رہینِ منت ہے۔ نہ صرف براکٹن ہی نے یہاں تحصیل علم

کیا تھا۔ بلکہ انگریزی جسٹی نین یعنے ایڈورڈ اول یہاں سے ایک عمبر قانونی ([illegible]
[illegible] Son of Accident) کو لایا تھا اور اس کو عہدہ جلیلہ پر سرفراز کیا تھا۔ براکٹن نے صرف ازمنہ وسطیٰ
کے قانون پر ایک اہم کتاب لکھی ہے بلکہ نظائر کے نظام کی بنیاد بھی اسی نے ڈالی ہے لٹل ٹن نے
بھی انگریزی قانون ارضی کی افراتفری میں ایک نظام قائم کیا ہے۔ لٹل ٹن کے متعلق کک کہا
ہے اور صحیح کہا ہے کہ "اس نے اپنی بہترین تصانیف اور کام سے جو وہ دوسروں سے سیکھا تھا
عصرہائے مابعد کے تمام پروفیسروں کو قانون سکھایا ہے"۔ خود کک بھی قانون کی شاہراہ پر
ایک رہنما تختی ہے۔ جو بے ڈول ہی سہی لیکن ایسی ہے کہ اس کی رہنمائی سے مفر نہیں۔ انگریزی
قانون میں اس کی انتھک محنت اور دقت نظر کا بہت اثر رہا ہے اور کامن لا اور منصب عدالت
کا نصب العین جو انگریزی نظام عدل گستری کی اساس ہے اسی کا قائم کردہ ہے۔ اٹھارویں صدی
میں بلاکسٹن گو اپنے عظیم مشیروں کے مانند عظیم شخصیت کا حامل نہیں تھا لیکن شروحات لکھ کے
اس نے قانونی تعلیم کی خدمت ایسے زمانہ میں کی جبکہ قانونی تعلیم گویا تھی ہی نہیں۔ اس کے
شروحات کی ہر دلعزیزی قانونی تاریخ میں بے مثال ہے اور آج تک بھی انگریزی قانون میں ان سے
اچھی کتاب شاید نہیں لکھی گئی ہے۔

فقیہوں کے اثر اور طاقت کی یہ چند جدید مثالیں ان کو صریحی قانون سازی بھی مانا نہیں سکتی ہے
ان کو کس حد تک "عوام کا نمائندہ" کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو ہر غیر معمولی شخص اور ہر بے وقوف "بھی"
اپنے زمانے کی پیداوار ہوتا ہے اور اسپین کے لیے قانون روما میں سے غلامی کو خارج کرنا اتنا ہی ناممکن
جتنا کہ لٹلٹن کے لیے قانونی ارضی میں رجسٹری کو لازمی کرنا۔ اسی لیے اگر رومیوں کو قانون کا خاص
ملکہ یا خداداد قابلیت ([illegible]) نہیں ہوتی تو عہد قدیم کے رومن فقیہ قانون روما کو
اس کی موجودہ شکل نہیں دے سکتے۔ تاہم یہ تسلیم کرنا انفرادی فقہا کے اثر اور تخلیقی کارناموں کو نظر انداز
کرنے کے مترادف نہیں ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ قانون روما صرف حالات یا صرف رومیوں ہی کا
بنایا ہوا ہے ان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔

موجودہ قانون کی متعدد دشواریوں میں سے میں اس مختصر وقت میں اوپر صرف معاہدہ اور جائداد سے متعلق بعض دشواریوں کی طرف توجہ دلا سکا اور ماضی کے بعض فقہا کے کارناموں کا بھی ذکر مختصراً کر دیا ہے۔ اور اپنا یہ مختصر مضمون اس توقع پر ختم کرتا ہوں کہ عصر حاضر کے فقہا کے کارنامے ماضی کے فقہا کے کارناموں سے بہتر ہوں گے اور نظام قانون ان کی کوششوں سے متوافق متوازن اور انسانی ضروریات کے مطابق ہو جائے گا جس سے عدل گستری آسان منصفانہ اور بہترین کارکردگی کی حامل ہو گی۔

میر سیادت علی خاں

حصہ دوم

روئداد

کل ہند کانفرنس قانون

اجلاس اوّل

۱۳۵۳ف

۱۹۴۴ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روئداد اجلاس اوّل

کُل ہند کانفرنس قانون حیدرآباد دکن

تمہید | قانون داں اور قانون پیشہ اصحاب، ملک کی ہر سماجی سرگرمی میں پیش پیش ہیں لیکن خود ان کی اپنی کسی تنظیم کا نہ ہونا عرصے سے محسوس ہو رہا تھا۔ ۱۳۳۷ف (۱۹۲۸ء) کے اواخر ہی میں بزم قانون جامعۂ عثمانیہ نے ایک کانفرنسِ قانون کا مکمل لائحۂ عمل مرتب کیا تھا لیکن بعض وجوہ سے وہ منعقد نہ ہو سکی۔

حیدرآباد میں بھی اور برطانوی ہند میں بھی کانفرنس وکلاء کئی بار منعقد ہو چکی ہے لیکن ایک ایسا ادارہ جو وکلاء قانون، سازوں، حکام عدالت، اساتذہ وطلبۂ قانون اور قانون سے دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد کو جمع کر سکے، موجود نہ تھا۔

آخر بزم قانون کی تحریک پر جامعۂ عثمانیہ نے ایک کل ہند کانفرنس قانون کا اولین اجتماع حیدرآباد میں طلب کرنا منظور فرمایا۔ یہ اسی کی روئداد ہے جسے کاغذ کی نایابی کے باعث مختصر سے مختصر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سرپرستی | حضرت جلالت مآب سلطان العلوم تاجدار دکن نے براحم خسروانہ اس کانفرنس کی سرپرستی فرمائی اور کانفرنس کو اپنے ولولہ انگیز پیام شاہانہ سے سرفراز فرمایا۔

افتتاح | ہز اکسلنسی فضیلت مآب نواب صدر اعظم و امیر جامعۂ عثمانیہ نے کانفرنس کا افتتاح فرماتے ہوئے پیام شاہانہ پہنچانے کی سعادت حاصل فرمائی۔

استقبال | معزز صدر المہام بہادر عدالت و امور مذہبی نے خطبۂ استقبالیہ ارشاد فرمایا۔

نمائش قانون | معزز صدر المہام بہادر تعلیمات نے نمائش قانون کا افتتاح فرمایا جس کا خطبۂ استقبالیہ آنریبل راجہ میر مجلس بہادر عدالت عالیہ نے ارشاد فرمایا۔ جو حصہ انگریزی میں شائع ہوا ہے

دعوت وضیافت | کانفرنس کی دعوتیں صدر استقبالیہ معزز صدر المہام عدالت اور نائب صدر استقبالیہ جناب معین امیر جامعہ عثمانیہ کے نام سے جاری ہوئیں۔

کانفرنس کے ارکان کو ہز اکسلنسی صدر اعظم بہادر نے ایک عصرانے پر قصر صدارت میں مدعو فرمایا۔ مولوی عبدالواحد اویسی صاحب صدر انجمن وکلا حیدرآباد نے بھی ایک ضیافت فرمائی۔

انتظامات | تمام معزز مہمان جو بیرون سے آئے تھے سرکاری مہمان رہے۔ کانفرنس کے انتظامات مختلف کمیٹیوں کے سپرد کئے گئے جن کے ارکان کی تفصیل یہ ہے:۔

مجلس تنفیذی | ڈاکٹر ناظر یار جنگ

پروفیسر حسین علی مرزا

ڈاکٹر محمد حمید اللہ (خازن)

شیخ حیدر (معتمد مقامی)

مجلس انتظامات عمومی | علاوہ مجلس تنفیذی کے جس کا تقرر جامعہ کی طرف سے عمل میں آیا تھا:۔

۱۔ راجہ بہادر پنڈت بشیشر ناتھ واگھرے۔

۲۔ نواب علی یاور جنگ بہادر

۳۔ نواب میر اکبر علی خاں

۴۔ دیوان بہادر آر وامدو اینگار

۵۔ مولوی محمد عبدالرؤف

۶۔ مولوی رشید صدیق حسین

۷۔ مولوی محمد ابوالخیر

۸۔ مولوی خواجہ محمد احمد

۹۔ مولوی محمد غوث

۱۰۔ پنڈت سوریا نارائن راؤ۔

۱۱۔ مولوی لطیف احمد فاروقی

۱۲۔ مولوی غلام احمد خاں

۱۳۔ ڈاکٹر میر سیادت علی خاں

مجلس تدوین و اشاعت | مولوی محمد عبدالروف (صدر)

مولوی ابو العارف

مولوی رشید صدیق حسین

مجلس فراہمی چندہ | مولوی محمد عبدالروف (داعی)

نواب میر اکبر علی خاں

مولوی ابوالخیر

مولوی میر غلام حسن علی

مولوی بشیر الدین

مجلس مالی | مجلس تنفیذی ہی یہ کام انجام دیتی رہی۔

مجلس استقبال مہمانان | مولوی لطیف احمد فاروقی (صدر)

مولوی غلام احمد خاں

مولوی مستنصر علی

رضا کار صاحبان (طلبۂ قانون)

مجلس نمائش | مولوی خواجہ محمد احمد (داعی)

مولوی محمد غوث

مولوی قطب الدین

پنڈت سوریا نارائن

پنڈت راگھویندر راؤ بھساری

مولوی سید علی

مجلس رضاکاران | مولوی محمد عبدالستار (صدر رضاکار)

مولوی سعادت اللہ احسن حسینی (نائب صدر رضاکار)

معاون و ہمدرد | جو محترم اصحاب خود کو نمایاں کئے بغیر کانفرنس کے لئے بے انتہا امداد فرماتے رہے ان میں سب سے پہلے معتمد تعلیمات و عدالت و امور عامہ و امور دستوری (نواب علی یاور جنگ بہادر) ہیں جن کی بروقت بلکہ ہر وقت کی امداد کے بغیر کانفرنس کا انعقاد ہی ناممکن ہوتا۔
دوسرے نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر ہیں جن کی رہنمائی و کارفرمائی سے قدم قدم پر کانفرنس متمتع ہوتی رہی۔ نیز مولوی عبداللہ باشا صاحب کی فیاضانہ امداد کے بھی ہم ممنون احسان ہیں۔ ہم انجمن طیلسانیین جامعہ عثمانیہ کے بھی نہایت ممنون ہیں کہ اس کا دفتر، ہماری کانفرنس کا دفتر بنا رہا اور دیگر ہر طرح کی سہولتیں حاصل رہیں۔

نشریات | کانفرنس کے اہتمام سے ایک مختصر لیکن جامع و باتصویر انگریزی رسالہ "قانون اور انصاف حیدرآباد میں" شائع کرکے جملہ مہمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ ہمارے سابق میر مجلس عدالت عالیہ آنریبل نواب مرزا یار جنگ بہادر کے ایک قابلانہ نوٹ پر مبنی تھا اور حیدرآباد کے قانون اور عدل گستری کی تاریخ پر مفید معلومات کا حامل تھا اور اب بھی بزم قانون جامعہ عثمانیہ سے بقیمت مل سکتا ہے۔
روزنامہ رہبر دکن حیدرآباد نے دوران کانفرنس میں ایک خصوصی نمبر شائع کیا جس میں حسب ذیل مضامین تھے اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے تھے (یہ بھی بزم قانون جامعہ عثمانیہ سے بہ قیمت مل سکتا ہے)

۱۔ عدالت اور قانون حیدرآباد از محمد مظہر صاحب معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس
۲۔ حیدرآباد اور قانون۔ از خصوصی مقالہ نگار۔
۳۔ دکن کے خدمات قانونی۔ از ش۔ ر
۴۔ ہندو قانون کی تدوین میں دکن کا حصہ۔ از شیخ حید صاحب معتمد مقامی کل ہند کانفرنس قانون۔

کانفرنس کے موقع پر خود بزم قانون جامعہ عثمانیہ نے اپنی اکیس سالہ سرگذشت "تذکرۂ شعبۂ قانون" کے نام سے مرتب کی (اور اسی سے بقیمت مل سکتی ہے) اس میں حیدرآباد کی تاریخ عدل گستری و تعلیم قانون پر جامع تبصرہ ہے اور جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ قانون کے متعلق وہ حسب ذیل معلومات کی حامل ہے :-

۱- حالات اساتذۂ شعبہ

۲- حالات میرانِ شعبہ

۳- جملہ اعزازی طیلسانیئن قانون (جامعۂ عثمانیہ)

۴- جملہ ال ال ام عثمانیہ کے حالات

۵- جملہ ال ال بی عثمانیہ کے حالات

۶- بزم قانون کی بیس سالہ سرگذشت

کانفرنس کے لئے پانچ اعلامیے تمام ہندوستان میں اردو اور انگریزی میں شائع کر دئے گئے تھے۔ اب پہلے اجلاس کی روئداد شائع کی جارہی ہے (جو دفتر کانفرنس قانون جامعۂ عثمانیہ سے مل سکتی ہے)

آمد خرچ | ابھی حسابات کی باقاعدہ تنقیح نہیں ہوئی ہے اور نہ آخری مدوار تقسیم۔ بہرحال آمد و خرچ کا خلاصہ یہ ہے :-

آمدنی	روپے	خرچ	روپے
۱- عطیۂ نواب امیر جامعہ	۱۰۰۰	مصارف طباعت روئداد ہذا	؟
۲- عطیۂ صدر المہام تعلیمات	۱۰۰۰	دورہ فراہمی چندہ	۱۲۶
۳- عطیۂ صدر المہام عدالت و مذہبی	۱۰۰۰	حمل و نقل	۲۹۹
۴- عطایا و فیس رکنیت	۵،۰۳۲	طباعت	۱۲۴۱
۵- مبادلہ از بزم قانون [illegible]	۱۲۵	تنخواہ ملازمین	۲۷۰

مولوی سید علی

مجلس رضاکاران مولوی محمد عبدالستار (صدر رضاکار)

مولوی سعادت اللہ حسینی (نائب صدر رضاکار)

معاون و ہمدرد جو محترم اصحاب خود کو نمایاں کئے بغیر کانفرنس کے لئے بے انتہا امداد فرماتے رہے ان میں سب سے پہلے معتمد تعلیمات و عدالت و امور عامہ و امور دستوری (نواب علی یاور جنگ بہادر) ہیں جن کی بروقت بلکہ ہر وقت کی امداد کے بغیر کانفرنس کا انعقاد ہی ناممکن ہوتا۔

دوسرے نواب میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر ہیں جن کی رہنمائی و کار فرمائی سے قدم قدم پر کانفرنس متمتع ہوتی رہی۔ نیز مولوی عبداللہ پاشا صاحب کی فیاضانہ امداد کے بھی ہم ممنون احسان ہیں۔ ہم انجمن طیلسانیین جامعہ عثمانیہ کے بھی نہایت ممنون ہیں کہ اس کا دفتر، ہماری کانفرنس کا دفتر بنا رہا اور دیگر ہر طرح کی سہولتیں حاصل رہیں۔

نشریات کانفرنس کے اہتمام سے ایک مختصر لیکن جامع و باتصویر انگریزی رسالہ "قانون اور انصاف حیدرآباد میں" شائع کر کے جملہ مہمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ ہمارے سابق میر مجلس عدالت عالیہ آنریبل نواب مرزا یار جنگ بہادر کے ایک قابلانہ نوٹ پر مبنی تھا اور حیدرآباد کے قانون اور عدل گستری کی تاریخ پر مفید معلومات کا حامل تھا اور اب بھی بزم قانون جامعہ عثمانیہ سے بقیمت مل سکتا ہے۔

روزنامہ رہبر دکن حیدرآباد نے دوران کانفرنس میں ایک خصوصی نمبر شایع کیا جس میں حسب ذیل مضامین تھے اور بہت دلچسپی سے پڑھے گئے تھے (یہ بھی بزم قانون جامعہ عثمانیہ سے بہ قیمت مل سکتا ہے)

۱۔ عدالت اور قانونِ حیدرآباد از محمد مظہر صاحب معتمد حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

۲۔ حیدرآباد اور قانون۔ از خصوصی مقالہ نگار۔

۳۔ دکن کے خدمات قانونی۔ از ش۔ ر

۴۔ ہندو قانون کی تدوین میں دکن کا حصہ۔ از شیخ حید صاحب معتمد مقامی کل ہند کانفرنس قانون۔

کانفرنس کے موقع پر خود بزم قانون جامعہ عثمانیہ نے اپنی اکیس سالہ سرگذشت "تذکرۂ شعبۂ قانون" کے نام سے مرتب کی (اور اسی سے بقیمت مل سکتی ہے) اس میں حیدرآباد کی تاریخ عدل گستری و تعلیم قانون پر جامع تبصرہ ہے اور جامعۂ عثمانیہ کے شعبۂ قانون کے متعلق وہ حسب ذیل معلومات کی حامل ہے :۔

۱۔ حالات اساتذۂ شعبہ

۲۔ حالات میرانِ شعبہ

۳۔ جملہ اعزازی طیلسانیین قانون (جامعۂ عثمانیہ)

۴۔ جملہ ال ال ام عثمانیہ کے حالات

۵۔ جملہ ال ال بی عثمانیہ کے حالات

۶۔ بزم قانون کی بیس سالہ سرگذشت

کانفرنس کے لئے پانچ اعلامیے تمام ہندوستان میں اردو اور انگریزی میں شائع کئے گئے تھے۔ اب پہلے اجلاس کی روئداد شائع کی جارہی ہے (جو دفتر کانفرنس قانون جامعۂ عثمانیہ سے مل سکتی ہے)

آمد خرچ | ابھی حسابات کی باقاعدہ تنقیح نہیں ہوئی ہے اور نہ آخری مدوار تقسیم۔ بہرحال آمد و خرچ کا خلاصہ یہ ہے :۔

آمدنی	روپے	خرچ	روپے
۱۔ عطیۂ نواب امیر جامعہ	۱،۰۰۰	مصارف طباعت روئداد ہذا	؟
۲۔ عطیۂ صدر المہام تعلیمات	۱،۰۰۰	دورہ فراہمی چندہ	۱۲۶
۳۔ عطیہ صدر المہام عدالت و مذہبی	۱،۰۰۰	حمل و نقل	۲۹۹
۴۔ عطایا و فیس رکنیت	۵،۰۳۲	طباعت	۱۲۴۱
۵۔ مبادلہ از بزم قانون برائے آغاز انتظامات	۱۲۵	تنخواہ ملازمین	۲۷۰

	روپے
۶۔ خریدی نشریات کانفرنس از محکمہ اطلاعات	۵۰۰
۷۔ متفرق	۲۰۹
جملہ	۸۸۶۶

	روپے
بھتہ رضا کاران	۳۱۶
نمائش قانون	۷۰۰
جلسہ گاہ کانفرنس	۶۳۹
خرچ قیام مہمانان	۳۳۳
صادر	۵۱۶
متفرق	۱۰۱۹
حوالہ جامعہ برائے ظہرانہ	۱۰۰۰
واپس بزم قانون	۱۲۵
وصول طلب	۱۱۱
جملہ	۶۶۹۵
نقد یا بنک میں	۲۱۷۱
میزان	۸۸۶۶

کانفرنس کا مستقل دفتر شعبۂ قانون جامعۂ عثمانیہ میں قائم کیا گیا ہے جس کے متوالی اخراجات اس رقم سے (نیز آیندہ کانفرنسوں کی بچت سے) ہوتے رہیں گے۔

ارکان و معطیان کانفرنس کے معطیوں اور ارکان کی طبقہ وار فہرست حسب ذیل ہے:۔

(ملاحظہ ہو حصۂ انگریزی بر موقع)

دستور کانفرنس کی اولین تجویز کے ساتھ مقامی قانون دوست معززین کے ایک نمائندہ اجتماع کو دعوت دی گئی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو مجلس موسسین کانفرنس میں مبدل کرلیا اور ایک اساسی دستور منظور کیا کہ اس میں خود کانفرنس کی جانب سے آئندہ ترمیم ہونے تک اس پر عمل کیا جاتا رہے۔ وہ دستور اساسی یہ ہے:۔

اساسی قواعد ضوابط

کل ہند کانفرنس قانون

(منظورہ مجلس موسسین کانفرنس)

نام | دفعہ ۱ ۔ اس ادارہ کا نام کل ہند کانفرنس قانون (آل انڈیا لا کانفرنس) ہوگا۔

مقصد | دفعہ ۲ ۔ اس کا مقصد ہوگا کہ (۱ لف) قانونیات سے دلچسپی رکھنے والوں کو تماس کے ذریعے سے باہمی افادے اور استفادے کا موقع فراہم کیا جائے۔

(ب) قانونیات کی ترقی کے ممکنہ وسائل اختیار کئے جائیں۔

دفتر | دفعہ ۳ ۔ اس کانفرنس کا مستقل دفتر بزم قانون جامعہ عثمانیہ (لا یونین عثمانیہ یونیورسٹی) کے ہاں قایم ہوگا جو ایک مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) کی نگرانی میں کاروبار انجام دیگا۔

مجلس عاملہ | دفعہ ۴ ۔ اس کانفرنس کی ایک مجلس عاملہ ہوگی جسمیں پندرہ ۱۵ افراد ہونگے۔ صدر نائب صدر، معتمد۔ نائب معتمد۔ خازن اور دس ارکان۔

مجلس عاملہ کے فرائض | دفعہ ۵ ۔ (۱لف) جملہ ذیلی قواعد و ضوابط کانفرنس کا مدون کرنا۔

(ب) کانفرنس کے عمومی صدور کو منتخب کرنا۔

(ج) کانفرنس کے اجلاسوں کے شعبہ وار صدور کا انتخاب کرنا۔

(د) کانفرنس کے کاروبار پر نگرانی۔

(ھ) حسب گنجائش کانفرنس کے اجلاسوں کی رُوداد اور دیگر مستقل اور موقتی علمی کام قانونیات سے متعلق انجام دلانا۔

توضیح ۔ (۱) اساسی قواعد کی ہر ترمیم کے لئے مجلس اعیان (کونسل) کی منظوری ضروری ہے یہ منظوری بذریعہ گشت بھی لی جاسکتی ہے۔ (۲) پانچ ارکین کانفرنس اگر چاہیں تو مجلس قائمہ کے فیصلے پر پوری مجلس عاملہ کی نظر ثانی ہوسکیگی۔ (۳) ہر امر کا فیصلہ بہ غلبہ آراء کیا جائیگا۔

مجلس قائمہ (اسٹانڈنگ کمیٹی) | **دفعہ ۶۔** حسب متذکرۂ دفعہ ۴ جو مجلس عاملہ ہوگی اس میں سے نائب صدر نائب معتمد، خازن اور دو ۲ ارکان ملکر مجلس قائمہ کہلائینگے۔

توضیح۔ ارکین مجلس قائمہ کا ساکنان شہر حیدرآباد دکن سے ہونا ضروری ہے۔

نوٹ:۔ اولین مجلس قائمہ کا انتخاب بزم قانون جامعۂ عثمانیہ کرے گی اور ہر خالی ہونے والی جگہ کو مابقی افراد مجلس قائمہ پر کرلیا کرینگے۔ مابقی مجلس عاملہ کا انتخاب ہر کانفرنس کے اختتام پر مجلس اعیان کریگی۔

مجلس قائمہ کے فرائض | **دفعہ ۷** (الف) کانفرنس کے روزمرہ کے کاروبار انجام دینا۔

(ب) کانفرنس کے جملہ ریکارڈ کو محفوظ رکھنا۔

(ج) کسی شخص کو کانفرنس کا رکن بنائے جانے کی منظوری دینا۔

(د) اس بات کا فیصلہ کیا کرنا کہ کس امر کیلئے مجلس عاملہ کی رائے بذریعہ گشت لی جائے۔

توضیح۔ ارکین کانفرنس کو انکے تحریکات کے متعلق مجلس قائمہ کے فیصلہ سے اطلاع دی جایا کریگی۔

مجلس اعیان (کونسل) | **دفعہ ۸۔** اسمیں (الف) مجلس عاملہ اور (ب) ہر وہ رکن کانفرنس داخل سمجھا جائیگا جس نے کانفرنس کے کم از کم (۳) اجلاسوں میں مقالے پڑھے ہوں۔

نوٹ:۔ پہلے دو اجلاسوں کے مقالے پڑھنے والے شرکائے کانفرنس اپنے میں سے زیادہ سے زیادہ ۲۵ ارکان کو بطور مجلس اعیان (کونسل) انتخاب کرینگے۔

رکنیت کانفرنس قانون | **دفعہ ۹۔** (۱) اس کانفرنس کا ہر وہ شخص رکن ہوسکیگا جسے قانون سے دلچسپی ہے و نیز جسکی شرکت مجلس قائمہ منظور کرے اور جو ہر میقات کی بابت (۳) روپے پیشگی چندہ ادا کرے۔

نوٹ:۔ زیر تعلیم طلبار قانون سے صداقت نامہ پیش کرنے پر ایک تہائی چندہ لیا جائیگا۔

توضیح۔ "میقات" کانفرنس کے ایک اجلاس سے دوسرے اجلاس تک متصور ہوگی۔

کون اشخاص کانفرنس کی مجالس عاملہ و اعیان کے رکن ہو سکتے ہیں | دفعہ ۱۰۔ صرف وہی اشخاص کانفرنس کی مجلس عاملہ و اعیان کے رکن ہو سکتے ہیں جو کانفرنس کے رکن ہوں۔

کانفرنس کا اجلاس | دفعہ ۱۱۔ اس کانفرنس کا اجلاس کسی حکومت یا مستند ادارے کی دعوت پر کم ازکم دو سال میں ایک مرتبہ کسی ایسے مقام پر منعقد ہوگا جسکا فیصلہ کانفرنس کی مجلس عاملہ کریگی۔

توضیح۔ کانفرنس کے اجلاس حسب ضرورت شعبوں میں تقسیم ہوکر منعقد ہو سکینگے۔

جلسوں کی کارروائی | دفعہ ۱۲۔ جلسوں کی کارروائی حساب کتاب اور دیگر انتظامات میں وہی طریقے ملحوظ رہینگے جو عام طور پر مماثل علمی مجالس میں مروّج ہیں۔ فقط

اس دستور کی پیش رفت میں جو مجالس منتخب ہوئی ہیں وہ یہ ہیں۔

مجلس عاملہ | مجلس قائمہ کے علاوہ :—

۱۔ صدر ۔ سر موریس گایر۔ دہلی
۲۔ معتمد ۔ مسٹر ال۔ آر۔ سیواسبرامنین بنارس
۳۔ رکن سر سی پی رام سامی ایر تریونڈرم
۴۔ " سر عبدالقادر بغداد الجدید
۵۔ " سر تیج بہادر سپرو الہ آباد
۶۔ " مولوی آصف فیضی بمبئی
۷۔ " ڈاکٹر حامد علی مدراس
۸۔ " مسٹر سی ٹی بھاناگے ناگپور
۹۔ " دیوان بہادر اروامدو اینگار حیدرآباد
۱۰۔ " مولوی اکبر علی خاں حیدرآباد

مجلس قائمہ | ۱۔ نائب صدر ۔ پروفیسر حسین علی مرزا صدر شعبۂ قانون جامعۂ عثمانیہ
۲۔ نائب معتمد ۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ استاذ قانون جامعۂ عثمانیہ

۳- خازن - مولوی میر اکبر علی موسوی صاحب استاذ قانون جامعۂ عثمانیہ

۴- رکن - ڈاکٹر ناظر یار جنگ

۵- رکن - راجہ بہادر بشیشر ناتھ واگھرے میر شعبۂ قانون جامعۂ عثمانیہ

مجلس اعیان | مجلس عاملہ و مجلس قائمہ کے علاوہ ارکان ذیل :-

۱- ڈاکٹر امین جنگ بہادر

۲- ڈاکٹر میر سیادت علی خاں

۳- مسٹر ام بی ڈکشیٹ (ناگپور)

۴- مسٹر وی سوریا نرائن راؤ

۵- پنڈت گنڈے راؤ (گدوال)

۶- مولوی وحید اللہ خاں

۷- مولوی محمد فاروق

۸- مسٹر نرسھوان راؤ

۹- مولوی محمد عبد الروف

۱۰- مولوی سید بشیر احمد

۱۱- مولوی محمد عبد الستار

۱۲- مولوی شیخ حیدر۔

قرار دادیں | کانفرنس نے جو قرار دادیں منظور کیں وہ حسب ذیل ہیں :-

ترجمۂ قرار دادہائے کانفرنس

(۱) قرار پایا کہ کانفرنس کے مستقل کام کے لئے حسب ذیل شعبہ وار مجالس کی تشکیل عمل میں لائی جائے :-

(الف) مجلس اساتذۂ قانون جو ہندوستانی جامعات کے شعبۂ ہائے قانون کے لئے

ایک انجمن اتحاد کا کام دیگی۔

(ب) مجلس وکلاء ہندوستان کے وکلاء میں ارتباط کی کوشش کریگی اور پورے ملک کے لئے ایک مرکزی نظام کا کام دیگی۔

(ج) مجلس طلبۂ قانون ہندوستان کی مختلف جامعات کے طلبۂ قانون کی انجمنوں میں ایک ارتباط پیدا کرنے والے نظام کا کام دیگی۔

(د) مجلس علمی جو قانون میں تحقیقاتی کام کو آگے بڑھائیگی۔

(۲) قرار پایا کہ امتحان بی۔اے کے اختیاری مضامین میں اصول قانون کو داخل کرنے کا مسئلہ مجلس اساتذۂ قانون کے پاس غور اور اظہار رائے کے لئے روانہ کیا جائے۔

(۳) قرار پایا کہ اصولاً یہ امر ضروری ہے کہ عوام کو روزمرہ کے مفاد کے قانون کی واقفیت رضاکارانہ طور پر اساتذۂ قانون اور وکلاء کی جانب سے مہیا کی جائے۔

(۴) قرار پایا کہ قانونی عہدوں کے لئے ہندوستان کے مختلف حصوں میں یکساں نام دیئے جائیں۔ (مثلاً لفظ اڈوکیٹ مختلف عدالت ہائے عالیہ میں مختلف اغراض کے لئے مستعمل نہ ہو)

(۵) قرار پایا کہ یہ مسئلہ مجلس اساتذۂ قانون کے پاس غور اور اظہار رائے کے لئے بھیجا جائے کہ قانون کی ڈگری کے لئے جو طلبہ قبول کئے جائیں وہ کس قدر قابلیت رکھیں۔

(۶) قرار پایا کہ اس کانفرنس کی رائے میں ہندوستانی جامعات میں آیندہ مشرقی اصول قانون کے مطالعے اور تحقیق پر اب سے زیادہ توجہ کی جائے۔

(۷) قرار پایا کہ ملک کے مختلف منطقہ وار مرکزوں میں اس غرض کے لئے سرمائے فراہم کئے جائیں کہ غریب اور مستحق طلبہ قانون کو بے سودی قرضوں کے ذریعے سے مدد دی جائے۔

(۸) قرار پایا کہ کانفرنس سفارش کرتی ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں مجالس کا قیام رضاکارانہ اساس پر عمل میں لایا جائے تاکہ غریب لوگوں کو قانونی مشورہ اور ان کی

جانب سے وکالت کا انتظام عمل میں آسکے۔

(۹) قرار پایا کہ سینیر اور جونیر وکلاء کے تعلقات کا مسئلہ مجلس وکلاء کے پاس غور اور اظہار رائے کے لئے روانہ کیا جاسکے۔

(۱۰) قرار پایا کہ یہ کانفرنس جملہ ہندوستانی جامعات سے سفارش کرتی ہے کہ شناخت کے مختلف شعبوں (مثلاً خط، انگوٹھوں کے نشان، آتشی اسلحہ، خون کے دھبے، ریت، غبار وغیرہ) کی تعلیم کا انتظام ال ال بی کے نصاب میں کم از کم اختیاری مضمون کے طور پر شروع کرائیں اور اس کے پیش خیمے کے طور پر ان مضامین پر توسیعی خطبات کا انتظام کرائیں۔

(۱۱) قرار پایا کہ یہ کانفرنس حکومت سرکار عالی سے استدعا کرتی ہے کہ وہ اس کانفرنس کے متعلق اپنی امداد اور سرپرستی کو جاری رکھے تاکہ وہ قانون کی ترقی میں ملک کی مفید خدمت کرسکے اور عدل گستری عمل میں آنے میں مدد دے سکے۔

(۱۲) قرار پایا کہ یہ کانفرنس شعبۂ قانون جامعۂ عثمانیہ کی اس تجویز کا خیر مقدم کرتی ہے کہ قانون کے حکمیاتی مطالعے کو ترقی دینے کے لئے قوانین عالم کا ایک سالنامہ جامعۂ عثمانیہ کی سرپرستی میں شائع کیا جائے اور اس مجوزہ اشاعت میں اپنی پوری مدد دینے آمادہ ہے۔

(۱۳) قرار پایا کہ یہ کانفرنس اس تجویز کا خیر مقدم کرتی ہے کہ عثمانیہ لا ریویو کے نام سے حیدرآباد سے ایک قانونی رسالہ شائع کیا جائے اور جملہ اقطاع ہند کے ماہرانِ قانون سے اپیل کرتی ہے کہ اپنے قیمتی مقالات سے اس رسالے کی مدد کریں۔

(۱۴) قرار پایا کہ یہ کانفرنس سر عبدالقادر کے قابل قدر خدمات کے متعلق جو انہوں نے اس کی کارروائیوں کو کامیاب اختتام تک پہنچانے میں انجام دیں اپنے احساس تشکر کو ثبت کرتی ہے۔

(۱۵) قرار پایا کہ یہ کانفرنس کارکنان کانفرنس کے خدمات کو قدر کی نظر سے دیکھتی ہے جنہوں نے کانفرنس کو کامیاب بنایا۔

ثر حد تخط سر عبدالقادر
صدر کانفرنس

مجالسِ ذیلی

قرار داد ۶ کی پیش رفت میں کانفرنس نے حسب ذیل مجالس کا انتخاب کیا اور ہر مجلس کو اختیار دیا کہ مزید ارکان کا انتخاب وہ خود کرلیں :۔

۱۔ مجلس اساتذۂ قانون :۔

ڈاکٹر ناظر یار جنگ

پرنسپل سیوا سبرامنین (داعی)

ڈاکٹر حمید اللہ

۲۔ مجلس وکلاء

بی۔این۔چوبے (داعی)

نواب میر اکبر علی خاں

سوریا نارائن راؤ

سی۔ٹی بھاناگے

۳۔ مجلس تحقیقات

ڈاکٹر ناظر یار جنگ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

سیوا سبرامنین

شیخ حیدر (داعی)

۴۔ مجلس طلبۂ قانون

غلام حسن علی (داعی)

نظام العمل | نمائش قانون اور کانفرنس قانون کا نظام العمل حسب ذیل رہا :۔

(دیکھو حصۂ انگریزی)

اعتذار | یہ امر قابل ذکر ہے کہ کانفرنس کے لئے سر موریس گایر تشریف لاتے تھے لیکن یکایک علالت نے ان کو آنے سے روک دیا اور ان کی جگہ سر عبدالقادر چیف جسٹس بغداد الجدید سے صدارت عمومی کی درخواست کی گئی جسے موصوف نے وقت کی بڑی کمی کے باوجود خندہ پیشانی سے قبول فرمایا۔ سر راما سامی اپر دیوان ٹراونکور نے بھی دم آخر اپنا سفر بعض سرکاری مفاجاتی مصروفیتوں کے باعث ملتوی کر دیا۔ البتہ ان دونوں نے اپنے گراں پایہ مقالے کانفرنس کو بھیج دیئے تھے جو صدر عمومی نے خود پڑھ کر سنائے۔ ایک اور نشست کے صدر دیوان بہادر ار وامدوا اینگار صاحب کو بھی حیدرآباد سے یکایک سفر کرنا پڑا اور ان کی جگہ راتوں رات مولوی میر اکبر علیخاں بیرسٹر کو اپنا خطبۂ صدارت مرتب کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بجائے چار کے سات خطبہ ہائے صدارت شریک رُوداد ہیں۔

جو مقالے کانفرنس میں سُنائے گئے یا وصول ہوئے تھے وہ سب کے سب افسوس ہے کہ کاغذ کے قلت کے باعث شائع نہیں کئے جا سکتے۔ بعض کی اشاعت اسلئے بھی نہیں کی گئی کہ مقالہ نگار اُن کو خود شائع کرا رہے ہیں یا کرا چکے ہیں۔ مقالات شائع شدہ کے آخر میں ہم ان مقالوں کا عنوان درج کر رہے ہیں جو مذکورہ وجوہ سے یہاں شامل نہیں کئے گئے ہیں۔

حصۂ سوم

نمائشِ قانون

نمائش قانونی کا عام خاکہ

۱۔ قدیم مخطوطات قانون خاص کر عربی اور سنسکرت میں
۲۔ تاڑ کے پتوں پر لکھی ہوئی قدیم دکھنی قانونی کتابیں
۳۔ سوینے پرائز یافتہ کتابیں
۴۔ ٹیگور لا لکچرس کاسٹ
۵۔ رسائل و مجلات قانون، اور ارتقائے قانون عالم کی پیمائشیں۔
۶۔ کانفرنس ہائے قانون، قدیم و جدید
۷۔ کمیشن ہائے قانون اور ان کی رپورٹیں۔
۸۔ راؤ کمیشن اور ہندو قانون کی تدوین۔
۹۔ دوران جنگ کے قوانین و احکام۔
۱۰۔ وکلاء اور طیلسانیین قانون کے کل ہند اعداد و شمار
۱۱۔ آلہ ہائے سزا، قدیم و جدید
۱۲۔ قدیم قانونی کتبے (حمورابی، اشوک وغیرہ)
۱۳۔ معاہدے، اسناد، عطیات وغیرہ۔
۱۴۔ قدیم عدالتی فیصلے، دستاویزیں وغیرہ
۱۵۔ متاکشرا لٹریچر
۱۶۔ عدل گستری کے قدیم طریقے (تصاویر)
۱۷۔ قانون حیدرآباد میں۔
۱۸۔ حیدرآبادی حکام عدالت و وکلاء کی قدیم تصویریں
۱۹۔ شعبۂ قانون جامعۂ عثمانیہ سے متعلقہ یادگار تصویریں وغیرہ۔

۲۰۔ طب قانونی (میڈیکل جوریس پروڈنس)

۲۱۔ تفتیش جرائم، قدیم و جدید، نشان انگشت، خون وغیرہ

۲۲۔ حادثۂ تصادم موٹر کا ایک مصنوعی ماڈل

نمائش قانونی

(روزنامۂ رہبر کے خصوصی ناظر کے قلم سے)

کل ہند موتمر قانون کے، اپچ بھرے اور نوعمر کارکنوں نے جب نمائش قانونی کا اعلان کیا تو سنجیدہ لوگوں نے طنزیہ مسکراہٹ ہی سے اس کا استقبال کیا ہوگا۔ لیکن ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ جب اپنی نوعیت کی اس پہلی چیز کا ہم نے معائنہ کیا تو ہمیں نظر آیا کہ اس بظاہر نہایت محدود اور انتہائی خشک دنیا میں بھی کیا کچھ نہ وسعت اور دلآویزی ہے کہ غیر فن داں عوام بھی اس سے دلچسپی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

نمایش کا داخلہ اس اثر انداز ربانی حکم کے قطعے سے ہوتا ہے کہ "جب تم فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو"۔ اور پہلا کمرہ عدلیہ حیدرآباد کا مظاہرہ کرتا ہے کہ سابق میں انصاف رسانی کا کیا طریقہ تھا۔ کس کس قسم کی عدالتیں تھیں اور اب کیا ہے۔ حالیہ طریقے میں بھی دور عثمانی اور ادوار ماسبق کا تقابلی مظاہرہ بڑے بڑے نقشوں کے ذریعے سے کیا گیا ہے۔ ترقیات عدل و قانون کے اعداد و شمار کے تختے بڑے سبق آموز ہیں۔

اس کے بعد تفتیش مقدمات کا شعبہ ہے جس میں جرائم کی دریافت کے جدید ترین طریقے اور آلے بڑی خوبی سے سجائے گئے ہیں۔ ان سے آدمی باہر نکل کر گیلری میں آتا ہے تو قرون متوسط کے یورپی انصاف کے نقشے آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ لفظی بحثوں میں زندہ جلانا، ہڈیاں کچلنا، اعضا میں سوراخ ڈالنا وغیرہ وہیں ایک خاموش تقابل اسلامی دفعات سے کیا گیا ہے کہ شرع اسلامی میں سخت ترین جسمانی سزا بس اسی حد تک محدود ہے۔

یہیں قرطبہ و بغداد کے قدیم اجلاس ہائے عدالت کی نایاب تصویریں نظر آتی ہیں۔

آگے حیدر آباد کے چند اہم قانونی اداروں کا کام سامنے آتا ہے۔ دائرۃ المعارف جامعہ عثمانیہ اور احیاء المعارف النعمانیہ کے عربی نشریات، دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ کے قانونی تراجم، کتب خانہ سعیدیہ کے نایاب مخطوطات وغیرہ۔ یہاں ایک بڑا سبق آموز مظاہرہ تھا کہ ایک مولف کی تین کتابیں رکھی گئی ہیں۔ ایک تیس جلدوں میں کئی ہزار صفحوں کی۔ ایک چار جلدوں میں دو ہزار صفحوں کی اور ایک غیر مطبوعہ تقریباً ہزار صفحوں میں اور لکھا تھا کہ ایک مشہور فقیہ شمس الائمہ سرخسی کو سیاسی وجوہ سے کئی سال تک ایک کوئیں میں قید رکھا گیا تھا اور وہ منڈیر پر جمع ہونے والے طلبہ کو اندر سے جو زبانی لکچر کا املا کرایا کرتے تھے وہ ان دس پندرہ ہزار صفحوں میں سما سکے اور آج تک فقہ اور اصول فقہ اور قانون بین الممالک پر آخری لفظ ہیں۔

یہ معلوم کر کے اور حیدر آبادی وکلا کے پرانے سج دھج اور تالیفوں کو دیکھ کر آگے بڑھتے ہیں تو جامعۂ عثمانیہ کے قانونیات کا اثر انداز مظاہرہ ہوتا ہے۔ قسم قسم کے ادق سے ادق مباحث پر تالیفیں، تازہ ترین مسایل پر مقالے، پانچ پانچ زبانوں میں تالیفیں کرنے والے افراد کے کارنامے وغیرہ۔ دو تقابلی ذخیرے بھی جمع کئے گئے ہیں۔ ایک "ٹیگور لا لکچرس" جو جامعہ کلکتہ کی طرف سے ہر سال چھپتے ہیں اور دوسرے سوینے پرائزکی کتابیں کہ جس طرح سائنس و ادبیات و امن نوازی کے لئے نوبل پرائز ملتا ہے، اسی طرح دنیا کے قانون میں ہر پانچ سال میں ایک مرتبہ سوینے پرائز بہترین مطبوعہ قانونی کتاب پر دیا جاتا ہے۔ یہ انعام ایک سو اشرفی نقد اور مزید برآں اتنی ہی مالیت کے ایک سنہری پیالے پر مشتمل ہوا کرتا ہے اور سنہ ۱۹۴۲ء کا تازہ ترین انعام پروفیسر آسلین کی تالیف "لا ان دی میکنگ" پر ملا ہے جو وہاں نمایاں کی گئی ہے۔

ایک اور کمرے میں قوانین کا ارتقا بھی نظر آتا ہے۔ بابل کے حمورابی کا مجموعۂ قوانین

جو پتھر پر کندہ ملا ہے، ارسطو کا دستور شہر ایتھنس جو جھلی پر ملا ہے۔ قدیم سنسکرت نایاب مخطوطات جو دھرم شاستر پر ہیں اور جامعہ عثمانیہ سے آئی ہیں اسی کے ساتھ اسلامی قوانین کے بعض دلچسپ پوسٹر مثلاً دنیا کا سب سے پہلا دستور مملکت۔ عہد نبوی کی اہم دستاویز "مشابہہ فقہ کا چارٹ کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، اثنا عشری زیدی وغیرہ سب استاد شاگرد کے مسائل ہیں جو آزادی رائے کے زندگی بخش اصول پر مبنی ہیں نہ کہ سر پھٹول کا سامان اور باہمی جدال و قتال اور مخالفت پر مبنی ہوں۔

دکن میں فقہ کا شاندار مظاہرہ تغلق دور کے فتاوٰی تاتار قانیہ کے مکمل سات جلدی نسخے اور اس سے بھی قدیم تر ملک کافور کے لئے مرتب کردہ فتاوٰی کافوریہ سے ہوتا ہے۔

اس کو دیکھکر بہت سے تازہ معلومات لئے ہوئے ناظر خوش خوش رخصت ہوتا ہے۔

سر عبدالقادر نمائش قانونی میں حیدرآباد ۲۱ شہریور سر عبدالقادر نے نمائش کا معائنہ فرمایا اور اس کا ذکر اپنی صدارتی تقریر میں بھی کیا۔

"میزان عدل" میں حضرت بندگانعالی کے پچیس سالہ دور میمنت میں سررشتہ عدالت کے ہر شعبہ (یعنی مرجوعہ، منفصلہ، دوران مقدمات، آمدنی، خرچ، تعداد و اختیار عہدہ داران تعداد امکنہ، کتب قانونی و تعداد وکلاء) میں جو نمایاں اضافے ترقیات و اصلاحات عمل میں آئے ہیں ان کو بتلایا گیا ہے۔ اس کے بعد سر عبدالقادر کی خدمت میں "تاریخ عدالت آصفی" کو بطور تحفہ پیش کیا گیا۔

یہ تصنیف ۱۱۳۷ھ سے ۱۳۵۵ھ تک یعنی دو سو برس سے زیادہ کے دور آصفی کی عدالتی تاریخ ہے۔ اس دو سو برس میں تقریباً ایک سو سال ایسے گذرے ہیں جس میں یہاں اسلامی طریقہ عدل گستری رائج تھا اور بوجہ فقدان ماخذات اس کے حالات کی تحریر میں اختصار سے کام لیا گیا ہے البتہ اس کے بعد کے سو برس کے حالات جبکہ مثل برطانوی ہند یہاں بھی جدید طرز کی عدالتوں کا قیام وارتقاء عمل میں آنے لگا، زیادہ شرح و بسط سے لکھے گئے ہیں۔ اس کو زیادہ دلچسپ

بنانے کے لئے بعض معروف ہستیوں اور مشہور عدالتی عمارات کے علاوہ دیگر متعلقہ تصاویر بھی دی گئی ہیں۔ نمائش میں ۴۰ سال قبل کے امثلہ بھی ہیں۔ (دکن نیوز مطبوعہ روزنامہ رہبر حیدرآباد)

معاونان نمائش قانونی

حسب ذیل حضرات اور ادارات کی جانب سے نمائش کے لئے سامان مستعار وصول وصول ہوا تھا جس کے لئے کانفرنس ان سب کی تہ دل سے ممنون ہے ۔

شمار	نام	نوعیت سامان
۱	کتب خانہ جامعۂ عثمانیہ	پتوں پر لکھے ہوئے قدیم قانونی مخطوطات سنسکرت، کنڑی، تلنگی وغیرہ
۲	کتب خانہ شعبۂ قانون جامعۂ عثمانیہ	قلمی اور مطبوعہ کتب
۳	بزم قانون جامعۂ عثمانیہ	فوٹو، تاریخی مناظر، دستاویزیں، آثار قدیمۂ قانونی، قرون متوسط کا یورپی الاحتساب
۴	عدالت العالیہ سرکار عالی	اصل منشور شاہی۔ قدیم گروپ فوٹو۔ قدیم مثلیں اور فیصلے۔ چارٹ نظام عدلیہ
۵	محکمۂ اعداد و شمار سرکار عالی	معلومات قانونی کے چارٹ۔
۶	کتب خانہ سعیدیہ جام باغ	عربی مخطوطات قانونی۔
۷	انجمن اشاعت العلوم شبلی گنج	قانونی نشریات
۸	دفتر رسالہ دکن لارپورٹ	ایضاً
۹	دفتر چیف کیمسٹ سرکار عالی	طب قانونی کا سامان
۱۰	انجمن احیاء المعارف النعمانیہ (جلال کوچہ)	فقہ حنفی کے مخطوطات کے فوٹو یا اصل نیز اپنے نشریات
۱۱	دائرۃ المعارف جامعۂ عثمانیہ	اپنے نشریات
۱۲	مولانا سید محمد بادشاہ حسینی صاحب	مخطوطات قانونی عربی و فارسی
۱۳	نواب عنایت جنگ بہادر	ایرانی آثار قانون
۱۴	ڈاکٹر ناظر یار جنگ بہادر	کتب۔ آثار قدیمۂ قانونی، فوٹو
۱۵	مسٹر بھاناگے (ناگپور)	طب قانونی کا سامان

نمبر	نام	سامان
۱۶	مسٹر ڈکشیٹ (ناگپور)	طب قانونی کا سامان
۱۷	جسٹس باسط علی خاں صاحب	قانون حیدرآباد کے متعلق تاریخ و سامان
۱۸	ڈاکٹر میر سیادت علی خاں صاحب	کتب
۱۹	ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب	قدیم درہ۔ کتب، سامان قانون۔ چارٹ۔ تاریخ فقہ۔ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور
۲۰	ڈاکٹر محمد صدیق صاحب (کیمیکل اگزامنر)	طب قانونی۔ قدیم آلات سزادہی وغیرہ۔
۲۱	مولوی سید قلندر حسین صاحب وکیل	کتب قانونی
۲۲	مسٹر بی۔ این چوبے صاحب وکیل	〃
۲۳	مولوی محمد غوث صاحب	〃
۲۴	رائے ستگرو پرشاد صاحب	〃
۲۵	مسٹر ویرپاک شیپا صاحب	〃
۲۶	مولوی انوار اللہ صاحب	〃
۲۷	مولوی ابوالخیر کنج نشین صاحب	〃
۲۸	مولوی سید خواجہ صاحب	〃
۲۹	مسٹر سوریا نرائن راؤ صاحب	〃
۳۰	مسٹر لکشمی نرسیا صاحب	〃
۳۱	مولوی ذکاء اللہ صاحب	〃
۳۲	مسٹر ایچ گنڈے راؤ صاحب	〃
۳۳	مسٹر سرینواس راؤ صاحب	〃
۳۴	مولوی محمد بدرالدین خاں صاحب	قوانین حیدرآباد کے مختلف چارٹ
۳۵	مولوی خواجہ محمد احمد صاحب	قانون سے متعلق قدیم فوٹو۔ شوکیس وغیرہ
۳۶	ڈاکٹر قاسم حسین صاحب صدیقی باروٹر بلدہ	سامان طب قانونی
۳۷	مولوی شیخ حیدر صاحب	کتب
۳۸	انجمن اشاعت العلوم	〃

تمت

(نظام دکن پریس بازار عیسیٰ میاں)

50. 1920— Subramanyam, Pillai, The Principles of Criminology with special Reference to their Application in India.
51. 1921— Karunamay Basu, Modern Theories of Jurisprudence.
52. 1922— Garner, Development of International Law in the Twentieth Century.
53. 1923— J. H. Marsan, Fedaralism within the British Empire with special Reference to India.
.... 1924—Nil.
54. 1925— R. Pal, The History of the Law of Primogeniture with special Reference to India, Ancient and Modern.
55. 1926—Allen, Sources of Law.
56. 1927—D. F. Mulla, The Principles and History of the Law of Insolvency with special Reference to India and Indian Practices.
57. 1928— P. H. Winfield, The Province of the Law of Torts.
58. 1929—Dr. P. K. Sen, Penology Old and New.
59. 1930—R. Pal, The History of Hindu Law in the Vedic Age and in Post-Vedic Times down to the Institutes of Manu.
60. 1931—McNair, British Air Law.
.... 1932—Nill.
61. 1933—James Mackintosh, Some Principles of Roman Law in Modern Practice.
.... 1934—Nil.
.... 1935—Nil.
.... 1936—Nil.
62. 1937— Holdsworth, Some Makers of English Law.
63. 1938— Alladi Krishnaswami Ayyar, Law relating to Statutory and other Powers.
.... 1939—Nil.
.... 1940—Nil.
64. 1941—N. N. Sarkar, The Law of Arbitration in British India.
.... 1942—Nil.
.... 1943—Nil,
.... 1944—Nil.
.... 1945—Nil.

30. 1900—Jogeshchandra Ray, The Law relating to Torts in British India.

31. 1901—Shelly Banarji, The Law of Interpretation of Deeds and Statutes in British India.

32. 1902—Shamsulhuda, The Law of Crimes in British India.

33. 1903—S. R. Dass, The Ultra Vires.

34. 1904—J. C. Ghosh, The Hindu Law of Imparitable Property, including the Law of Endowments, 2 Vols.

35. 1905—K. L. Sarkar, The Rules of Interpretation in Hindu Law, with Special Reference to the Mimansa Apherisms as applied to Hindu Law.

36. 1906—Satischandra Banarji, The Law of Specific Relief in British India.

37. 1907—Sir Abdur Rahim, The Principles of Muhammadan Jurisprudence, according to Hanafite, Malikite, Shafi'ite and Hanbalite Schools.

38. 1908—Sarapati Roy, Customs and Customary Law.

39. 1909—P. Sen, The General Principles of Hindu Jurisprudence.

40. 1910.—Remfry, Mercantile Law and Usage, including the Law of Sale of Goods with special reference to India.

41. 1911—A. Suhrawardy, History of Muslim Legal Institutions with special Reference to the Law of Waqf.

42. 1912—B. K. Acharayya, Codification in British India.

43. 1913—S. C. Dutt, Law of Compulsory Sales in India.

44. 1914—S. C. Bagchi, Principles of Law of Corporations with special Reference to India.

45. 1915—Henry Solus, The Spirit of French Civil Law

36. 1916—P. K. Sen, The Law of Monopolies in British India.

47. 1917—Jayswal, Manu and Yajnavalkya, a comparison and contrast.

48. 1918—N. N. Ghosh, Comparative Administrative Law, with special Reference to the Organisation and legal Position of the Administrative Authorities in British India.

49. 1919—W. W. Willoughby, The Fundamental Concepts of Public Law.

9. 1879—Trilokyanath Mitra, The Law relating to the Hindu Widow.
10. 1880—R. Sarvadhikary, The Principles of Hindu Law of Inheritance.
11. 1881—Agnew, The Law of Trusts in British India.
12. 1882—Upendranath Mitra, The Law of Limitation and Prescription in British India, Vol. I.
    Do do do Vol. II.
13. 1883—Jolly. Outlines of a History of the Hindu Law of Partition, Inheritance and Adoption.
14. 1884—Ameer Ali, Mohammedan Law, the law relating to Gifts, Trusts, and Testamentary Disposition among the Mohammedans, 2 Vols.
15. 1885—Krishnakamal Bhattacharya, The Law relating to the Joint Hindu Family.
16. 1886—K. M. Chatarjee, The Law relating to Transfer of Immovable Property inter vivos.
17. 1887—G. Henderson, The Law relating to Wills in India.
18. 1888—G. Sarkar, The Law of Adoption in India
19. 1889—Lalmohan Dass, The Law of Riparian Rights, Alluvian and Fishery.
20. 1890—Pearson, The Law of Agency in British India.
21. 1891—Prannath Sarasvati, The Hindu Law of Endowments.
22. 1892—Mohammed Eusuff, The Mohommedan Law relating to Marriage, Legitimacy and Guardianship according to the Sunnis, 3 Vols.
23. 1893—Casparesz, The Law of Estoppel in British India.
24. 1894—Pollock, The Law of Fraud, Misrepresentation and Mistake in British India.
25. 1895—Sardacharan Mitra, The Land Law of Bengal.
26. 1896—P. Mitra, The Law of Joint Property and Partition in British India.
27. 1897—Woodroffe, The Law relating to Injunctions and Receivers in British India, 2 Vols.
28. 1898—Sir Ashutosh Mukarji, The Law of Prepetuities in British India.
29. 1899—Peacock, The Law of Easements in British India.

18. 1934—Prof. Sir William Holdsworth, ***A History of English Law.***
19. 1939—John Glaister, and J. C. Brash, ***Medico-Legal Aspect of the Ruxton Case.***
20. 1944—Centenary Prize, Prof. Allen, ***Law in the Making.***

LIST OF TAGOR LAW LECTURES.

Prasunno Coomar Tagore, who died on 30th August 1868, bequeathed by his will to the University of Calcutta a sum of money out of the income of which Rs. 9000/- are to be paid annually to the "Tagore Law Professor". The lectures are to be printed and not less than 500 copies are to be distributed gratuitously. If still any amount remains out of the annual interest of the invested money, it is to be spent in defraying the expenses of printing and publication of approved works on jurisprudence.

Here is an upto date list of these lectures, some of which, however, have not been yet printed :

S. No.	Year.	Author and Title.
1.	1870—	Cowell, Hindu Law, being a Treatise on the Law administered exclusively to Hindus.
	1871—	Do.
2	1872—	Cowell, The History and Constitution of Courts and Legislative Authorities in India.
3.	1873—	Shamacharan Sarkar, Mohammedan Law, being a Digest of the Sunni Code.
4.	1874—	Do. Digest of the Sunni Code in Part and of the Imamiya Code.
5.	1875—	A. Phyllips, Law relating to Land Tenures in Lower Bengal.
6.	1876—	Rashbehary Ghosh, The Law of Mortgage in India, Vol. I.
		Do do do Vol. II.
7.	1877—	Trevelyan, The Law relating to Minors in Bengal.
8.	1878—	Gurudas Banerji, The Hindu Law of Marriage and Stridhan.

SWINEY PRIZE WORKS

&

TAGORE LAW LECTURES.

As the complete chronologically arranged lists of these works are not easily available, we think it useful to reproduce them for general reference For the list of Tagore Law Lectures we are obliged partly to the Registrar of the University of Calcutta. :: ::

SWINEY PRIZE WORKS.

1. 1849—J. A Paris, and J. Fonblanque, *Medical Jurisprudence.*
2. 1854—Leone Levi, *The Commercial Law of the World.*
3. 1859—Dr Alfred Swayne Taylor *Medical Jurisprudence.*
4. 1864—Sir Henry Sumner Maine, *Ancient Law.*
5. 1859—William Augustus Guy, *Principles of Forensic Medicine.*
6. 1874—The Rt. Hon. Sir Robert Philimore, *Commentaries on International Law.*
7. 1879—Dr. Norman Chevres, *Manual of Medcil Jurisprudence of India.*
8. 1884—Sheldon Amos, *Science of Jurisprudence.*
9. 1889—Charles Maymott Tiddy, *Legal Medicine.*
10. 1894—Thomas Erskine Holland. *The Elements of Jurisprudence.*
11. 1899—J. Dixon Mann, *Forensic Medicine.*
12. 1904—Sir Fredrick Pollock, and Prof. Maitland, *The History of English Law before Edward I.*
13. 1909—Dr. Charles Mercier, *Criminal Responsibility.*
14. 1914—Sir John Salmond, *Jurisprudence.*
15. 1919—Charles Mercier, *Crime and Criminals.*
16. 1924—Sir Paul Vinogradoff, *Outlines of Historical Jurisprudence.*
17. 1929 Sidney Smith, *Forensic Medicine.*

Another section was occupied by law books, dozens in number, published in Urdu by the Translation Bureau of the Osmania University. There were translations from German, French, English, Arabic and Persian in this collection.

The Exhibition lasted for a week and was enthusiastically reported by local press.

Another shelf exhibited the Tagore Law lectures published by the University of Calcutta and which contain some of the world's classics.

Two rooms were occupied by exhibits on criminal investigation, finger prints, detection of forgery and allied subjects recognised by our courts for purposes of administering justice very kindly lent by Mr. Bhanagay and Mr. Dixit of Nagpur. Two more rooms were filled by exhibits of medical jurisprudence, lent by the office of the Government Chemical Examiner, Hyderabad. They were a real attraction even to laymen. Different kinds of poisons, snakes, post mortum process etc. were subjects treated.

Another room was occupied by valuables. The Ancient Law section contained photographs of the Pillar recording Hammurabi Code, facsimile of Aristotel's Athenian Constitution in original Greek, Asoka's edicts etc. The Hindu Law section was represented by the palm-leaf collection lent by the Osmania University In the Section of Sanskrit MSS. lent by the same institution one came across two newly discovered copies of Kautillyia's ***Artha Sastra***, besides other works.

Muslim Law Section was represented by the earliest books compiled in India on Muslim law, such as ***Fatawi Kafuriyah***, dedicated to the Khiljite Minister and Commander Malik Kafur, and ***Fatawi Tatarkhaniyah*** in 7 huge volumes of the Tughliqite period; etc. A large number of Arabic and Persian MSS. on law from the Sa'idiyah Library, Hyderabad, were also there. Particular attraction was felt for the Sarakhsiy Collection. ***Al-Mabsut*** in 30 printed folio volumes, ***Sharh Siyar Kabir*** (on Muslim International Law) in 4 thick printed volumes, ***Usual Fiqh*** in a manuscript of over 1000 closely written pages of big size had the following notice on behalf of the exhibition: "Sarakhsiy, the great jurists of the 5th century of Hijra was imprisoned in a well for his fearless political activity against the contemporary tyranny and injustice. The great savant dictated all these works orally and from memory from inside the well to his pupils, who assembled on the well every day for several years."

Bureau (Da'iratul-Ma'arif) of the Osmania University which concerns itself solely with the editing of classical works in Arabic on Muslim law and other subjects. The *Ihyaul Ma'arif an-Nu'maniyah* is a private society of Hyderabad which has specialised in the publication of the classics of Hanafi jurisprudence only and has had great appreciation even abroad. Its publications and works under preparation were exhibited in another room.

The display of the first written constitution of the world, promulgated by the Prophet in the year 1 of Hijra, the charts depicting graphically the history of the schools of Muslim law and Hadith were also very much appreciated.

Again, theses submitted by post-LL. B. law students of the Osmania University were very impressive and showed how work was silently and methodically yet unostantatiously going on in all branches of law in the Osmania University, and even on most upto date topics like the Influence of the Current War on International Law. The theses of the Theology Faculty, submitted for Fiqh (i. e. Muslim Law degree) also represented what modern method could do for old subjects. The history of the compilation of Usul-e-Fiqh (jurisprudence) may be mentioned as an instance of exploring untrodden paths.

On the other end of the gallery was the almira which showed works honoured with the Swiney prize, the equivalent of Nobel prize in Law, awarded in England for the last hundred years, once every five years. In fact, Dr. Swiney, who died in 1844, had bequeathed a considerable sum of amount the profit of which was to go to award, every five years, a prize to the best legal publication in English language. The prize consists of £100/- cash and a gold cup of the same value. A literary work on jurisprudence and forensic medicine (i. e. medical jurisprudence) is ordinarily selected alternately every five years. The centenary prize in 1944 went to Prof. Allen for his " *Law in the Making* "

OPENING

The Hon. Nawab Dr. Mehdi Yar Jung Bahadur, Education Member, declared the Law Exhibition, in the Town Hall, Hyderabad, open, and in the course of his extempore speech referred to the important part played by law in a society, and contribution of Deccan to this brach of learning. He congratulated the organisers of the Law Conference for the novel idea of a Law Exhibition and making it interesting even to the illiterate.

Brief Description of the Exhibition.

When the visitor entered the spacious hall of the exhibition, he first passed through the gate which was beautifully decorated with an inscription, quoting the Qur'an in Arabic, " When you judge among people, judge with justice ", and again " God commands you justice and equity ".

The first room was occupied by exhibits lent by the Hyderabad High Court. The original Charter granted by the present Nizam at the reconstitution and reform of the High Court was there as also old files, hundreds of years old, showing the administration of justice and system of judiciary in Hyderabad. A huge chart, prepared by Mr. Basit Ali Khan, a former Registrar of the High Court, showing the present judicial system, in a graphic form, was a great attraction.

The veranda was decorated with pictures of mediaeval justice in Europe and Islamic countries. So the horrors of persecution were a contrast with the *dirra* (a sort of whip, the commonest way of physical torture in Muslim countries). The pictures of the courts with judges of Cordova and Baghdad were also a great attraction The costumes of the Cordovan judges solved the problem of the origin of the modern European gowns worn by judges and advocates. The Police badge of old Iran with the word " Qanun " inscribed thereon and other specimens of foreign countries were also there.

The adjoining gallery was filled with law books published in Hyderabad, a selection of course, both classical and modern. A the end of it was a big room occupied by the Orientai Publication

Law Courts together with its academic cum practical merits is put forward to the people in an attractive fashion, which could enable the men engaged in the running of the legal machine, in its various aspects, to detect its short-comings if any and to study the main causes for the same. It would not be inopportune if I apologise on behalf of the organisers for the Exhibition not being up to the mark; the reason being that there was very little time at their disposal and in the present distressing situation, the best they could humanly procure and manage is before you.

Geatlemen! we have the pleasure and honour of having Dr. Sir Mehdi Yar Jung Bahadur in our midst to perform the Opening Ceremony of the Exhibition. As is known to all of you assembled here, Nawab Saheb is the Pro-Chancellor of the Osmania University and a member of the Executive Council of our State. Above all he is keenly interested in the development of the legal machinery for the securing of the best qualities of an orderly society. The conflict between the Executive and the administration of law is well known in the history of the English Law, and we are aware how it has resolved into a friendly union, and the spirit of law has been kept up untarnished and pure. We fortunately have no such bitter conflict here. As a member of the Executive Council he is aware of the Executive mind and as the head of an Academic institution and a keen student of Social Sciences, he realises the gravity and importance of both the educational and practical aspects of the legal science for the benefit of society. Thus in his personality are combined the virtues that go to secure the existence of an ideal society and guarantee to every man the rights of a civilized human being, which is the aim of law.

With these few words, I would request Nawab Dr. Sir Mehdi Yar Jung Bahadur to declare the Exhibition open: Thank you all.

———

WELCOME ADDRESS

BY

Raja Bahadur Bishershvar Nath,

Chief Justice, Hyderabad.

YOUR EXCELLENCY, GENTLEMEN!

This 1st Session of the All India Law Conference is distinctive for having secured moral encouragement and blessing from such eminent personages like Sir Maurice Gwyer, Ex-chief Justice of the Federal Court of India and the Chancellor of the Delhi University, Sir C. P. Ramswami Aiyar, Sir Abdul Qadir and several other prominent lawyers and jurists. I term the occasion 'distinctive' in as much as Sir Maurice Gwyer is unique in combining in himself the great qualities of a Jurist, a Judge of the highest distinction and the head of an eminent academic institution. He is thus a symbol of the juristic. and administrative side of law, all one in a harmonious combination. Sir C. P. Ramswami Aiyar has been an able legal practitioner, is a jurist and a popular statesman. Sir Abdul Qadir is well-known. Rt. Hon'ble Sir Tej Bahadur Sapru has also informed that the is in sympathy with this moment. We will have the privilege of hearing learned addresses and critical discourses from our brothers coming from all the parts of India.

Gentlemen! it is well known to all of us that in our Country there has been a wide gulf between the various aspects of the Law. The theoritical and practical points of view never seemed to coincide. In order to achieve efficiency and perfectness in the machinery of the law we need a harmonious collaboration. If I be permitted to reveal the secret to achieve this end many of our earnest students and Professors have succeeded to find their dreams materlalised in the inauguration of this All India Law Conference. The teachers, the practitioners and the administrators of Law have found a common platform for the expression of their opinion. It is a happy augury.

The Exhibition organised under its auspices forms one of the main wings of the platform. The Law as administered in our

General Scheme of Law Exhibition.

1. Old Manuscripts on Law, especially Arabic and Sanscrit.
2. Palm-Leaf MSS. of Deccan on Law.
3. Swiney Prize Law Books.
4. Tagore Law Lectures.
5. Law Journals of the World, Surveys of legal development, etc.
6. Law Conferences, old and new.
7. Law Commissons and their Reports, old and new.
8. Rau Commission and the codification of Hindu Law.
9. War Time Laws and Ordinances.
10. Statistics of Lawyers and Law-graduates etc. of India.
11. Instruments of Punishment, old and new.
12. Legal Inscriptions of Hammurabi, Asoka etc.
13. Treaties, Sanads, Donations, Grants etc.
14. Old forms of legal transcations, court judgements etc.
15. Literature on Mitakshara (which was compiled in Deccan).
16. Administration of Justice, (old paintings etc.)
17. Law in Hyderabad.
18. Photographs of old bar and bench in Hyderabad.
19. Photographs of the Law Faculty, Osmania University, Hyderabad.
20. Medical jurisprudence.
21. Crime detection, old and new. (Finger prints, blood testing etc.)
22. Motor accident demonstration with dummy models.

PART III

LAW EXHIBITION.

We in the Osmania University will be ready to publish any useful literature which we get on the subject from the savants of legal learning in our Osmania Law Review which we propose to start on sufficient material being available as after effects of this gathering of learned jurists like yourself in our midst.

---

law. To practice in a court of law one must possess the Inns of Court Certificate. In America and on the Continent the systems are different. In India it is quite the opposite. It is mainly the University Degree now which entitled a person to practice. But if one studies the legal curriculum of Indian Universities one notices more or less complete absence of the subjects which directly help a lawyer in the daily discharge of his professional duties. Consequently to co-ordinate legal education and practice is not a very easy task. In an attempt of this nature a very careful regard is to be had to the very best in practice and not necessarily to its most lucrative side.

The analytic study of general conceptions of the law is considered and rightly so by the greatest experts on legal education in Universities as a necessary part and parcel of it. But Professor Dicey shows the dangers of it also in the following words:—

> "Jurisprudence is a word which stinks in the nostrils of a practising Barrister. A jurist is, they constantly find, a professor whose claim to dogmatise on law in general lies in the fact that he has made master of one legal system in particular, while his boasted science consists in the enunciation of platitudes which, if they ought, as he insists, to be law everywhere, cannot in fact be shown to be law any where."

As an educationist, he himself admits that prejudice excited by a name which has been monopolised by pedants or impostors should not blind us to the advantage of clear and lucid thinking on law. We all have to read Austin as students of law in different universitirs. The great jurist himself once expressed a doubt whether his love letters were not written in the fashion of an equity draughtsman. A learned legal authority says that "Austin's treatise reachable in manner more to the charging part of an old bill in equity than any other kind of human composition."

Now Sirs, with the above facts in view, it is for you to evolve system of co-ordinating legal education and practice without sacrificing the innate and essential characteristics of either.

of each of the component parts adjusting itself to the varying climates, environments and racial characteristics with one object of bringing this one-world under a most perfect legal system. We may have to evolve it but this should not deter us from searching for its component parts all the word over wherever we may find them.

To achieve the object we must first start with collecting the material. What better method can we adopt than an attempt to bring out an annual survey of world's laws. A non-legal friend of mine on hearing it remarked that it is very vague. I told him at once that to a lawyer it is something very definite. We will start by collecting material on various systems of law which now governs various races and nations.

In general the laws governing the world have jurisprudence, legal history, Constitutional law, Administrative Law, Family Law and the Laws of Persons, Property Law, Law of Contract, the Law of Tort, Mercantile Law, Industrial Law, Criminal Law, Evidence and Procedure, Conflict of Laws and Public International law. The list of laws given above is not necessarily exhaustive but I can safely say that is nearly so. After classifying the world governed by certain systems we will sub-classify them in their necessary component parts in various empires and countries.

By that means we hope to collect much useful material on the yearly development of law in various parts of the world that we will easily be able to evolve a system of law most useful for the needs of the present and future of one-world. Pray always remember that this by no means involves the obliteration or effacement of the special legal characteristics adapted to the requirements of different cultures prevailing in the world.

Now as to the other subject of interest to which I have to draw your attention is 'how to co-ordinate Legal Education and Practice,' I know full well that there are definite opposite schools of thought on this subject. One prevails mainly in England and countries which have developed there legal systems on English models. In England the legal education given in the universities does not entitle their degree holders to practice in any court of

It is a matter of great congratulations to us all that we have such a fine gathering of about 400 jurists both from inside and outside the Dominions. From the interview which I had with Sir Maurice Gwyer at Delhi and the most encouraging correspondence which passed between ourselves and the Chief Justices of the Federal and various High Courts, Sir C. P. Ramaswami Aiyar, Sir Tej Bahadur Sapru, leading advocates and other leaders of thought, we expected a much larger gathering from all over India but probably the caution of the Railway to " Travel less ", " Travel only when you must ", though ineffective with the non-lawyer class yet the law-abiding lawyers have obeyed it as they ' *must* ', and confined their sympathetic activities to post and telegraph only.

As to the first proposal I may tell you that I have been inspired by a great legal publication of London University called Annual Survey of English Law the three volumes for 1938, 39, and 40 are before you now. From their perusal you will notice that they contain not only a summary of statutary Law, decided cases and legal literature of the respective years but give a brief summary of the trend of legislation, decisions and literature.

I am sure that you all agree with me that since the modern invention of Aeroplane, Radio and Television the world has become much smaller and with the development in each will probably become smaller and smaller every day. It is high time that we start thinking in terms of one-world in every form of human activity, more so in law than in any other. If the mentality of the various races and nations of the world is changed to thinking in terms of oneness of world's laws, I am sure this world would be much happier in future than it has ever been in the past. May be, that the present clash between races and races, nations and nations, votaries of religions against each other will cease if we start thinking in terms of one-world laws.

As legal thinkers of light and learning let us search for a code or codes of Law which may be addressed to the whole humanity and which may be sufficiently elastic to adopt to the requirement

ADDRESS

BY

Dr. Nawab Nazir Yar Jung Bahadur,

President of the Managing Committee of the All-India Law Conferance.

Proposing and explaining resolution.

No. 12 and 13 * :—

GENTLEMEN,

While drawing the attention of this august Assembly of legal luminaries to two most important proposals of academic and practical importance on the Agenda for the advancement of legal knowledge in post war world, I would like to mention an interesting incident which has brought about this great result with vast potentialities behind it. It was in an Osmania University Railway Omnibus in which we lecturers and students of Law often travelled together from the Military Victory Ground (Fath Maidan) of Hyderabad to Legal Victory Ground of Osmania University that the subject of this Conference was not only mooted for the first time but many of its details were settled. On a fine morning travelling in one of these buses talking on subjects of lego-educational interest, my brilliant pupil Mr. Shaik Hyder, now L L. M. and our Secretary, who hails from the town of Kolapur in the Mahbubnagar District in our Dominions and occupies the office of President of the Osmania University Law Union, suggested to us the idea of holding this Conference. That informal meeting in a Railway Bus has developed into this grand concourse of legal lights of India under the roof of the palatial Town Hall of our great City of Hyderabad.

---

* *Resolution 12* :— this Conference welcomes the proposal of the Law Department of the Osmania University to serve the advancement of a scientific study of law by publishing an Annual Survey of World's Law under the auspices of the Osmania University and will lend its fullest support to the proposed publication.

Resolution 13 :— this Conference welcomes the proposal of startiug a Law Review at Hyderabad-Deccan entitled the Osmania Law Review ; and appeals to the Jurists of eminence all over India to lend theiy support to the Review with their valuable contributions.

Osmania Law Review; and appeals to the jurists of eminence all over India to lend their support to the Review with their valuable contributions.

14. *Resolved:*— that this Conference places on record its sense of gratitude and thankfulness for the valuable services rendered by Sir Abdul Qadir, the General President of the Conference, in guiding its deliberations wisely to a successful conclusion.

15. *Resolved :*— that the Conference places on record its appreciation for the services rendered by the organisers of the Conference in making it a success.

Sd./ SIR ABDUL QADIR,
General President,
of the All India Law Conference,
Hyderabad Session.

6. *Resolved* :—that in the opinion of the Conference greater attention should be paid to the study of and research in Oriental jurisprudence than has heretofore been the case in Indian Universities.

7. *Resolved* :—that Funds be raised in the different regional centres of the country, to provide help to poor and deserving law students. as loans without interest.

8. *Resolved* :— that the Conference recommends the establishmeut of Legal Aid Societies in different parts of the country, on voluntary basis, for giving legal advice to the poor and to secure representation in courts in their behalf.

9. *Resolved* :— that the question of the relations between the senior and junior legal practitioners be referred to the Law Practitioners' Committee for consideration and report.

10. *Resolved* :—that this Conference recommends to all the Universities in India, to start courses of instruction in the subjects of identification in several branches (like handwriting, finger prints, fire arms, bloodstains, sand, dust etc.) at least as an optional subject for the Bachelor of Law Degree, and as a preliminary thereto to arrange for extension lectures in these subjects.

11. *Resolved* :- - that this Conference requests the Government of H. E. H. the Nizam to continue the support and patronage to the Conference, so that it may be able to render useful service to the country in the development of law and to help the course of administration of justice.

12. *Resolved* :—that this Conference welcomes the proposal of the Law Department of the Osmania University to serve the advancement of a scientific study of law by publishing an Annual Survey of World's Laws under the auspices of the Osmania University and will lend its fullest support to the proposed publication.

13 *Resolved* : —that this Conference welcomes the proposal of starting a Law Review at Hyderabad-Deccan entitled the

RESOLUTIONS

Passed by the First All-India Law Conference held at Hyderabad-Dn. on Tuesday, Wednesday and Thursday, 18th to 20th July, 1944.

---

1. *Resolved* :—that for the routine work of the Conference the following Sectional Committees be constituted :—

a The Law Teachers' Committee, which will work as a union of the Law Faculties in India.

b The Law Practitioners' Committee, which will promote unity among the legal practitioners in India and serve as a central organization for the whole country.

c. The Law Students' Committee, which will serve as a co-ordinating organization of the several Law Students' Unions in the different Universities of India.

d. The Academic Committee which will promote research work in Law.

2. *Resolved* :— that the question of the inclusion of jurisprudence as an optional subject for the B. A. degree examination be referred to the Law Teachers' Committee for consideration and report.

3. *Resolved* :—that the principle of imparting to the general public a knowledge of the Law of every day utility by the voluntary co-operation of law teachers and lawyers is accepted as desirable.

4. *Resolved* :— that a uniform denomination be adopted to indicate legal designations in different parts of India. (For instance the term 'Advocate' should not be used for diffent purposes in different High Courts).

5. *Resolved* :—that the question of the necessary preliminary qualification for those who wish to pursue the degree courses in law be referred to the Law Teachers' Committee for consideration and report.

(*b*) How to co-ordinate Legal Education & Practice.
.... followed dv discussion.

4. Papers if time permits.

Night Session. 8-30 P. M. to 10 P M. Town Hall.

Lantern lectures by Mr. Mian Muhammad Siddiq, Mr. C. T. Bhanagay, and Mr. Qasim Husain, Coroner.

19th July. 10 A. M. to 1 P. M., Town Hall.

1. Addresses by Dewan Bahadur Arvamudu Aiyangar, and Mr. Mir Akbar Ali Khan.
2. Papers followed by brief discussions.

Afternoon Session. 3-30 P. M. to 4-30 P. M. Town Hall.

Business meeting for election of the Council and the Executive Committee in pursuance of the Fundamental Rules.
(Special intimations are issued to members concerned).

Evening Sessiou. 4-30 P. M. to 7-30 P. M. Town Hall.

1. Address by Dr. Sir Amin Jung Bahadar.
2. Papers followed by brief discussions.
3. Concluding remarks of the General President.

20th July, 10 A. M. to 1 P. M. Town Hall.
Business meeting to adopt resolutions.

Special Sesson. 21st July. 4-30 P. M. Town Hall.

Address by Sir Tej Bahadur Sapru.
Thanks.

ALL-INDIA LAW CONFERENCE.

PROGRAMME.

——:o:——

Law Exhibition: 17th July, 1944, 6 P. M., Town Hall.

1. Raja Bahadur Bisheshwarnath, C. J., President Exhibition Committee to ask Hon. Sir Mahdi Yar Jung Bdr. to open.

2. Opening of the Exhibition and visit by the guests. The exhibition will last for a week, between 9 A. M. to 12 noon and 4 P. M. to 7 P. M.

Law Conference: 18th July, 10 A. M. to 12 noon, Town Hall.

1. Hon. Nawab Alam Yar Jung Bahadur, Chairman Reception Committee to read his address and invite H. E. P. to open the Conference.

2. H. E. the President to read his opening address, convey the Royal Message, and invite the General President to deliver his address.

3. Addresses of Sir Maurice Gwyer and Sir Abdul Qadir.

4. Local Secretary reads select messages.

5. Vote of thanks to H. E. H., H. E. P. and the General president.

Evening Session 4 P. M. to 6 P. M. Town Hall.

1. Address of Sir C. P. Ramaswamy Aiyar to be read.

2. Address by Principal Siva Subramanian, Dean of the Law Faculty, Benares.

3. Dr. Nazir Yar Jung Bahadur to read his paper on the need of :—

    (*a*) Publishing an Annual Survey of the Development of world Laws, and

2. **Under-Secretary,** Dr. M. Hamidullah, Osmania Law Faculty, Hyderabad.

3. **Treasurer,** Mr. Mir Akbar Ali Moosavi, Osmania Law Faculty, Hyderabad.

4. **Member,** Dean of the Osmania Law Faculty, Hon'ble Raja Bahadur Bisheshwarnath, Chief Justice, Hyderabad.

5. **Member,** Dr. Nazir Yar Jung Bahadur, Hyderabad.

COUNCIL.

a) **Working Committee together with its Standing Committee.**

(*b*) **Elected Members :—**

1. Dr. Ahmad Husain Amin Jung Bahadur, Hyderabad.
2. Dr. Mir Siyadit Ali Khan, Hyderabad.
3. Mr. M. B. Dixit, F. R. M. S, (London), Nagpur.
4. Mr. Suryanarayan Rao, Advocate, Hyderabad.
5. Gunde Rao, Dist. Judge, Gadwal.
6. Waheedullah Khan, B. A., LL. M., Hyderabad.
7. Muhammad Farooq, B. A., H. C. S., Hyderabad.
8. Mr. Narasihwan Rao, B. A., LL. B , Hyderabad.
9. Mr. Abdur Raoof, Advocate, Hyderabad.
10. Mr. S. Bashir Ahmad, B Sc. LL. M.. Hyderabad.
11. Mr. Muhammad Abdus Sattar, B.A., LL.M., Hyderabad.
12. Mr. Shaik Hyder, B. A., LL. M., Hyderabad.

Permanent Office of the All-India Law Conference,
Osmania Unievrsity, Hyderabad-Dn

Session of the Conference.

11. The session of the Conference shall be held, at the invitation of a government or some recognised institution at least once in two years, at a place to be decided by the Working Committee.

N. B.—The Conference may be divided in sectional meetings if needed.

Procedure.

12. The procedure of meetings, book-keeping and all the management shall be run on the same lines as are prevalent in other similar learned bodies.

In pursuance of the Fundamental Rules, the Conference of 1944 elected the following bodies :—

WORKING COMMITTEE.

(*a*) **General Committee.**

President, Sir Maurice Gwayer, Vice-Chancellor, University of Delhi.

Secretary. Mr. Siva Subramanian, Principal, Law College, Benares.

Members :

1. Sir C. P. Ramaswamy Aiyar Trivandrum.
2. Sir Abdul Qadir, Baghdadul Jadid.
3. Sir Taj Bahadur Sapru, Allahabad.
4. Mr. Asaf Fyzee, Principal, Law College, Bombay.
5. Dr. Hamid Ali, Law College, Madras,
6. Mr. C. T. Bhanagay, F. R M. S., (London), Nagpur.
7. Dewan Br. Arvamudu Ayengar, Advocate, Hyderabad.
8. Mr. Mir Akbar Ali Khan, LL. B., (Hon.) Bar-at-Law, Hyderabad.

(*b*) **Standing Committee.**

1. **Vice-Prsident,** Head, Osmania Law Faculty, Mr. Husain Ali Mirza.

Committee shall be elected by the Council, at the end of each Conference.

Powers of the Standing Committee.

7. It shall be in the powers of the Standing Committee :—

   a. To manage routine office work of the Conference.

   b. To preserve all records of the Conference.

   c. To sanction enrolment of members of the Conference.

   d. To decide what matters should be circulated for the opinion of the whole Working Committee.

N. B.—The standing Commtttee shall inform every member of the Conference what decision it has taken on his motion.

Council.

8. There shall be a Council of the Conference, consisting of the following :—

   a. The Working Committee,

   b. Every member of the Conference who shall have read paper at least in three sessions of the Conference.

N. B.—The members recding papers at the first two session of the Conference shall elect a maximum of 25 members for the Council.

9. The membership of the Conference shall be open to all persons interested in law, whose enrolment has been sanctioned by the Standing Committee of the Conference and who pay membership fee of Rs. 3/- for each term in advance.

N. B—Bonafide students of law shall pay a third of this fee.

Each term shall extend from one session of the Conference to the next.

Membership of Working Committee & Council.

10. The members of the Conference alone are eligible to election for the Working Committee and the Council.

Power of the Working Committee.

5. It shall be in the Powers of the Working Committee :—

a. To formulate all bye-laws and regulations of the Conference.

b. To elect the General President of the Conference.

c. To elect Sectional Presidents of the Conference.

d. To control the management of the officers of the Conference.

e To arrange according to funds and means, the publication of the transactions of the Conference and other permanent or temporary work regarding the Science of Law.

N. B. *Provided that* :—

a. The sanction of the Council shall be necessary for every amendment of the Fundamental Rules, which might be obtained by circulation

b. At the demand of five members of the Conference, the decision of the Standing Committee shall be placed before the whole Working Committee for revision.

c. Every matter shall be decided by majority of votes.

Standing Committee.

6. There shall be a standing Committee consisting of the Vice-President, Under-Secretary, Treasurer and two Members of the Working Committee (referred to in § 4 supra).

N. B.—The members of the Standing Committee shall be the residents of the city of Hyderabad-Dn.

The first Standing Committee shall be nominated by the Law Union, Osmania University, and every post falling vacant subsequently shall be filled up by the remaining members of the Standing Committee. The rest of the Working

Constitution and Fundamental Rules.

As soon as the convening of the conference was decided upon, a representative gathering of the local law people was held. It resolved itself into the Assembly of Founders, and agreed to the following Fundamental Rules to be observed until amended by any future Conference in accordance with the provisons therefor :

Translation of

THE FUNDAMENTAL RULES OF THE ALL-INDIA LAW CONFERENCE.

Approved by the Assembly of Founders.

Name.

1. This organisation shall be called. The All-India Law Conference.

Object.

2. Its objects shall be :—

   a. To provide facilities of contact between persons interested in law for mutual benefit.

   b. To provide all possible means for the progress of the science of law.

Office.

3. The permanent office of this Conference shall be located in the Law Union of the Osmania University, Hyderabad-Dn., and shall function under the guidance and control of the All-India Working Committee.

Working Committee.

4. There will be an All-India Working Committee, consisting of a President, a Vice-President, a Secretary, an Under-Secretary, a Treasurer and ten Members.

23. Ghulam Husain, LL B. (Final) Osmania University.

24. N. Govind Rao Joshi, LL. B. (Final) Osmania University.

25. Qazi Md Hamiduddin, Darussalam Boarding, Hyderabad-Dn.

26. Shaik Hyder, B. A., LL. M. Azampura, No. (307) B. Class, Hyderabad-Dn.

27. Madho Rao Jamaniker, Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

28. Lal Reddy, Law Class, Reddy Hostel, Hyderabad-Dn.

29. Madhosedhan Rao, LL. B. Osmania University.

30. Sahibzada Mir Masood Ali Khan, Yakutpura, Hyd-Dn.

31. Md. Muzammil Siddiqi, of ordinary member No. 92 (a) supra.

32. V. J. Moramker, LL. B. (Final Osmania University.

33. Narayan Das, LL. B. (Final) Osmania University.

34. Narsing Prashad, LL. B. (Fina Osmania University.

35. M. N. Padma Rao, LL. B. [Final] Osmania University.

36. Prem Chand, Chowk Maidan Khan, Hyderabad-Dn.

37. Raoshan Ali, Police Lines, Secunderabad.

38. Riyaz Ahmad, B. A., LL. B. Khairatabad, Hyderabad-Dn.

39. Shankar Rao Desai, LL. B. [Final] Osmania University.

40. N. Srinivas Reddy, LL. B. [Final] Osmania University.

41. Vir Badrappa, Law Class, Lingayat Hostel, Kachiguda, Hyderabad-Dn.

129. Venkat Narhari, Pleader, Sultan Bazar, Than Mul Building, Hyderabad-Dn.

130. Venkat Rao, Pleader, Adilabad.

131. Venkat Rao, Pleader, Bider.

132. V. Virayya Gupta, Pleader, Kamareddy.

133. Vishonath Rao, Pleader, Bider.

134. Muhammad Wajid Ali, Pleader, Murlidhar Bagh, Hyd-Dn.

135. Ramchander Rao Yadkiker, Pleader, Jalna.

136. Syed Yusuf, Pleader, Nizamabad.

137. Zainul Abidin, Pleader, Jam Bagh, Darushifa, Hyd-Dn.

138. Dr. Zubaid Ahmed, Allahabad University.

139. Dr. Zubair Siddiqi. Professor, Calcutta University.

Student Membership.

(Re. 1)

1. Ahmed Abdul Majid, C/o Abdul Qadir, Sessions Judge, Salar Jung Estate, Rs. 2

2. Abbas Yar Khan, LL. B. (Previous) Osmania University.

3. Abdul Aziz Sultan, LL. B. (Previous) Osmania University,

4. Abdul Waheed, LL. B (Previous) Hostel, Osmania University.

5. Md. Abdus Sattar, B. A., LL. M. C/o Ziauddin Ahmed, Asstt. Chief Engineer, Alwyn Metal Works, Musheerabad.

6. Akbar Ali Nasiri, LL. B. (Previous) Osmania University.

7. Syed Alauddin Nahri, LL. B. (Final) Osmania University.

8. Syed Ali Qadri, LL. B. (Final) Osmania University.

9. Agha Ali Ahsan, Osmania University Hostel, Hyd-Dn.

10. Md. Alimuddin Shakir, LL. M. (Previous) Himayatnagar, Hyderabad-Dn.

11. H. M. Amrayya Patel, Kattal Mandi, Hyderabad-Dn.

12. Renuka Das Rao Ardhapurkar, Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

13. Muhammad Arif Khan, Osmania University Hostel, Hyderabad-Dn.

14. Md. Azimuddin Shakir, LL. M. (Previous), Himayatnagar, Hyderabad-Dn.

15. Balkrishnayya, Law Class, Kolhapur State.

16. Basheeruddin, LL. B. (Previous) Hostel 'C' Osmania University.

17. Shanker Rao Beloli, C/o Rang Rao Saurikar, Station Road, Nampalli, Hyderabad-Dn.

18. Ramchander Rao Bhaviker, LL. B. Osmania University.

19. Shanker Rao Chohan, LL. B. (Final) Osmania University.

20. Dattatri Rao' Law Class, Punjab Pharmacy, Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

21. Farrukh Ali, Jubilee Hill, Hyderabad-Dn.

22. Ganga Ram Shandge, LL. B. (Previous) Osmania University.

92. Dr. Syed Muzaffer Husain, University, Dacca.

92 [a] M Muzammil Siddiqi, Bider.

93. Nana Rao, Pleader, Bider.

94. Narayan Rao, Munsif, Nanded.

95. Narayan Rao, Pleader, Warangal.

96 Narayan Reddy, Pleader, Adilabad.

67. B. Narayan Reddy, Nizamabad.

97. (a) V. Narayan Reddy, Pleader, Wanparti.

98. Narher Rao, Pleader, Warangal,

99. Narsihwan Rao, Azampura, Hyderabad-Dn.

100. Narsihwan Rao, Pleader, Mahboobpura Road, Hyd-Dn.

101, B. Narsimhan Rao, Pleadar,

102 Nawab Ahmad Khan, Add. Judge, Jalna.

103. Parbhak Reddy, Inspector, Excise Dept, Yella Reddy,

104. Parmeshwar Dayal, Medams House, Medams, Bombay.

105. Syed Qalander Husain, B. A., LL. B. Chirag Ali Street, Hyd-Dn.

106. Rahimullah, Pleader, Raichur.

107. Ram Keshor, Rai Bahadur, River Side, Delhi

108. Raug Rao, Pleader, Station Road, Nampalli, Hyd-Dn.

109. Raza Muhammad Khan, Munsif, Nelanga, Bider Dist.

110. Riazul Hasan Hashmi, Kattalguda, Hyderabad-Dn.

111. Rukma Reddy, Pleader, Nizamabad.

112. Shah Sabir Ahmed, Pleader, Hyderabad-Dn.

113. Sadashiv Rao, Pleader, Nanded.

114. Sadashiv Rao Kulkarni, Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

115. Saifuddin Khan, Additional Magistrate, Nanded.

116. Khaja Sarwar Hasan, Delhi.

117. Ahmad Shamshul Haq Haqqani, B A., LL. M Bazar Noorul Umara, Hyd-Dn.

118. Shankerji, B. A., LL. B Kazipura, Near Masgid Quwatul Islam, Hyderabad-Dn.

119. Shihabuddin, Pleader, Near Murlidher Bag, Hyd-Dn.

120. Siva Subramaniam, Principal, Law College, Benares.

121. Srinivas Chari Parthiwati, Pleader, C/o Janardhan Rao, Pleader, Chiragh Ali Street, Hyd-Dn,

122. Srinivas Rao, Add. Magistrate, Parbhani.

123. Srinivas Rao Bagat, Munsif, Lingsgore.

124. M. V. Subba Rao, Pleader, Warangal.

125. Surya Prakash Rao, Pleader, Warangal.

126. Tirmal Rao, Pleader. Theosophical Hall, Hyd-Dn.

127. Tokka Ram Rao. Pleader, Nanded.

128. Tum Rangayya. Pleader, Warangal.

57. (a) M. Imamuddin Pleader, Wanparti.

58. Dr Shaik Inayetullah, Govt. College, Lahore.

59. Ismail Khan Haji. Pleader, Nanded.

60. Jagannath Rao Kulkerni, A. R. P. Inspector. Chirag Ali Street, Hyderabad-Dn.

61. Karam Chand, Govt. College, Rajmandary.

62. B. Kesho Rao, Pleader, Nizamabad.

63. Ram Rao Kevliker, Pleader, Nanded.

64. Bhalchander Rao Khalekar, Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

65. Manoher Rao Kherkar, Pleader, Parbhani.

66. Konda Reddy, Pleader, Warangal.

67. Krishna Menon, Principal, Law College, Madras.

67. (a) Krishnaji, Pleader, Wanparti.

68. K. Lakshman Rao, Pleader, Kamareddy.

69. Lakshmi Kant Rao, Pleader, Adilabad,

70. Liyaqatullah, Bar at-Law, Ex-Judge, Gwalior, Near Head Post Office, Hyderabad-Dn.

71. Madho Rao, Pleader, Nanded.

72. Madho Reddy, Pleader. Bider,

73. Dr. J. Mangayya, Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

74. Manik Rao, Pleader, Ahmedpur.

75. Manoher Rao, Pleader, Nanded.

76. Masood Alam Nadwai, Director of Library, Bankipur, Patna

77. Masraf Ranga Rao, Pleader, Kamareddy.

78. Syed Muhammad, Professor, Trivandrum.

79. Md. Ahmad, B. C. L., Bar-at-Law, Chirag Ali Lane. Hyderabad-Dn.

80. Muhammad Farooq, Under Secretary, Political Dept. Near Moazzamjahi Market, Hyderabad-Dn.

81. Md. Ghaus, Imperial Library, Calcutta.

82. Md. Ibrahim A'rabi, Pleader, Nanded.

83. Md. Ibrahim Hafiz. Pleader, Khairatabad. Hyderabad-Dn.

84. Mohd. Ilyas, H. C. S., Khairatabad, Hyderabad-Dn.

85. Muhammad Jan Qureshi, Pleader, Revenue Department, Hyderabad-Dn.

86. Mohd. Mansoor, Pleader, Nanded.

87. Syed Mohd. Yaqub, Pleader. Jalna.

88. Dr. Syed Muhammad Yusuf, University, Aligarh.

89. Srinivas Rao Mudnoorker, Pleader, Risala Abdullah, Hyderabad-Dn.

90. Sripad Rao Phodey, Hon. Munsif, Parbhani

91. Murlidhar Rao, Pleader, Bider.

21. Balkishen Rao Nayak,
Gaoliguda, Hyderabad-Dn.

22. Bapu Rao, Pleader, Asifabad.

23. Syed Bashir Ahmed, B. Sc., LL. M.
Pleader, Hyderabad Dn

24. Mir Basit Ali Khan, Judge,
Small Causes, Somajiguda,
Raf'at Manzil, Hyderabad-Dn.

25. Bhagwan Rao, Pleader,
Nelanga, Bider, Dist.

26. C. T. Bhasagay.
Congressnagar, Nagpur.

27. Shuradappa Bidarkar,
Pleader, Shanker Bagh, Hyd-Dn.

28 Syed Burhanuddin,
Pleader, Shorapoor.

29. Kesho Rao Charikar,
Pleader, Nanded.

30. Chidamber Rao,
Pleader, Nanded.

31. B. N. Chobe,
Pleader, Hyderabad-Dn.

32. Sham Rao Chungi, Pleader,
Near Revenue Dept,
Hyderabad-Dn.

33. Md. Daood Osman,
Pleader, Kamareddi.

34. Dr. Daood Pota, Director,
Educational Dept., Karachi.

35. Dattatri Rao,
Pleader, Jalna.

36. Dattatri Rao Basmathker,
Pleader, Nanded.

37. Deen Dayal,
Pleader, Hanamkoda,

38. Dhonde Rao,
Pleader, Nelanga, Bider, Dist.

39. Digamber Rao, Pleader, Bider.

40. Md. Fazle Haq,
Asstt. Superintendent,
Excise Department.
Warangal.

41. Fazl Samdani,
Bhana Madi, Peshwar.

42. A. A. Fyzee, Principal,
Law College, Bombay.

43. Ganesh Lal,
Gaoliguda, Hyderabad-Dn.

44. Ganesh Prashad.
Pleader, Warangal.

45. Ganpat Rao Chaudhary,
Pleader, Nanded.

46. Ghaus Mohiuddin,
Pleader, Nizamabad.

47. Ghaziuddin, H. C. S.
Dist. Magistrate, Nanded

48. Gian Rao, Pleader, Bider..

49. Goswami Mahindergir,
Pleader, Sultan Bazar.
Near Police Station House,
Hyderabad-Dn.

50 Govind Rao,
Pleader, Adilabad.

51. Gundey Rao, Pleader, Bider.

52. Syed Habibur Rahman,
Dist. Magistrate, Asifabad.

53. Khaja Hameed Ahmed,
Asst. Director, Statistics
Department, Hyderabad-Dn.

54. Dr. Hamid Ali, Law College,
Madras.

55. Dr. M. Hamidullah, Osmania
University, Hyderabad-Dn.

56. Hanmant Rao, Pleader, Sultan
Bazar, Hyderabad-Dn.

57. Hariher Rao, Deshpande,
Gaoliguda, Hyderabad-Dn.

101. Tippa Reddy,
Pleader, Gadwal.

102. J. Tukka Rao,
Pleader, Kareemnagar.

103. Ganpat Rao Udgirker,
Pleader, Nanded.

104. Vaddiraj Venkat Narsima Rao,
Pleader, Warangal.

105. Vard Raj Rajeshwar,
Pleader, Warangal.

106. Venkat Rao Desai, Gaoliguda
Chaman, Hyderabad-Dn.

107. Venkat Swami, Pleader,
Bohra Window, Hyd-Dn.

108. Waheedullah Khan, B.SC., LL.M.
Pleader, Bazar Sulaimanjah,
Near Mehndi Mahboob,
Hyderabad-Dn.

09. Wahid Baksh Waheedi,
Pleader, Troop Bazar, Hyd-Dn.

110. K. Yalla Reddy, Pleader,
Raj Mahal Talkies, Hyd-Dn.

111. Mir Zahid Ali Kamil, B.A., LL.B.
Pleader, Near Revenue Secretariate, Hyderabad-Dn.

112. Mir Zamin Ali, Court Inspector,
Gulbarga

113. Ziauddin Ahmed, Pleader,
Kupbal Jagir.

Ordinary Memership.

(Rs. 3)

1. Manvi Taluk,
C/o Shaik Mohiuddin of
Raichur.

2. Manvi Taluk,
C/o Shaik Mohiuddin of
Raichur.

3. Manvi Taluk,
C/o Shaik Mohiuddin of
Raichur.

4. Abbas Raza Zaidi, Student LL. M.
Near Dabirpura Station,
Hyderabad-Dn.

5. Abdul Haq, Principal, Govt.
Mohammadan College, Madras.

6. Abdul Jabbar, Munsif,
Lakri-ka-Pul, Hyderabad-Dn.

7. Md. Abdul Jabbar, Munsif,
C/o Aziz Mohammed,
4th Nazim Fozdari, Hyd-Dn.

8. Khaja Abdul Waheed,
Mohammad Nagar, Lahore.

9. Khaja Abdur Rahman,
Pleader, Yella Reddy.

10. Md. Abdur Razzaq Khan,
B. A., LL. B.
New Nampalli, Mosque,
Hyderabad-Dn.

11. Dr. Abdus Sattar, Alahabad
University.

12. Abul Hasan, (Munsif Bhainsa)
Bazar Sulamanjah, Shafakhana
Azizia, Hyderabad-Dn.

13. Ahmad Mohiuddin Ansari,
Pleader, Nizamabad.

14. Ali Husain, Superintendent,
Executive Council, Hyd-Dn.

15. Ambadas Rao, Pleader,
Adilabad.

16. Md, Asadullah, Munsif,
Parbhani.

17. Asghar Husain Pleader, Bidar.

18. Auliya Qadri, Pleader,
Salar Jung Building, Hyd-Dn.

19. Aziz Ahmad, 4th Nazim
Fawjdari, Liakat Manzil,
Lakrika Pul Hyderabad-Dn.

20. M. Azizullah Khan,
New Malleypally,
Hyderabad-Dn.

64. Muhammad Ali,
Pleader, Gulbarga

65. Md. Ali Khan, B.A., LL.B.
Pleader, Nizamabad.

66. Md. Bhai, Sessions Judge
Warangal, Lal Tekari,
Hyderabad-Dn.

67. Md. Ismail, Pleader, Nanded.

68. Md. Masood, Pleader,
Chirag Ali Street,
Hyderabad-Dn.

69. Muhammad Sharif, Pleader,
Jam Bagh, Hyderabad-Dn.

70. Md. Zahoor,
Pleader, Warangal.

71. Shaik Mohiuddin,
Pleader, Gulbarga.

72. Moinuddin,
Pleader, Warangal.

73. Mukand Rao Watandar,
Pleader, Kupbal Estate.

74. Hafiz Muneeruddin,
Pleader, Warangal.

75. Muneeruzzaman,
Pleader, Warangal.

76. Pt. Nagappa,
Pleader, Gadwal,

77. Narayan Rao,
Pleader, Nizamabad.

78. Narsingh Bhan,
Pleader, Gadwal.

79. Nilkant Rao, Pleader, Begum
Bazar, Nasir Jung Street,
Hyderabad-Dn.

80. Pandherinath Rao,
Pleader, Nanded.

81. B. A. Patel, B.A., LL.B.
Pleader. Sultan Bazar,
Hyderabad-Dn.

82. Percha Ranga Rao,
Pleader, Warangal.

83. Pulsi Shanker Rao, Pleader,
Nizamabad.

84. Raghunath Rao Deshpande,
Afzalpur.

85. M. Qudrat Ali, H. C. S.
Munsif Aurangabad.

86. N. K. Rao, Pleader,
Jam Bagh, Hyderabad-Dn.

87. Raghotam Rao, B. A., LL. B.
Pleader, Raichur.

88. Ram Dayal Babu, Pleader,
Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

89. M. Ram Rajeshwar Rao,
Pleader. Warangal.

90. Rameshwar Rao,
Pleader, Warangal.

91. Ramkoteshor Rao,
Pleader, Warangal.

92. M. Ramchander Rao,
Pleader, Warangal.

93. Renoka Das Rao, Pleader,
Gaoliguda, Hyderabad-Dn.

94. Mir Sa'adat Ali, Pleader, Nanded

95. Sardar Khan, Pleader,
(Govt.) Gulbarga.

96. Satguru Prashad Advocate,
Koka Tatti, Hyderabad-Dn.

97. Pt. Shanker Rao, Pleader, Near
Sikh Gurudwara, Hyd-Dn.

98. Syed Sharafuddin,
Pleader, Nizamabad.

99. Subhan Sharif, Pleader,
Mehndi Mahboob,
Hyderabad-Dn.

100. P. K. V. Sunder Raj, B.A., LL.B.
Pleader, Sultan Bazar, Hyd-Dn.

25. Bhagvant Rao, Jalna.

26. Bhim Rao, B.A., LL.B. (Osm.)
Jalna.

27. Burhanuddin, Pleader,
Mohiuddin Pasha Bagh,
Hyderabad-Dn.

28. Das Rao, Pleader, Sultan Bazar,
Hyderabad-Dn.

29. Dawar Husain, Pleader,
Nizamabad.

30. Chaudri Devdas Rao, Pleeder,
Nanded.

31. Shankar Pershad Dobe, Pleader,
Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

32. Gopal Rao Ekboote, Pleader,
Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

33. Fida Husain,
Dist. Magistrate, Beed.

34. Pt. Gangadher Rao,
Pleader, Nanded.

35. Ghulam Ahmad,
Pleader, Nizamabad.

36. Ghulam Husain,
Pleader, Gulbarga.

37. Ghulam Jilani, B.A., LL.B.
Pleader, Gulbarga.

38. Gir Rao, Pleader, Warangal.

39. V. Gopal Rao,
Pleader, Warangal,

40. Guroonath Rao,
Pleader, Raichur.

41. Guro Rao, Pleader, Warangal.

42. Habeeb Saith,
Merchant, Tandoor Estate.

43. Habeeb Jilani, Pleader,
Shameer Pet, Warangal.

44. Pt. Halappa, Pleader,
Gulbarga.

45. Hanmant Rao, K.
Pleader, Gulbarga.

46. Mir Hussain Ali Khan, Pleader.
Station Road, Nampally,
Hyderabad-Dn.

47. Dwarkanath Iyengar, Pleader,
Jam Bagh, Hyderabad-Dn.

48. Madho Rao Iyengar Masiker,
Pleader, Sultan Bazar,
Hyderabad-Dn.

49. Mir Jafar Ali, M.A., LL.B.
Munsif, Nizamabad.

50. S Md Jafar Husain,
Pleader. Hyderabad-Dn.

51. Jaleel Ahmed, M.A., LL.B.
Pleader, Troop Bazar,
Hyderabad-Dn.

52. Mirza Kaleem Beg,
Pleader, Warangal.

53. Kashinath Rao.
Pleader, Nizamabad.

54. Syed Kazim Husain,
Pleader, Nizamabad.

55 Kesanna, Zamindar, Gadwal.

56. Dattatri Rao Kondekar,
Pleader, Warangal.

57. J. Lakshmi Narayan,
Pleader, Warangal,

58. Madho Rao, Pleader, Gadwal.

59. Madho Rao Madikar, B.A., LL.B.
Sultan Bazar. Hyderabad-Dn.

60 Mahboob Ali, Pleader. Jalna.

61. M. Mahdi Ali, Munsif, Jalna.

62. Manzur Ahmed Siddiqi,
Pleader, Bahmanipura,
Gulbarga Sharif.

63. Md. Ahmed Bartar,
Pleader, Mahboobnagar,
Hindustani Gali, Hyderabad-Dn.

24. Mazhar Husain, Director Statistics Dept., Lal Tekari, Hyderabad-Dn.

25. Md. Osman, Pleader, Samasthan Amarchinta, Mahboobnagar.

26. Nagayya Surampali, Sahu, Samasthan Amarchinta, Mahboobnagar.

27. Nasiruddin Baresab, Merchant, Raichur.

28. Purshotam Rao, Pleader, Mominabad.

29. Palwar Lachmayya Ganlayya, Sahu, Mukarram Ganj, Raichur.

30. P. S. Patel, Pleader, Raichur.

31. Qamaruddin, Pleader, Gulbarga.

32. Rajeshwar Rao, Pleader, Nanded.

33. Syed Ruhul Hasan, Pleader, Nanded.

34. Setti Siddanna, Sahu, Raichur.

35. Shanker Lal, Pleader, Mominabad.

36. Shanker Rao, Pleader, Jam Bagh, Hyderabod-Dn,

37. Sidramappa, Pleader, Raichur.

38. V. Sita Ram, Zamindar, Samasthan Amarchinta, Mahboobnagar.

39. Venkat Reddy Pleader, Samasthan Amarchinta, Mahboobnagar.

Contribution.

(Rs. 5)

1. Abdul Azeem, Merchant, Raichur.

2. Abdul Ghani, Pleader, Nanded.

3. Abdul Hafiz Siddiqi, B. Sc., LL. M. Pleader, Hyderguda, Hyd-Dn.

4. Abdul Hai, Court Inspector, Nanded.

5. Abdul Hameed, Pleader, Nizam Shahi, Hyderabad-Dn.

6. Abdul Hamid, Pleader Nanded,

7. Hafiz Abdullah, Pleader, Nanded.

8. Abdul Qader Ansari, Pleader (Govt.) Gulbarga.

9. Abdul Qader Qureshi, B.A., LL. B. Pleader, Isa Miyan Bazar, Hyderabad-Dn.

10. Abdur Rahim, Pleader, Raichur, Near Daru-salam, Hyderabad-Dn.

11. Abdur Rahim, B.A., LL. B. Pleader, Gulbarga.

12. Abdur Rahman, Pleader, Nizamabad.

13. Abdus Salam, Munsif, Jagtiyal.

14. Ahmad Sa'id Khan, Pleader, Anduroon Darwaza Chaderghat, Hyderabad-Dn.

15. Md. Alauddin, Pleader, Gulbarga.

16. Anant Rao, Pleader, Nanded.

17. Anant Reddy, B.A, LL. B Pleader, Gulbag, Hyderabad-Dn.

18. Govind Rao Ardhapurkar, Pleader. Sultan Bazar, Hyd-Dn.

19. Asghar Husain, Pleadar, Warangal.

20. Ashvant Rao, Pleader, Gulbarga.

21. M. Azizuddin, Pleader, Outside Dood Baoli Gate, Hyd-Dn.

22. Bashir Ahmad, Pleader, Moazzamjahi Market, Hyd-Dn.

23. Syed Bashir Ali Khan, B. A., LL. B. Nanded.

24. Bashiruddin, Sessions Judge, Warangal.

106. Sirajuddin, Raf'at Manzil, Hyderabad-Dn.

107. Dr. Mir Siyadat Ali Khan, Amirpet, Hyderabad-Dn.

108. Srinivas Rao, Pleader, Bider.

109. Srinivas Reddy, Atraf Balda.

110. Sripat Rao, Judge High Court, Hyderabad-Dn.

111. Venkat Subba Rao, Pleader, Mahboobnagar.

112. V, Suryanarayan Rao, Advocate, Hyderguda, Hyderabad-Dn.

113. Khaja Tefazzul Husain, Pleader, Warangal.

114. Vinayak Rao Vaidya, Pleader, Hyderabad-Dn.

115. Venkata Chari, Pleader, Raichur,

116. Venkat Ram Narsayya Pleader, Warangal.

117. Awencha Venkat Rao, Pleader, Warangal.

118. J. N. Waghre , B.A., LL. B. Koocha Moqarrab Jung, Hyderabad-Dn.

119. Wajid Ali Khan, Pleader, Shanker Bagh, Hyderabab-Dn.

120. Yamin Zubairi, Pleader, Station Road; Hyderabad-Dn.

121. M. Zakaullah, Pleader, Aghapura, Hyderabad-Dn.

122. Zia-ul Arifin Razavi, Pleader, Raichur.

Special Contributions.

(Rs. 10)

1. I'jaz Husain, Pleader. Hyderabap-Dn. Rs. 13

2. Abdul Qadir, Ambadi Pleader, Kachiguda, Hyderabad-Dn.

3. Abdur Rahim, Merchant, Raichur.

4. K. Haji Abdur Razzaq, Raichur.

5. Nur Muhammed (for late Abubaker Sait,) Raichur.

6. Anna Rao, Pleader, Gulbarga.

7. Annaji Rao, Tulja Bhavan, Kachiguda, Hyderabad-Dn.

8. Venkat Rao Ardhapurker, Pleader, Nanded.

9. Balwant Rao, Pleader, Nanded.

10. Barey Sahib, Merchant, Raichur.

11. Bhim Rao, B.A., LL. B. Pleader, Gulbsrga.

12. Janardhan Rao Desai, Pleader, Mominabad.

13. Venkateshwar Rao Desai, Pleader, Kachiguda, Hyd-Dn.

14. Gavoli Buddappa, Sahu, Raichur.

15. Ghazanfar Ali, Pleader, Mominabad.

16. Ghulam Hafiz Khan, Pleader, Gulbarga.

17. Gir Siddappa, Pleader, Raichur.

18. Gopal Rao, Pleader, Naned.

19. Kesho Rao, Pleader, Nanded.

20. Kishen Gor, Zamindar, Samastan Amerchinta, Mahboobnagar.

21. Kishan Govind, Pleader, Mominabad.

22. Lakshman Rao Bhalchander, Pleader, Mominabad.

23. Mahmud Ali Sarwari, Pleader, Guldara.

66. **Muhammad Muhsin, Pleader, Yella Reddy.**

67. **Muhammad Muhsin, Pleader, Troop Bazar, Hindustanigali, Hyderabad-Dn.**

68. **Shaik Mohiuddin, Pleader, Raichur.**

69. Syed Md. Mustafa Husain, M. A., LL. B. Pleader, Hanuman Tekri, Hyderabad-Dn.

70. Nawab Mustafa Yar Khan, Pleader, Kachiguda, Hyd-Dn.

71. Mustansir Ali, B. A., LL. B. Pleader, Warangal.

72. Govind Rao Nagapoorker, Pleader, Sultan Bazar, Hyd-Dn

73. Nagesari Prashad, H. C. H. Munsif, Mahboobabad.

74. Venkat Rao Nandgiri, Pleader, Mahboobnagar.

75. Narayan Rao, Pleader, Bider.

76. Sridher Waman Nayak, Bar-at-Law, Begumpet.

77. Nazeeruddin, LL. B. (Previous) Near Agriculture Department, Hyderabad-Dn.

78. Y. V. Patel, Pleader, Raichur.

79. Qadir Mohiuddin, Moazzamjahi Market, Hyderabad-Dn.

80. Qurban Ahmed, Pleader, Warangal.

81. Syed Rafiuddin (Late) Tahsildar, Shahabad.

82. Khaja Rahimuddin, Bar-at-Law, Near Imperial Post Office, Hyderabad-Dn.

83. Raja Mohan Lal, City Magistrate, Zamir Munzil, Kachiguda, Hyderabad-Dn.

84. **Rajutappa, Pleader, Raichur.**

85. **Rama Chari, Abid Road, Hyd-Dn**

86. **Rameshwar Rao, Pleader, Warangal.**

87. B. Ram Kishen Rao, Pleader, Moazzamjahi Market, Hyd-Dn.

88. B. Ram Lal Kishan, Pleader, King Kothi Road, Hyderabad-Dn

89. J. Ram Rao Desmukh, Pleader, Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

90. Rangnath Rao Kadam, Pleader, Nanded.

91. Ratnaker Rao, Pleader, Warangal

92. B. K. Reddy, Pleader, Warangal.

93. K. A. Reddy, Pleader, Mahboobnagar.

94. P. J. Reddy, Pleadr, Jam Bagh, Hyderabad-Dn.

95. Sada Shiva Rao, Pleader, Near Revenue Dept., Hyd-Dn.

96. Saeedul Hasan Razzaqi, Pleader, Gulbarga.

97. Mir Sajjad Ali, Pleader, Yella Reddy.

98. Hari Ram Rao, Pleader, Nanded.

99. Kishan Rao Sathalkar, Pleader, Gulbarga.

100. Syed Shabbar Hasan, Advocate, Troop Bazar, Hyderabad-Dn.

101. Shah Alam Khan, Hyderguda, Hyderabad-Dn.

102. Shaik Ibrahim, Pleader, Bider.

103. Shakoor B g, Pleader, Warangal,

104. Shanker Rao, Pleader, Nanded.

105. Shesh Rao, Pleader, Bider.

27. Fazle Husain, Advocate, (late)
Fazal Munzil, Subedari, Warangal.

28. Ganpat Lal, Advocate
Mittika Sher, Hyderabad-Dn.

29. Lakshman Rao Gano, Pleader,
Jam Bag, Hyderabad-Dn.

30. Ghulam Muhammad, Pleader,
Katal Mandi, Hyderabad-Dn.

31. Ghulam Mustafa,
Pleader, Yella Reddy.

32. Ghulam Panjatan, Sessions Judge,
Medak, Hyderabad-Dn.

33. Gopal Rao Tuljapurker,
Sultan Bazar, Hyderabad-Dn.

34. Govind Rao Advocate,
Near Nishat Talkies, Hyd-Dn.

35. M. Guru Rao Desai,
Pleader, Kupbal Estate.

36. Gunday Rao,
Sessoins Judge, Gadwal.

37. Gunday Rao Joshi, Pleader,
Gaoli Guda, Hyderabad-Dn.

08. Hakeem Syed Ali, Advocate,
Darush Shifa, Hyderabad-Dn.

39. Hamiduddin. Qazi Pleader, Jalna.

40. P. Hanmanth Rao,
Pleader, Mahboobnagar.

41. Hanmant Rao Gudyalker,
Pleader, Raichur.

42. Hari Kishen,
Pleader. Atraf Balda.

43. Ilyas Ahmad,
Pleader, (Govt) Warangal.

44. Muhammad Ilyas Qureshi.
Munsif, Sholapoor.

45. Syed Isa, Pleader, Raichur.

46. Rama Swamy Iyengar, Pleader,
Maratpally, Secunderabad.

47. Jahangir Ali, Advocate,
Petla Burj, Hyderabad-Dn.

48. Jeyya Chari,
Pleader, Sultan Bazar, Hyd-Dn.

49. Hon. Khaleeluzzaman, Judge
High Court, Hyderabad-Dn.

50 Syed Khurshid, Secretary,
Bus & Taxi Union, Faseeh Jung
Street, Hyderabad-Dn.

51. Srinivas Rao Kagalker,
Sultan Bazar, Hyderabad-Dn,

52. Lachman Acharia,
Pleader, Kupbal Estate.

53. Venkat Rao Ladker,
Pleader, Nanded.

54. Lakshmi Narayan Prashad,
Pleader, Tulja Bhavan,
Kachiguda, Hyderabad-Dn,

55. M. Lakshmi Narsayya, Advocate,
Near Head Post office, Hyd-Dn.

56. Latif Ahmed Farooqi, M.A., LL.B.
Iqbal Manzil, Kachiguda,
Hyderabad-Dn.

57. Madho Rao, Pleader, Raichur.

58. Bhawani Rao Maholker,
Pleader, Nanded.

59. Mahmood Ali,
Kachiguda, Hyderabad-Dn,

60. Mahmood Ali, Advocate,
Chelapura, Hyderabad-Dn.

61. Manik Rao, Pleader, Nanded.

62. Marvati Rao Joshi,
Pleader, Hyderabad-Dn.

63. Syed Muhammad Ali, Pleader,
Hyderguda, Hyderabad-Dn.

64. Sahibzada Mir Muhd. Ali Khan,
Special Magistrate, Munri Manzil,
Adikmet, Hyderabad-Dn.

65. Muhammad Khaja,
Contractor, Raichur.

27. Jalil Ahmad, Advocate, Troop Bazar, Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

28. Kalimuddin Ansari, Advocate, Kachiguda, Hyderabad-Dn.... Rs. 25

29. Hon. Laxman Reddy, Judge High Court, Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

30. Madho Rao, Pleader, Nanded. Rs. 25

31. Hon. Murtaza Khan, Judge High Court, Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

32. Syed Nazir Ali, Pleader, Nanded Rs. 25

33. Hon. Syed Qamar Hasan, Judge High Court, Hyderabad-Dn. Rs. 25

34. Syed Zamir Ali, B.A., LL.B. Pleader, Koocha Abdul Qayum. Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

35. Nawab Sir Amin Jung Bahadur, Amin Munzil, Saidabad, Hyderabad-Dn. ... Rs. 20

36. Mohammed Mirza, Govt Pleader, Katal Mandi, Hyderabad-Dn. Rs. 20

37. Shihabuddin Ahmad Khan, Bar-at-Law. Near Revenue Secretriat, Hyderabad-Dn, ... Rs. 20

38. Haroon Khan Sherwani, Professor, Himayathnagar, Hyderabad-Dn. Rs, 18

Reception Committee.

(Rs. 15 each.)

1. Abdul Aleem, Pleader, Warangal

2. Abdul Aziz Khan, B. A. LL. B. Dist. Magistrate, Timorni.

3. Abdul Karim, Pleader, Warangal.

4. Abdul Ghaffar, Pleader, Yella Reddy.

5. Abdul Majid Siddiqi, M. A. LL. B. Himayathnagar, Hyderabad-Dn.

6. Abdul Qadir, Pleader, Bider.

7. Abdul Razzaq, Qazi, Pleader, High Court, Hyderabad-Dn.

8. Abdur Ra'oof, Pleader, Raichur.

9. Abul Khair Siddiqi, Pleader. Mangal Hat, Hyderabad-Dn.

10. Afzal Husain Farooqi, H. C. S. Dist. Magistrate, Mahboobnagar.

11. Mir Ahmad Ali Khan, Dist. Magistrate, Warangal.

12. Nawab Mir Ahmad Ali Khan, M. A., LL. B. Azam Munzil, Adikmet, Hyd-Dn,

13. Md. Ahmad Khalidi, Pleader, Gulbarga.

14. Ahmed Umar Bhai. Factory Owner, Raichur.

15. Syed Muhammad Ahsan, Advocate Katal Mandi, Hyderabad-Dn.

16. Akbar Husain, Pleader, Bider.

17. Aliuddin, Pleader, Moazzamjahi Market, Hyderabad-Dn.

18. Aminuddin, Pleader, Kupbal.

19. Bala Prashad, Pleader, Nanded.

20. Basangora Patel Sardar, Raichur.

21. Benkat Prashad, Pleader, Hanuman Tekari, Hyderabad-Dn

22. Bhimayya Chari, Pleader, Raichur

23. Bhim Sen Rao, Pleader, Atraf Balda.

24. Chekrahari Narsa Raj, Pleader, Abid Road, Hyderabad-Dn.

25. Dharnidher Sangit, Mittika Sher, Hyderabad-Dn.

26. Faheemuddin (Late) Pleader, Nanded.

Patronage.

1. H. E. Nawab Ahmad Sa'id Khan Bahadur. Chancellor of Osmania University and President, Executive Council ... Rs. 1000

2. Hon. Nawab Dr. Mahdi Yar Jung Bahadur, Education Member. Rs. 1000.

3. Hon. Nawab Alam Yar Juug Bahadur, Law & Religious Affairs Member ... Rs. 1000

Donations.

1. Abdullah Pasha, Advocate, Murlidhar Bag, Hyderabad-Dn. Rs. 265

2. Nawab Mir Akbar Ali Khan, Bar-at-Law Saifabad. Hyderabad-Dn. Rs. 100

3. Dewan Bahadur Arvamudu Iyengar, Advocate, Amrit Nivas, Troop Bazar, Hyderabad-Dn. Rs 65

4. Abdullah, Advocate, Agahpoora, Nazai'r Hyderabad Office, Hyderabad-Dn. ... Rs. 50

5. Abdur Raoof, Advocate, Moazzamjahi Market, Hyderabad-Dn. Rs. 50

6. Nawab Akbar Yar Jung Bahadur, Advocate, Troop Bazar, Hyderabad-Dn. ... Rs. 50

7. Badruddin Khan, M.A., LL.B. Lecturer, Osmania University. Rs. 50

8. Bala Prashad, Advocate, Kachiguda, Tulja Bhavan, Hyderabad-Dn. ... Rs. 50

9. Hon. Bisheshwarnath, Chief Justice, Chirag Ali Street, Hyderabad-Dn. ... Rs. 50

10. Husaln Ali Mirza, Head of Law Department, Osmania University, Tank Masab, Hyderabad-Dn. Rs. 50

11. Rai Manoher Prashad, Advocate, Moqarrab Jung Street, Hyderabad-Dn. Rs. 50

12. Nawab Razzaq Ali Khan Iqbal, B.A., LL.B. Khursheed Guzar, Lal Tekri, Hyderabad-Dn. ... Rs. 50

13. Kashinath Rao Vaidia, Advocate, Kachiguda, Hyderabad-Dn. Rs. 50

14. Abdur Rahim, Advocate, Moazzamjahi Market, Hyderabad-Dn. Rs. 40

15. Devudas Lohiker, Pleader, Nanded ... Rs. 35

16. Hon. Hashim Ali Khan, Judge High Court, Hyderabad-Dn. Rs. 30

17. P. J. Reddy, Bar-at-Law, Maha Bhopal Manzil, Jam Bag, Hyderabad-Dn. ... Rs. 30

18. Raghwender Rao Chaklabbi, Pleader, Kupbal Jagir ... Rs. 28

19. Hon. Abdul Hamid Khan, Judge High Court, Hyderabad-Dn. Rs. 25

20. Md. Abdul Qadir, Secretary of Nawab Salar Jung's Estate, Hyderabad-Dn. ... Rs 25

21. Hon. Abu Sa'id Mirza, Judge High Court, Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

22. Akhlaq Husain Zubairi, Pleader, Nanded ... Rs. 25

23. Nawab Asghar Yar Jung Bahadur, Bar-at-Law, Gunfoundery, Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

24. Nawab Asker Yar Jung Bdr. Legislative Dept. Secretary, Hanoman Tekri, Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

25. Rai Gurudas, B. A., LL.B., Jagirdar, Sher Dil Kaman, Gulzar Hawz, Hyderabad-Dn. ... Rs. 25

26. Hon. Husain Ahmed Beg, Judge High Court, Hyderabad-Dn. Rs, 25

Arrangements of the Conference Hall (about a hundred rupees yet to pay)	....	639
Boarding & Lodging of guests	....	333
Stationery	....	516
Miscellaneous	....	1,019
Paid to University for Luncheon	...	1,000
Returned to Law Union	....	125
Not yet received	....	111
Total	....	6,695
Cash in the Bank		2,171
Grand Total	....	8,866

Permanent Office.

The permanent office of the Conference has been established in the Law Union of the Osmania University. The expenses of the office will be borne by the present surplus and the surplus of future conference etc.

LIST OF DONOR AND MEMBERS.

A classified and alphabetical list of the donors and members of the Conference is as follows :—

> Care has been taken to make this as complete as possible, but we have received certain amounts from Mominabad etc , without the names of the subscribers. Any omissions pointed out will be gratefully welcomed.

e. of Osmania LL. B. S.

f. Activities of the Law Union of the University for the last 20 years.

4. The Conference published and sent five bulletins in English and as many in Urdu to all interested people and institutions in all parts of India.

5. The present Report of the Conference which may be had from the Office of the Conference in Hyderabad.

INCOME & EXPENDITURE.

At the time of writing these lines, the accounts were not audited nor very minute item-wise distribution of sums made. The following can therefore give only a general idea of income and expenditure :—

Income.	**Rs.**
1. Donation by H. E. the President-Chancellor	1,000
2. Donation by Hon'ble the Education Member	1,000
3. Donation by Hon. Law & Ecclesiast. Member	1,000
4. Other donations and Membership fees	5,032
5. Loan from Law Union to begin work	125
6. Sale of publications to Information Bureau	500
7. Miscellaneous	209
Total	8,866

Expenditure.	**Rs.**
Printing of the present Report	?
Travelling charges to collect funds	126
Transport and conveyance	299
Printing	1,241
Clerical and other staff	270
Allowance to volunteers	316
Law Exhibition	700

We are also thankful to the Osmania Graduates' Association whose office was ungrudginly placed at our disposal, with all the conveniences that that means.

PUBLICATIONS.

A succinct yet comprehensive brochure, the illustrated "Law and Justice in Hyderabad" was published by the Conference and distributed among all the visitors. It was based on a scholarly note originally compiled by our former Chief Justice (later Law Member & Agent of Berar) Nawab Mirza Yar Jung Bahadur, and contained very useful information on law and justice in Hyderabad, which is in advance of British India in several respects. (It may still be had from the Law Union, Osmania University, for As. *4/-*)

2. The local daily Rahbar-e-Deccan published, during the session of the conference a special number, which was very instructive and much appreciated. (A few copies are for sale in the Law Union, Osmania University). It contained the following articles:—

1. Courts and Law in Hyderabad, by M. Mazhar.
2. Hyderabad and Law, special article.
3. Contribution of Hyderabad to Law, by S. R.
4. Contribution of Deccan in the compilation of Hindu Law, by Sh. Hyder.

3. The Law Union also published at the occasion its 21 years' history under the title " Tazkira Shu'ba-e-Qanun " (which may be had from the Union for Rs. 1/14/0). It gives a comprehensive survey of the history of the administration of justice and legal education in Hyderabad as also the following:—

a. Life and Work of the Osmania Law Staff and,

b. of the deans of the Osmania Law Faculty.

c. Honorary Law Graduates of the Osmania University.

d. Lives of the Osmania LL. M. S. and,

Compilation & Publication Committee.

1. Mr. Abdur Raoof, ***President.***
2. ,, Abul Arif.
3. ,, Rashid Siddiq Husain.

Funds Collecting Committee.

1. Mr. Abdur Raoof, ***Convenor.***
2. ,, Mir Akbar Ali Khan.
3. ,, Abul Khair
4. ,, Mir Ghulam Hasan Ali.

Finance Committee.

Same as the Executive Committee.

Reception of Guests Committee.

1. Mr. Latif Ahmad Faruqi, ***President.***
   (Law Students to help as volunteers.)

Exhibition Committee.

1. Mr. Khaja Muhammad, ***Convenor.***
2. ,, Muhammad Qutbuddin.
3. ,, Suryanarayan Rao.
4. ,, Raghuyandar Rao Bhusari.

Volunteer Corps.

1. Mr. Abdus Sattar, ***Chief Volunteer.***

Prominent Sympathisers.

Among the many who helped to make the Conforence a success we must first mention the name of Nawab Ali Yavar Jung Bdr. (the then Home Secretary), without whose timely guidance and help it woutd have been impossible to hold the Conference at all. The same is true of Mr. Mir Akbar Ali Khan, who benefited the organisers with his assistance at every step. We are also very grateful fot the generous help of Mr. Abdullah Pasha, advocate.

Hon'ble the Law & Ecclesiastical Member the Nawab Alam Yar Jung Bahadur delivered the welcome address.

Hon'ble the Education Member opened the Law Exhibition, on which occasion the welcome address was delivered by Hon'ble the Chief Justice.

The invitations were issued in the name of the President of the Reception Committee (the Law & Ecclesiastical Member) and the Vice-President (the Vice Chancellor of the University).

The guests were entertained by H. E. the President at an At Home, by the Vice-Chancellor at a Luncheon, by the President of the local Lawyers' Association (Mr. Abdul Wahid Uwaisi) at a Dinner.

Many of the guests coming from outside the Nizam's Dominions stayed at the government Guest House.

Working Committee.

The University authorities had appointed a small executive committee, with Dr Nazir Yar Jung as chairman, Prof. Husain Ali mirza as member, Dr. Hamidullah as treasurer, and Mr. Shaikh Hyder (the President of the Law Union) as local secretary.

The general Working Committee, consisted of the Executive Committee and the following :—

1. Raja Bahdur Bisheshwarnath.
2. Nawab Ali Yavar Jung Bahadur.
3. Nawab Mir Akbar Ali Khan.
4. Mr. Muhammad Abdur Raoof.
5. ,, Rashid Siddiq Husain.
6. ,, Abul Khair.
7. ,, Suryanarayan Rao.
8. ,, Latif Ahmed Faruqi.
9. ,, Ghulam Ahmed Khan.
10. Dr. Mir Siyadat Ali Khan.
11. Dewan Bahadur Arvamudu Iyengar.
12. Mr. Khaja Muhammad Ahmad.

Proceedings of the First
ALL INDIA LAW CONFERENCE,
Hyderabad-Deccan Session.
1944.

Lawyers and law-practioners are in the forefront of every social and political activity of our country, yet it was curious that there was no organisation of their own. The Law-Union of the Osmania University had planned as far ago as 1928 a Law Conference to be held in Hyderabad but for some reason or other this plan did not materialise.

Conferences of Advocates and other law-practitioners have been held several times in Hyderabad as well as in British India. Yet a conference was still needed in which lawyers, legislators, judges, professors and students of law as also those who are otherwise interested in legal science could commonly take part.

At last the efforts of the Law Union of the Osmania University bore fruit and the University decided to hold the first All-India Law Conference in 1944 at Hyderabad. War time scarcity of paper constrains us to prepare the shortest possible report.

PATRON.

His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad & Berar was very graciously pleased to become the patron of the Conference, and sent a very inspiring message.

Inauguration.

H. E. the Chancellor of the University and President of the Executive Council consented to open the Conference and it was he who conveyed the Royal Message.

PART II

LIST OF PAPERS

Not Included in the Proceedings.

——x——

We regret that the following monographs contributed to the Conference could not be included in the proceedings for shortage of paper. The presidential address of Principal Siva Subramanian of Benares could not be revised by him in time due to his prolonged indisposition. Some of the papers will be found in Urdu section of this volume.

1. Presidential address of Principal Siva Subramanian of Benares, on A Comparative Study of Roman and Hindu Laws.
2. Prof. Husain Ali Mirza, Administrative Law.
3. Mr. M. A. Waheed, Historical Evolution of Muslim Law.
4. Mr. V. Suryanarayan Rao, Conception of Law and Sovereignty in Hindu jurisprudence.
5. Mr. B. N. Chobe (printed privately)
6. Mr. Khaja Hamid Ahmed, Commercial Laws of Hyderabad.
7. Dr. Siyadat Ali Khan, Realistic Tendencies in American Jurisprudence.

   (printed privately)
8. Mr. Bashir Ahmad, Kelson's pure Theory of Law.
9. Mr. M. P. J. Reddy Development of Hindu Law.

———

I conclude with the last remark that a work called ***Ahkam ahl adh-Dhimmah*** by the erudite savant Ibn al-Qaiyim has been discovered in Ms. form in Hyderabad. Its first volume consists of more than six hundred pages. It is incomplete and refers to the succeeding volume or volumes which however are unfortunately missing. The work is very rich in material bearing on our subject. If any of my readers happen to know of the missing volumes and kindly take the trouble of informing me it will be gratefully acknowledged.

Muslims States anything except citizens of their political denomination. Even the Orthodox Sa'udian Kingdom has passed laws of nationality applicable to Muslim pilgrims and immigrants wishing domicil and naturalisation.

b. Muslims in Non-Muslim Lands

In classical times, Muslims have enjoyed extra-territorial privileges in many lands. The story begins with Muslim refugees in Abyssinia of the time of the Prophet, and repeats itself in China, in Turkistan, in Malabar (India) and in many other countries.

I have contributed a special monograph on the subject to the Urdu section of the Osmania Magazine (Osmania University), 1943 and I need not give details here. Briefly, however, in those days there was no established legal notion to concede extra-territorial privileges but the treatment varied with the whims and interests of individual monarchs of non-Muslim lands. Muslims have alike seen favours and hardships. A curious story is told by Mas'udiy that in a certain Caspian region, the local Non-Muslim ruler had employed Muslims in his bodyguard and had instituted a most elaborate judicial system. Since his subjects consisted, of peoples of many communities, there were many "communal courts" with seven communal judges. Whenever there was some difficulty in solving difficult problems, the matter was referred to the Muslim section and they abided by what Muslim law provided for the case. (Cf. ***Muruj-udh-Dhahab***, II P. 10–12 ed. Europe.) I conjecture that inter-communal matters were also one of those difficult matters referred to the Muslim judges for adjudicating, and this for their impartiality and learnedness.

Conclusion.

Thus it will be seen that the question of Conflict of law according to Muslim jurists is a very rich field yet quite an untrodden path promising very interesting discoveries for patient researchers.

Againt if only the husband embraces Islam and the wife does not, the case is much more complex. For the marriage will remain intact only if the wife belongs to those categories of Non-Muslims with whom Islam permits marriage, to wit, Scripturaries or people who claim a Divine Book as their code, such as Christians and Jews. In Mughal India even Hindus seem to have been included in this category and for such Hindu girls even domestic temples were constructed for devotional purposes by thir Muslim husband.

If the wife is not a scriptuary, she will be asked to make herself fit to be wife of a Muslim by changing her religion. If she rafuses, separation will follow.

The Islamicisation of only the wife entails that the husband should also embrace Islam within three months, during which period he cannot continue conjugal relations. If he refuses to covert, separation follows.

Naturally, if the Jewish wife of a Muslim, for instance, becomes Christian, it cannot affect the marriage since in the eyes of Islam both Judaism and Christianism are alike tolerable in a wife.

4. MUSLIM CITIZEN IN FOREIGN LANDS.

a. In another Muslim State

In classical times, not much importance was attached to the origin of a Muslim. The mere intention of stay for a couple of weeks rendered him a local citizen, forfeiting all concession in devotional services etc. recognised for one on travel.

Ibn Jubair , the famous traveller, however, mentions that he saw in Cairo that Sultan Salahuddin had appointed a monitor from among the Maghribis to adjudicate between his compatriots residing in Egypt.

In our present time, political nationality has come into play, largely due to the fact that Non-Muslim States of Europe would not tolerate that their Muslim subjects should be considered in

decide ? Of course, where the qazis are bound to act according to the State school of law, no matter to which school they personally belong, there will be no difficulty. Yet if the State is more tolerant and every citizen has the right to be administered according to his own school, especially in matters of what are called personal law, a real conflict of law arises. In Egypt in the time of Sultan Salahuddin, for instance, we come across four concurrent judicial establishments with four chief justices and necessary jub-judges for each of the four Sunni schools, viz. Shafi'iy, Hanafi, Maliki, and Hanbali. Yet this did not solve the problem if the litigants belonged to different schools. Classical writers do not seem to mention this. In later times the law of the defendant or the deceased, as the case may be, was decided to prevail. The same has been the rule in Hanafiy, Shafi'iy and Maliki States. Even in modern British India the same has been accepted and the same is the rule in Tunis and Egypt.

In India and also in other Muslim countries there have been cases of the conversion of rulers from Sunni to Shi'ah schools and vice versa, yet so far my researches have failed to resolve the problem whether and what effect did this produce on the administration of justice.

d. Change of Religion.

If a married couple embraces Islam, their pre-Islamic contract of marriage remains valid in so far as it is compatible with Islamic law. The rest will be annulled. Far instance, Parsis, practising *Khuwaidhugadis* and marrying their own sisters or daughters, or animists marrying more than four wives, or marrying without bride-money (*Mahr*) or Nairs practising polyandry and the like cannot expect to remain uneffected by Muslim law. The Parsi wife will at once be separated; the polygamous husband will select only four and the rest of his wives will be divorced ; the wife without bride-money will get a new right to *mahr* ; and the polyandrous wife will be separated from all of her husbands (except one ?)

not take cognizance in the initial stage. For, according to Muslim jurists, all Non-Muslim religions constitute one single community (*ummat*) vis-a-vis the Islam. But if the parties cannot agree among themselves as to the choice of the tribunal and the law, Muslim law shall have per force the final say, as has been mentioned by the famous jurist Khalil. There is no difference between civil and criminal cases in this respect. I wonder what will be the decision of the Qazi if the litigation relates, for example, to a contract of loan with interest or sale of wine; which are prohibited by Islam yet may not be so by the religions of the Non-Muslim parties to the case.

c. Between Two Muslim Laws.

The difference between the various schools of law, such as Sunni and Shi'ah or even Hanafi and Shafi'iy and the like are products of later times. In the time of the Prophet and early Caliphate this kind of Conflict was practically unthinkable. No doubt, after the death of the Prophet, differences of opinion between various jurists did come early into existence, yet the Qazis were not obliged to abide by particular jurists but themselves formed an independent category, and each judge was at full liberty to decide according to his own personal view. Nevertheless we have clear references in the Abbasid period that the Chief Qazi Abu Yusuf, for instance, appointed only the followers of the Hanafi school as qazis. In later times, according to the evidence of Yaqut, even Zaidi Shi'as were appointed qazis in Hanafi States and they administered justice according to Hanafi jurisprudence.

To make me clearer, take for instance a person dying and leaving one nephew (brother's son) and one grandson (daughter's son). According to Hanafi law, the nephew succeeds to the whole of the deceased person's property to the exclusion of the grand-son; and according to the Shi'ah law just the opposite. It is quite possible that the deceased person and his heirs belong to different schools. According to which school should we

regarding homicide certain jurists hold that capital punishment cannot be inflicted upon a Muslim accused of murdering a Non-Muslim but that he will have to pay only blood money. Yet the Hanafis hold that no distinction can be made between a Muslim and a Non-Muslim citizen ; and they are supported by a saying of the Prophet. Neverthless, even Hanafis are reluctant to take the life of a Muslim who has committed homicide against a Non-Muslim of a foreign country. Shaibaniy, the pupil of Abu Hanifah seems to be the only exception, and he holds that so long as a Non-Muslim alien resides in Muslim territory with permission, he has same rights and obligations as a Non-Muslim citizen ; and *lex talionis* will apply against the Muslim accused.

Muslim jurisprudence is very emphatic regarding the difference of jurisdictions. So much so that if a Muslim, citizen of the Islamic State, is murdered, robbed or otherwise subjected to illegal handling by a Non-Muslim in a Non-Muslim territory where the Muslim had gone on lawful avocations with the consent and permission of the foreign government, and later the culprit came to the Islamic territory, no suit can be filed against him in the court of the Islamic territory. For, the jurists argue, the cause of action arose in a place where Muslim jurisdiction did not run. (Sarakhsiy, *Mabsut*, X, 95–97). Even the Prophet is said to have prescribed :—

> " Whoever commits murder or fornication or theft (in our territory) and escapes, and then returns with permission, shall be tried and punished for what he wanted to escape from. Yet if he has committed murder or fornication or theft in the territory of the enemy and came with permission, he will not be tried for what he committed in enemy territory." [Sarakhsiy, ***Sharh as-Siyar al-Kabir***, iv, 108].

(b) Conflict between two Non-Muslim Laws.

If the parties to a case belong not to one but different communities, such as Jew versus Christian, the Muslim court does

Even if it had been for no other reason than the policy of excluding Non-Muslims from key-posts of administration, he would have been justified Not even a decade had yet passed over the expasion of Islam, and the importance of the post of the secretary of the all-powerful governor cannot too much be emphasised. This same Caliph 'Umar left thousands of Non-Muslims in the revenue and finance and other departments undisturbed in posts of trust and responsibility. Even the office work was let continue in Greek and Persian, not in Arabic, in these departments. It was again this same Caliph who demolished a mosque for the simple reason that it was constructed over a piece of land forcibly acquired from a Jew; and he returned it to the original owner. There the famous *Baitul Yahudi* continued to exist down to our days. (Cf. Cardahi).

The Non-Muslims could come to 'Umar to Mecca and Madinah and make complaints personally and file petitions unhindered. Many incidents of their over-prompt disposal have been recorded by history.

Islam does not permit compulsion in believing in any particular religion. It is unthinkable in Islam to order in accordance with a royal rescript in Yaman in the Christian Najran that the Jewish girls cannot be married to Jews but to Christians only. (Cf. Desvergers, *L'Arabie.*)

3. Conflict between Laws.

(a) Between Muslim and Non-Muslim Laws.

If one of the parties to a case is a Non-Muslim and the other a Muslim, and the cause of action has arisen in the Islamic territory, the case comes before the Muslim tribunal, and usually Muslim law prevails. Regarding civil suits, there is not much difficulty. In penal cases there are certain exemptions and qualifications in favour of Non-Muslims. Firstly certain acts, such as intoxication, marriage within prohibited degree and the like are not considered crime if committed by Non-Muslims. Secondly,

I need not enter here into the details of the difference of opinion of the various Muslim schools of thought regarding the different topics of the conflict of laws concerning the personal status of Non-Muslim subjects as well as foreigners. A few characteristic features may be brought into relief here.

Muslim jurists maintain that the difference of religion as well as the difference of territory constitute a bar to inheritance Thus a Muslim may lawfully marry a Jewess or a Christian girl, yet the husband and wife cannot inherit each other The property be longing to the wife would go to her coreligionist relatives, father, mother, brother, etc , to the exclusion of husband, children and other relatives of Islamic faith. Testamentary bequests, however, can lawfully be effected in favour of persons of other religion or other terrirory for lawful purposes. Endowments have also the same position as bequests.

Surplus-property tax (*zakat*) is levied solely on the Muslims, yet its benefits are not bounded by Islam alone. According to the interpretation of such a high authority as the Caliph 'Umar, the ***Masakin***, which according to the Qur'an are one of the categories benefiting from the ***zakat***, mean Christians, Jews, and other Non-Muslim citizens of the Islamic territory. (Cf. Abu Yusuf yet the) taxes collected .from Non-Muslims by their communal administrations are spent exclusively on particular communities.

The high sense of justice prompted the Hanafi school of jurists, which represents by far the largest group of Muslims of the world today, to maintain that a Muslim must be punished capitally for the homicide of even a Non-Muslim. Though some other jurists are reluctant to go to this length yet the Hanafis are fortified by an express saying of the Prophet.

Much capital has been made out of an incident of the time of the Caliph 'Umar, in which he had ordered one of his gover-rnors to dismiss the latter's secretary who was a Christian. It is elated that his proficiency in the State language was poor.

6. Outraging the sanctity of God, His messenger, and His Books,
7. Causing a Muslim to apostatise,
8. Indulging in brigandage,
9. Publicly acting upon something in contravention of the cherished principles of Islam,
10. Indulging in usurious transactions,

and the like.

Regarding several of these, however, there is no unanimity among differrent Muslim schools of law. Those jurists who have had practical experiment of holding high government offices are, as a rule, more lenient than those who theorise from the seclusions of their seminaries.

A citizen Muslim can never be expelled from territory, even in punishment, though internment or externment orders can be passed against him. A Non-Muslim citizen, however, can not only be punished with the capital punishment downwards but he may even be ejected from Muslim territory if he becomes an undesirable person for his pernicious activities.

According to the Qur'an, Hadith and continuous practice from the time of the Prophet downwards, Non-Muslim residents of the Islamic territory enjoy judicial autonomy. Christians, Jewish, and other denominational courts are established, with their own laws and their own judges; and are resorted to in cases where both the parties belong to the same community. The Non-Muslims are, however, not denied the right to present themselves before the Muslim Court if they choose this of their own free accord in preference to their communal Court. The same must have been the case if the parties belonged to different communities, a Christian and a Jew for instance. In all such cases the practice of the Prophet was to administer them their personal law even in criminal cases such as homicide and fornication. (Cf. Bukhariy, Ibn Hisham etc).

right of granting *aman* belonged to every Muslim citizens, yet later jurists have opined that the government has right, by express declaration, to suspend temporarily this general right and prescribe conditions to be abided by the public.

In the early centuries of the Caliphate, the duration of the sojourn of an alien Non-Muslim in the Islamic territory used to be a year at the most. A longer stay implied intention to domicile, and he was then subjected to same taxation and obligations as the ordinary Non-Muslim subject. In later times when resident aliens wanted on political grounds to retain their original nationality, which meant privileged position, especially in Turkey of the capitulatory period, an agreement was reached in 1535 between Turkey and France for extending this period to ten years. As the capitulations were forced on Turkey, Muslim jurists have never taken notice of them and they still continue to mention the traditional one year's limit in this connection even in our changed times.

2. Status of Non-Muslims, Subjects and Aliens.

Non-Muslim subjects of the Islamic State are called *Dhimmis*. The "dhimmification" is, according to Muslim jurists, a regular bilateral contract between the intending Non-Muslim subject and the Muslim community. If the dhimmi owns loyal allegiance and pays the protection tax, called *jizyah*, he gets the freedom of residence, freedom of conscience, and protection of life, property and honour.

The contract of "dhimmification" comes to an end in cases like the following :—

1. Rebellion,
2. Denial of the obligation of the protection tax,
3. Denial of the obedience to the Government,
4. Fornication with a free Muslim woman,
5. Espionage in favour of, and giving asylum to the enemy of the State.

as has expressly been mentioned by Abu Yusuf. Yet the Qur'an lays down that the Muslim State is not responsible to protect Muslims if they choose to reside in Non-Muslim lands, and Muslim Courts also neither claim nor exercise jurisdiction for the acts or even sufferings of Muslims in foreign lands.

There is some difficulty in deciding the ***ummat*** or nationality of a founding and of a baby born of Muslim father and Non-Muslim mother or of protected Non-Muslim father and alien mother. In this connection Muslim law lays down a general rule that the baby will follow that *ummat* which is better in his interest. So, the foundling discovered in the Islamic territory and baby born of Muslim father will be considered Muslim; and the baby born of parents one of whom is non-Muslim ***citizen*** and the other an ***alien*** will become a non-Muslim ***citizen*** of the Islamic State. This will however be a ***prima facie*** presu.nption which might be rebutted on production of evidence.

Islam tolerates among its subjects all religions. Some exception has, however, been made regarding the habitability of the spiritual centre of Islam, the Arabian Peninsula, where Non-Muslims are not to be permitted to settle for permanent stay. Apart from this rather political and social exigency, Christians, Jews, Magians, idolaters and all else are protected when they decide to reside in the territory of the Muslim State and to obey its laws. So, Abu Yusuf expressly say (in ***Kharaj***, p. 73) that polytheists, associators, worshippers of fire or stone, scriptuaries and all the other categories of Non-Muslims may be accepted as protected citizens of the Muslim State.

There is some difference between Non-Muslim citizens and Non-Muslim aliens. The latter must first obtain permission to enter Muslim territory. This permission can be granted by any Muslim citizen, even slaves and women. During his sojourn in the Muslim territory, such a Non-Muslim alien has, subject to the terms of the safeguard permit (***aman***) practically same rights and obligations as ordinary Non-Muslim citizens. Originally the

and per force these latter are in our days legislating laws of nationality based on birth and domicil. Yet these are political exigencies of the international life which have nothing to do with my thesis, that according to Islamic notion, nationality means common belief, not common birth or colour or language or country.

One will not wonder therefore to see for instance in the Christian England, alien Christians yet citizen Muslims, and in Muslim Afghanistan alien Afghans yet citizen Indians !

It is natural therefore that Muslim jurists have treated at length the question as how to behave the "alien compatriots", when these do not choose to subscribe to the common belief of the ruling community. The detailed description of the treatment of such "alien compatriots", or protected communities *(ahl adh-dhimmah)* as they are called, is beyond the scope of this small paper. Generally speaking, the inhabitants and residents of an Islamic State fall under the following categories :—
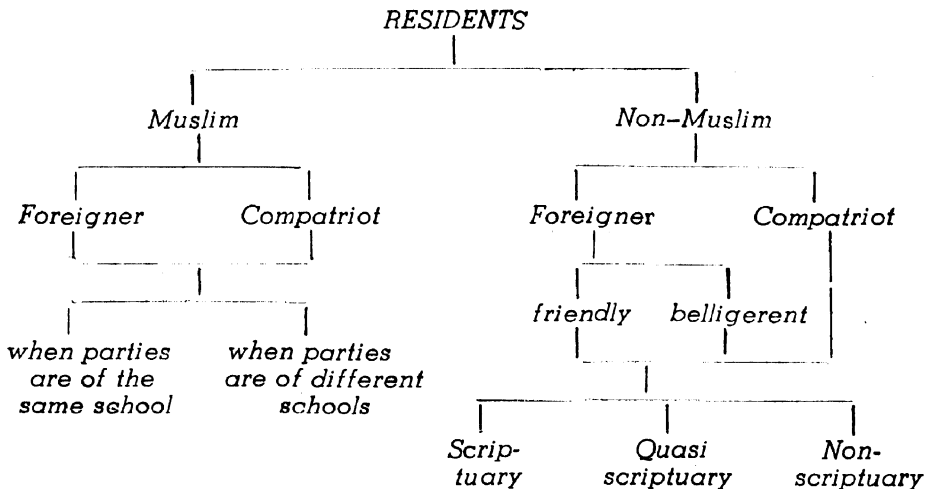
There is complete equality between all the Muslims, and no class or caste distinction is recognised by Muslim Law. All the Muslims belong to one and the same *ummat* (and for the matter : *Nation*) wherever they might be, and are subjected to same laws,

Thy implied nothing more for Islam.

In the verse cited before ethnic basis was discarded. Here linguistic and chromatic differences have been relegated to unimportant positions. Emphasising on the all-important aspect of human choice or belief, it even provided for a sort of ***basic faith***, the minimum necessary for a true human being and susceptible of acceptance by the generality of mankind :—

> "Lo! those who believe (in what is revealed unto thee, O Muhammad, i. e. Muslims), and those who are Jews, and Christians and Sabeans,—whoever believeth in God and the Last Day and doeth right,—surely their reward is with their Lord, and there shall no fear come upon them neither shall they grieve." (Qur'an, 2 : 62, 5 : 69).

But I must warn my audience and my readers against something by which one may impute to me ignorance of history. I know, Muslim history has been recording political "sub-nationalities" among Muslims from very early days. It began with the Shi'ah and Sunni difference, and other ramifications were only a matter of time. Later still, even among the orthodox Sunnis it was admitted that :—

> "The distinguishing factor between the Muslim and Non-Muslim territories is the difference of authority and administration. ***The same is true of the different principalities even within the Islamic territory, which are distinguished from one another*** by the domination and the execution of authority (i. e jurisdiction)" (*Al-Asrar* of Dabusiy, fol. 151b. (MS. Istanbul.)

All this is, again, a matter of sub-choice and nothing fatal or accidental. Perhaps I may even say that these differences are minor and subsidiary domestic strifes, not separations and alienations.

Nor do I deny the fact that the impact of modern European Civilization on Islamic populations has had considerable influence

People are many a time misled by the expression that in Islam there is no difference between religion and nationality. Yet they do not mean in this respect by religion exactly what a Muslim understands thereby. Perhaps it would be safer and more exact if we express us by saying that it is not the kinship in ethnological, geographical, linguistic or other similar current senses but it is the participation in the same idealogy or outlook on life which constitutes Islamic Nationality. For, if we mean by religion the relation of man with his Creator, Islam is not merely a religion, it is much more than that. Islam provides a code of conduct for its followers in all walks of life, spiritual as well as material and social. In this sense, Islam was a protest against prevalent Brahmanism according to which salvation was due only to those who were born among the caste of hereditary Brahmins. It was a protest against the prevalent Christianity according to which man was originally sinful and that he was no more individually responsible for his acts, someone else being sacrificed for his redemption. It was a protest against the prevalent Magism, Mazdaism, Paganism, and all else which took away choice from man.

One cannot change one's ethnic nationality. It is as impossible to change one's chromatic nationality. (Indians and Europeans being from the same racial stock, they can best illustrate my meaning in the present-day South African politics.) To change one's linguistic nationality is practically as difficult. If the reunification of the sons of Adam and Eve was intended and their accidently centrifuged tendencies were to be remedied, it was, according to Islam, necessary to reorientate " nationality " on choice rather than on some fatal accident. The choice selected by Islam was Belief or Outlook. As to other bases of nationality, it declared :—

> " And the difference of your languages and colours, lo! herein indeed are portents (of the mastery of the Creator) for men of knowledge." (Qur'an, 30 : 22).

4. The Status of Citizens of thé Muslim State in :—

  a. another Muslim State,
  b. a Non-Muslim State.

In the short space available in a conference paper like the present one only the broad outlines may be sketched. I shall, moreover, borne myself with the orthodox opinion without going into the practice of several Muslim States, old or new, not warranted by Muslim Law.

1. Nationality.

The origin of what we now term ***nationality*** must have been in blood-relationship. With the progress of human civilization other factors have also contributed to consolidate political units. And in fact we come across geographical linguistic, ethnic, chromatic, tribal and other prejudices which in the impressive and imposing academic parlance have in different ages and climes been styled as national consciousness.

In Arabia, the cradle of Islam, too, same must have been the case in the " Days of Ignorance ". It is an irony of fate that a member of the most arrogant and self-conceited clan of the trabalistic Arabia, Quraish, was destined, as the Messenger of Islam, to proclaim on behalf of the Almighty :—

> " O mankind ! Lo ! We have created you from a single male and female, and We have made you nations and tribes that ye may distinguish one another. Lo ! the noblest of you, in the sight of God, is one who feareth (Him) most. Lo ! God is Knower, Aware. (Qur'an 49 .13.)

This was a new orientation of human thought on the subject of nationality, and in fact a charter of Muslim Nationality. It was acted upon in the time of the Prophet and was also so in every subsequent age down to our very days. And wherever the "***crescent***" has flown high, it has meant Equality of Man and Priority of the Pious.

ISLAMIC NOTION OF CONFLICT OF LAWS

BY

Dr. Muhammad Hamidullah

Osmania University.

There is a branch of law indiscriminately called Private International Law or Conflict of Laws. Its importance is growing with the increase in the interdependence of sovereign nations and their cultural enlightenment. Its main topics in general are Nationality, Personal Status and Jurisdiction over foreigners.

It is to be noted that no hard and fast line can be drawn between the public and the private international laws; and in fact several topics are discussed in both the sciences. It was perhaps due to this fact that the classsical Muslim jurists did not treat them separately but in one and the same chapter of the legal compendia. However for our present purpose we shall try, as best we can, to glean relevant data and reconstruct a separate whole.

I have advisedly not chosen the term " Muslim Conflict of Laws ", for it may mean only that part of Muslim law which pertains to the conflict between different schools of Muslim law, such as Shi'ah and Sunni when the parties to a case belong to these different schools. What I mean by Muslim Notion of Conflict of Laws is much wider. I shall treat not only with questions of :—

1: Nationality and

2, Status of Resident aliens but also with,

3. The Conflict of Laws :—

   a. between Muslim and Non-Muslim Laws,

   b. between Various Non-Muslim Laws,

   c. between various Muslim Laws,

   d. on account of change of religion, as also with

(a) In *Personal Laws*—the *historical* and *social* aspect has to be borne in mind. Hindu, Muslim. and Roman Laws cannot be studied without a proper historical perspective.

(b) *Jurisprudence* often requires considerations drawn from philosophy and sociology.

(c In *Legislation* a grasp of the principles of *construction* is necessary ; and the method of *Deduction* must be carefully considered.

(d) In *Uncodified law*, like equity, torts and customary law, we require the study of the binding authority of *precedent*, and the method of *Induction* from reported authorities has to be stressed

Conclusion. (a Importance of personal contact between teacher and student. (b) Proper *standards* of *research*, and its *methodology* must be established. c A student should be encouraged in the final stages to migrate from one University to another.

Synopsis of a paper on the Teaching of law in Indian Universities.

Principal A. A. Fyzee,

Law College, Bombay.

Introduction. Indian conditions are different from European and yet it is necessary to consider the question from a comparative point of view and see what is done in England, France, Germany, Russia and America.

Objects to be achieved, may either be (a) cultural or (b) professional. Our main difficulty is that both are attempted, without making a proper distinction between a University course and a course for a professional career. A University course may stress historical or juristic studies of a more fundamental character; a professional course gives a fair background of law for the purpose of setting the man up in the practical work of legal business. In a professional man quickness of mind, and in a research student profundity and solidity, are desirable.

Methods. (1) Lectures,

(2) Tutorial work, "Supervision" —where a candidate solves papers or questions in writing.

(3) Seminar,

(4) Moot Courts,

(5) Encouragement of private reading by personal contracts and study circles.

Each method to be examined with care.

In a professional course conducted tours to the different courts may also be undertaken.

Subjects. The most important rule is to classify subjects and to discuss methods. Not every subject can be treated in the same way. For instance :

to his parents asking them to find a suitable woman for his bride. The parents, following the usual customs and rules, fix on an eligible person. Then they intimate to the girl's parents that they are desirous of securing her marriage to their son in America The parents on either side spare no pains in inquiring into the character, social standing, family relations, genealogy, health and education of the young man and woman. If this investigation proves satisfactory, both to the parents and the prospective groom and bride, the man in America sends his photograph to the woman, and receives her photograph in exchange. This 'interview' through photographs proving satisfactory to both parties, the nuptial knot is tied at a ceremonial dinner in which the groom, living in America, is naturally absent, but which is attended by the bride and the parents and relatives of both sides. This done, the parents register the marriage with the proper authorities. This marriage has been regarded as valid both by the Japanese and the American Governments. In many cases exchange of photographs is not required, because it frequently happens that the prospective groom and bride were born in the same town or village and have known each other since childwood."

It may be said, in conclusion, that the movement of all progressive societies in the East is from polygamy to monogamy. In this connection we may take the case of modern Turkey as an outstanding example. In the land of harems, where polygamy was the order of the day, the enactment of the Turkish Civil Code, based on the Swiss Civil Code, abolishes the practice of a man having a plurality of wives at the same time. It is a "consummation devoutly to be wished" that sooner or later other Eastern nations will walk in this matter in the foot steps of Turkey. In the words of a well-known poet :—

> " The old order changeth, yielding place to new,
> And God fulfils Himself in many ways,
> Lest one good custom should corrupt the world "

———

Mohammedan plurality. Side by side with manogamic marriage, concubinage has always existed. The system was plainly recognised in the ancient laws of Wales. In the thirteenth century, in England, the mistress, ' the concubina legitima ', was often the companion of the wife. There are many facts in early Christian history that show an ecclesiastic recognition of the tendency of men towards variety or polygyny.

Even in Puritan times there was a measure of toleration for those who could not remain content with one woman; for we find a writer, in 1658, asserting that it may be in ' every way consistent with the principles of a man fearing God and loving holiness to have more women than one to his proper use ".

Taking the other group, in a sense all marriage laws may be divided into two broad divisions, namely, (1) those which are based on the conception that marriage is a sacrament, and (2) that it is a contract. If marriage is a sacrament, as it is among the Hindus and the Roman Catholics, there is absolutely no room for divorce, for their Jurists hold. " What God hath joined together let not man put asunder ". Hence, it may be said that the Hindu widow's remarriage Act and similar statutes, the products of British Indian Legislation, have made inroads into the sacredness of Hindu marriage.

If, on the other hand, marriage is regarded as a contract, it follows that what is formed by mere agreement of the parties may also be dissolved by their consent. Hence we find in ancient Roman Law as well as in Muhammadan law and modern English law there is room for divorce.

Speaking about marriage as a contract, one is reminded of a peculiar type of mrrriage, known as " picture marriage " which is practised even at the present day in Japan. It may be briefly described as follows :—

" When a man (Japanese) living in America desires to marry, but is prevented by various reasons from going home, he writes

ancient Roman Law and their origin may be traced to the practice of matriarchy.

Regarding polygamous and monogamous marriages, it may be said that, as a general rule, marriage in the West, i e., those countries in Europe and America, which are based on Greek and Roman traditions, is essentially a monogamous one, whereas most of the Eastern nations, generally speaking, recognise polygamy as a legal institution, as for example, the Hindus the Muslims, the Chinese. All the same it is of some interest to note that even among the people of the West there are persons who advocate polygamy. In the words of Robert Roberts: 'Hallam points out that the Germen reformers, even so late as the sixteenth century, admitted the validity of a second or third marriage contemperanuously with the first, in default of issue and other similar cause. And Schopenhauer, three centuries later praises the Mormons because they have made converts by throwing off what he terms 'the unnatural bondage of monogamy'. Similar sentiments may be found in the works of Edward von Hatmann,' who observes that the natural instinct of man is in favour of polygamy, and that of woman in favour of monogamy". And conversly there are some among the Eastern nations who condemn polygamy in no uncertain measure. Further, as we all know, at any rate in India ordinarily monogamy is the rule and polygamy the exception. On the other hand the West, although supposedly monogamous, monogamy in the strict sense of the term, is practised more in the breach than in the observance. In this connection the following words of a learned writer are pertinent to our subject:—"Christianity and Christian legislation have not succeeded in annihilating the wandering sexual longings of those men and women in whom basic and pristine emotions survive."

'What is the meaning of maintaining monogamy?' wrote James Hinton. 'Do you call English life monogamous?'

Our monogamy is constantly varied by polygyny, or pseudo polygamy, lacking the sanctions and responsibilities of

THE LAW OF MARRIAGE—A SHORT STUDY IN COMPARISONS AND CONTRASTS.

Dr. Hamid Ali, LL.D. (London),

Law College, Madras.

To a student of comparative jurisprudence it is a subject of entrancing interest to study the marriage laws of various countries. It is but natural that it should be so, considering that marriage is the very foundation of civilised society. "In the marriage customs of mankind we trace, as Goethe said, 'the beginning and the end of all culture'. The history of civilisation is chiefly the history of the loves of men and women".

In dealing about different marriage laws let us divide them into the following groups:—namely, Group I comprising:

(1) Monogamous,

(2) Polygamous, and

(3) Polyandrous forms

And

Group II which includes:—

(a) sacramental, and

(b) contractual types.

Turning to polyandrous system first, let us take for example, ***sambandam***—a system of union between the sexes which existed among certain communities in the West Coast of South India. It is usually referred to by anthropologists as "Nair polyandry", which at the present day may be said to be "dead as the dodo". Historically speaking, ***sambandam*** is very much like "***mut'a***" or the temporary or "lease-hold" marriage as it existed in pre-Islamic Arabia. In both these forms, the Relationship was effected without much ado as to forms and ceremonies as they were based merely on the consent of the parties and they were dissolved in the same informal manner in which either party could terminate the relationship at his or her discretion. It may be noted while passing, that these two types have a remarkable resemblance to the ***matrimonium non justum*** of

Our loves give rise to hates; begin to end;
The permanent is ever one, intact;
That life alone can human misery end,
In which we bravely live the only fact.

Perverted wrong can never remedy be,
To states however hard in misery,
Unless we cure the errors primary;
Our evil's form we cannot even see.
Therefore on Oneness always concentrate,
Realise and live that only real state.

---

this law of love, there is no offence, no complaint, no punishment, no law, no enforcement.

Is it not yet time that humanity should retrace its steps backward from man-made and artificial laws to the real laws of Divinity that keep humanity in love, peace and unity, without fear of a breach ? The present perplexing conditions of human societies should serve as an eye-opener to us, that we should turn to training the human being to a life of spiritual rectitude.

While variety is the law of change in creation, oneness is the central or in-running principle that combines all into the One out of which all are born. Hence Christian Law, Hindu Law, Islamic Law, Jewish Law, Manu's Law, Law of Parasara, of Yagnavalkya, Law of Sankha, Law of Lakhita, Law of Mitakshara, Law of Contracts, Law of Transfer of Property, Law of Evidence, and all other laws are all the law of Hitakshara or the law of human welfare according to different conditions. Practicability is the central law of One-ness. Variety of creation is false in view of the changing form it is true in virtue of its being a phase of Manifestation of the One Real. The Real is a term in law. Where are Greece and Rome, which as the mistresses of the law contributed our modern English and Indian Laws. They are now battlefields which have lost their former supremacy.

The more I speak the more I have to speak, the less the less.

Hence I conclude with the Real Remedy, which is only one for the whole creation. All laws of nations, communities and humanity are summed up therein. The sonnet was written years ago, and it runs as follows :—

The Real Remedy:

Evil arises from perverted sight ;
Perversion from aloofness ego's comes ;
When ego merges into Oneness right,
Goes separation, all to oneness sums.

as they have to, from the lower wordly plane, and miss the higher motive, which does exist in the individual, in spite of his wordly or conscious knowledge, motive and action. The operation of law should properly be to raise the inner higher motive and capacity in man to a higher level and call it into operation or action in ordinary levels or worldly action.

Law is easy in conception, but difficult in operation. To frame a law is easy but to apply it to particular cases with special reference in each case to the circumstances that have been operative is difficult. For these circumstances cannot be studied either by means of the evidence before the court or by the highest stretch of imagination on the part of the judge, though our Evidence Act is claimed to be perfect.

The above view takes us to the preference of the unwritten law of nature to manmade law. With proper training of humanity from birth, obedience to discretion amid natural laws can become instinctive. When we reflect on the imperfections of man-made laws, and on the higher duty of human societies to train all to the love and obedience of natural laws, we come to the formula, – " No law, no disturbance, of peace." Is it not here worthy of State Law to imitate the Divine or Natural Law, where perfect integrity on the part of every individual places him above law? Here violation happens to approach the infinitisimal, to be the misfortune of human nature, which can be eliminated by the training of instincts. General supervision may however be maintained to render help of advice wherever needed. Such an ideal state should be seriously exerted for on a universal scale, as the Universal Spiritual Federation should function in this universe as the only best remedy for all human ills, present and future. It is the highest international or human solution of the human question. It is a formula revolutionary of the present worldly ideals, modes and processes. Right action is strict justice. This is equality to all. This Universal Spiritual Law is composite, and keeps humanity united in love and right action. In

service to others and right action. Unless he gets out of the vicious circle in which he is now caught beyond all hope of redemption, his outlook and life activities in every field including law are as above borne out, bound to be floundering amid the errors of blind ignorance. The very basic training of life and the trend of motive and thought must undergo a radical change, if humanity is to get out of the present hopeless muddle of the different and innumerable warring idealogies in individuals, nations, governments and laws. Though this conflict has ever been present in creation, the necessity for its removal has gained special point in the present hopeless conflict between individual, national and governmental arrogances and mutually distructive aggressions and assertions of temper and haughtiness each occasioning and enhancing the other. While all these justify themselves each its own way, it is clear to every one that they must in due course all disappear and make room for a common creed.

A law, in the original conception of it, knows no exception. The laws of nature are an instance. The resultant of forces is an exact mathematical representation of all the forces in operation. It is an unfailing law. All the individual forces in operation here come in as contributory and subsidiary to the common law of the resultant. This law of subservience should be realised by the individuals composing a community. Then the law becomes unfailing. Hence a law is that that never fails in spite of the fact that the component individual elements may have their courses and forms that might appear conflicting.

Human enforcement or operation of law is a substitution of human motive and action for spontaneous natural enforcement. These substitutes unfortunately are hardly correct, for want of correct apprehension of and suitable apparatus to correct, each wrong motive and action in the circumstances of the commission or wrong. The natural reactions of Divine laws tend to raise the individual ultimately to the impersonal plane of a just Providence which views right and wrong equally from the abstract or Ultimate Standard. Human-laws and their modes of operation judge,

relations. For if all individuals stand nullified, humanity also stands nullified amid its claims in favour of the one running through all. Here Divine intervention should save the situation and not human wit or law. Here is an eternal conflict between the demands of the fulfilment of variety and uniformity. Suppressions of variety before a certain stage of self development, why until perfecttion, results in the suppression of the growth of self. Only through such freedom of individuality should grow the assertion of the universal principle running through the variety of individualities. Here is an eternal conflict in the process of the application and administration also of law. The reconciliation is there as the nice meeting ground of both. It is thrown light on in a subsequent para (12).

Human vision has ever oscillated from one field to another. The individual has loomed large in fields of interests common to groups of individuals, as well as in fields of special interests characteristic of politics, commerce, society, economics, industry, and so forth. This gave rise to different communal laws, as well as political, commercial, social, economic, industrial laws and so forth Everywhere there is clash of interests, individual and general on the one hand, and between the general to the field and universal, common to all fields on the other. While the ideal is always admitted as the goal, the actual is ever being allowed to defeat the purpose of reaching the ideal. "Water, water, everywhere, but not a drop to drink." from either stand point. Consciousness, consciousness everywhere, but no conscience to save. Law, Law everywhere, but no justice to help. Man is thus left amid a wilderness of variety and conflict to drift to the gale of chance, without the power of choice, initiative or effort. He consoles himself the while with arrogating to himself all power of choice, initiative and effort to defeat the plan of God or Fate, amid all his impotence. This is by the force of ignorance or illusion, which is his birth-right The only way out is the cultivation of a new outlook in which the human being learns regard for permanent principles of life such as truth, love of humanity,

wisdom and spontaniety. In the changing gradations of lower existence of the Dynamic, not only are wisdon and spontaniety separated, but various other changes, processes and conditions intervene in each. The static is happy in its one-ness, while the dynamic is unhappy in its change or variation.

A law is thus that which enforces itself. Else it cannot be law. Hence the present laws of courts and Governments are strictly no laws, but ordinances devised for each imagined occasion. They lack the power of self-expression or self-enforcement in so far as they do not involve entire and real study of each situation. The natural expression of each force involved in a situation, which is various in various individuals, can be called a law if its expression is uniform in the intelligent and perceptive. Thus unless the law has the innate power to enforce itself, it is no law, and ceases to be law even if it is made a lew artificially.

Wisdom should come in to save wit, even as discretion the better part of valour. While mercy should in this spirit temper justice, the word of the contract might demand fulfilment. Here a Daniel come for justice might to the Jew give a stone in place of the bread that was sought, as Portia. If justice is painted as blind, Law of Contract which is individual in its real scope, demands its fulfilment to the letter. Mercy may be very good humanity but not strict justice. There may be field here for contemplation as to what law should govern contracts in general. But necessity knows no law, and human circumstances are decisive in themselves. The play of individuality cannot be overruled in spite of the sense of the innateness of humanity in justice that should govern human transactions. Individuality and circumstances have a justification in themselves which cannot be over-ruled by any considerations of propriety, common-sense and human well-being. Here is a clear conflict between necessity and law in their demands. Which way the blind eye of law should be turned is to be decided by Daniels of Divine insight into when individual necessity should prevail as a condition of life and have priority over the general law that governs human

In a sphere of endless changes taking place from within, in pursuance of laws operating in a subtle or unseen manner, it is futile to seek for a law. Here both the law and the circumstances governing it are changing incessantly in themselves, and there is no guarantee that our perception of them is correct at any stage of introspection. Whether the apparent is real amid its changing conditions, or whether an unchanging or static real is to be sought amid the apparent, is a serious question that concerns seekers of truth.

Spontaniety is the thrift of time and wisdom the saving of time and trouble. The spontaniety and wisdom of nature is law. Spontaniety, as in wit, lies in the saving of time and action, while wisdom is the saving of the stages of advancement of fore-sight. Both are the result of previous preparation, while wisdom is the more substantial. Both are combined in the expression (wit) and spirit (wisdom) of an ideal law, while they are separated in a law relating exclusively to conditions aad circumstances of life or existence, and in a law relating to action necessitated by conditions and circumstances. Their range and scope are different.

Thus a law is a self-formulating force in each sphere. The difference of sphere occasions difference in the dynamic form in application of a law which is static, when the changes of matter and sphere are eliminated.

Self-formulatingness refers not only to form but also to enforcement. Human mind enters into the natural and organic forces in operation in creation. The operations of mind are however conscious in the human kingdom, while in the vegetable and lower kingdoms they are unconscious. Spontaniety characterises both, while wisdom pertains to the field of the higher conscious and thinking. Stress of necessity for action brings in spontaniety, while patience waits for the formulation of a safer policy of wisdom.

Both are results of the one without difference of the static. In the infinite wisdom embodied in the Static or the One, it is all

Law, Its Form and Function.

Law seeks and formulates a uniform basis for human conduct and order, to reach the goal of life. When the spiritual springs and higher bearings of life on the one side, and the ulterior reaches and higher bearings of life towards the perfection of the ultimate on the other are not grasped, law is at best conventional. To rationally lead the human being up to the higher field of being and conduct, law does require provision by way of adjustment or co-ordination of purpose in the subject. and its administration requires great skill and higher understanding and sympathy in the administrator. The demand therefore in general is that those in power in human societies should be persons of high spiritual culture. sympathy, and exemplary life to be able to successfully wield the law of human societies.

In the next phase, law is a principle that obtains in a series of phenomena that are visible in a sphere of life in nature. The phenomena seem to be modified in accordance with the change of sphere of life as it relates to different men, animals, plants, minerals and subtler forms of higher existence of life of advanced spiritual conditions. The modification as an application of the same principle to different conditions of being, of matter, spirit and circumstances, is endless. If change itself is a law of nature in creation, the rules that are observable therein are also subsidiary laws. When change is once posited, there is no end either to the forms of change or to the laws that obtain therein. Here law is a madmun's game or shadowing the endless or impossible. If we go to the permanent laws without change, it becomes static in the ultimate or primary stages of existence If there is only one-ness in creation amid variety, law is static. If variety is our point of view, law is dynamic.

The thraldom of the limitations of being or manifestation points to real freedom The unconditioned being may not be being at all, in our sense. Our conditioned being with all its stages, limitations and laws is what concerns us in our ordinary state of being.

The success and permanence of human societies depend upon the nature, spirit of conception and enforcement of laws. Hence, man is happy or miserable, and countries or nations as well as they truly conform to the ideals and processes of intergrity and capacity to reach the goal of perfection and unity in and through existence and action.

Hours fly and days fly, but time remains with us to be lived, as eternity. Even so, circumstances and their laws of change give place to the law of immutability of the one without another. Eternal peace lives in that unity and in no other. Even the international law, which should be the nearest approach to that, has become more personal than personal law. The irony of the present day law is that what should be more impersonal has become more personal than personal law It deserves mention here that the law of the superman of Nietzsche has, in its grasp at power, become a law of hate instead of one of love. Though self-love is a natural law, if it stops there it becomes a bane to self and the whole world. It is intended by nature that self-love should develop into love of all, as the unity or identity of self is both the goal and the process of the highest unity in the regions of the relative as well as the absolute. That process of government and administration or law is the best that is motivated by equal love to all or one-ness in freedom. That freedom must be constituted by obedience and living to the highest laws of the unity of being or life or self or individual interest from the highest to the lowest.

That is the only real. The real is the thing in itself. The thing in itself in the only thing, the ultimate. While that is the fact about it, we are insistent on and confined to the appearance alone of the thing. This is the vital and basic defect in our vision, action, life and laws. The only remedy for it is to bring our worldly motives, and actions into a line with the only right view, with which I conclude the introduction as well as the text of my address to this eminent body of jurists as well as otherwise highly placed men and women.

LAW, ITS FORM AND FUNCTION.

BY

Dr. J. Mangiah, Ph. D.

(Founder President, Universal Spiritual Federation and World Peace League,
Hyderabad–Deccan)

Introduction.

I crave the indulgence of the august audience of jurists in presenting what may appear as a one sided aspect of law, which is rather abstruse. On deep thought, this aspect which is all-sided embraces the practical phases with which we are concerned in our daily affairs of worldly life How the One-sided encompasses all the extant and even remoter views is entitled to be a matter of supreme interest in so far as it throws light on the unity of existence as expounded by the Islamic religion in the Quran-i-Shareef, as well as in the Hindu and other religions. By the one-ness insisted on by all religions is meant the oneness not only between God and Creation, but also among all sections of humanity and all departments of life. If this all-comprehensive aspect of the highest law, which should be, in the nature of things reflected in all laws of human departments of life, be grasped and enforced, then and then only can our human laws deserve the name of laws as the text of my address is calculated to bear out.

I have endeavoured to sum up, somewhere implicitly and somewhere else explicitly, the aspects and characteristics of the central law as applied to various departments of life including the three classes, viz., (a) the laws of regulation of conduct of individuals of society towards securing order and progress in society, (2) Laws of procedure in the enforcement of the above, and (3) Laws which govern all the nations of the world or international laws, falling under the above two heads, for the safety and progress of humanity as a whole, in pursuance of the principles enunciated in para one supra.

India also. My contention is that the mere fact of a certain amount of poison being present in an article of food or in the viscera of a dead person cannot and must not be the deciding factor in the release or conviction of a person indicated for administering poison. The criterion for culpability is the intent and not the results of an act. If a person administers poison with intent to murder it should not be necessary to prove or disprove that a lethal dose has been administered. If a poison is detected and the intent is proved the crime of poisoning with intent or murder should be considered as proved.

Experience of some other authorities.

Abstract. Legal Medicine and Toxicology by Gonzales, Vance and Helpurn Page 683. A quantitative estimation of the amount of alkaloidal poisons in the tissues may aften be determined (i. e. in the tissues presented for analysis) but sources of error are many and the most that can be attempted is to appraise the approximate amount present, the purification process must be carried out with great care or the impurities will cause a distinct positive error, but at the same time if the process is performed to meticulously, much of the alkaloid will be lost.

A source of error may occur in the examination of alkaloids especially in case of extreme postmortum decomposition, as ptomaine or putrefactive bases one formed which have a close resemblance to some of the alkaloids. When putrefactive bases of the pynicline and hydroperidine series and miscorsive are present in the same body according to Webster toxicologic analysis would not be able to demonstrate for alkaloidal poison

---

when a person had died of poisoning and yet no poison was deteced in the viscera afterwards. In cases of irritant poisons, considerable portions are lost by vomitting and diarrohea. Conditions as they are to-day, it is very difficult to preserve these for analytical purposes. Changes in the stomach and the intestines may strongly corroborate or negate the poison theory. Unfortunately however under the present circumstances, post mortums are performed so late that many a time no trace of viscera can be found leave alone signs of inflamation. If a man survives he may die later on as a result of poisoning, for example from gastritis or nephritis. A report, "No poison detected" may result from lack of sufficient skill from wrong materials having been sent and there are many substances which are beyond the reach of chemical detection and identification as yet, as example poisons produced by pathogenic germs and various vegetable products may be mentioned. A person may die of arsenic and yet no arsenic be found in the tissues afterwards. Taylor says " It is the more necessary that the fact of entire elemination should be remembered, because it has been impressed on the public mind that no person can have died from poison except that the poison be present in the body after death. If this is untrue with respect to Arsenic, it is necessarily untrue with regard to poisons less easy of detection in minute quantities."

There are many more aspects of poisoning which from time to time crop up in the courts of law e. g. poisoning and age, mode of administration i. e. by mouth or skin, and the physical state of the poison i. e. gas, solid or liquid, idiosyncrasy, habit, presence of other diseases, the time of administration and appearance of symptoms of death and chorocic poisoning.

All these factors require a paper on themselves. I hope I may be able to speak on these aspects of poisoning at another time.

In today's talks I have been stressing the aspect of poisoning from the quantitative point of view under conditions as obtained in Hyderabad, which is true generally of other parts of

has uncertainty about it. I am afraid quantitative analytical reports have lot of this uncertainly about them. This is particularly so when the amount of poison detected is less than the lethal dose. It is absolutely incorrect to assert, that since a lethal dose has not been detected the victim did not die of that poison. If however much more than a lethal dose has been detected these scruples do not arise. There is one more aspect of the question which should be borne in mind. When a mixture of poisons has been administered and each of the constituents has an adjuvant action, i. e. each helps or accelerates the other's action, death may be caused, even accelerated, although when considered individually sublethal dose has been administered. In my experience I have particularly noticed this in the case of alcohol and opium. Chronic *Sendhi* drinkers who have taken sendhi and opium together have died very rapidly of opium poisoning. It appears alcohol not only aids the action of opium, but leads to rapid absorption of the latter, so that in a very short time a concentration of the drug in the circulation is reached which proves fatal. I have no experimental proof to offer for this statement as yet, but I cannot explain the matter any other way. Therefore when deciding cases of this type this aspect of the question should also be taken into consideration. As an instance of this type of poisoning I quote the following case. A young man in a village boasted that he could never get drunk on sendhi The kalal of the village asserted that he had a special brand of sendhi with such a kick, that one glass of it could knock out any man. There was a betting, the winner getting ten rupees. After a glass of this sendhi, the man in question did lose his consciousness, his bet and his life also into the bargain, opium in sublethal dose was detected in his organs and the kalal admitted that he had mixed opium the size of ½ a split pea in the sendhi. In ordinary circumstances this much opium should not have killed a young healthy adult.

So far I have been considering the question of the amount of the poison detected, i. e. lethal or sublethal. There are cases

1. A considerable portion of the poison administered is irretrievably lost through vomitting and purging.

2. Post Mortum examinations are conducted very late when physical signs of poison have all disappeared. Post Mortum reports persistently echoe the note, "No cause of death can be ascertained on account of advanced decompositions. Post Mortum organs have been preserved and sent to the Chemical Examiner for elucidation of the cause of death." Thus this burden of proof falls on the shoulders of the analyst.

3. Chemical Examiner when he conducts his analysis he finds that animal alkaloids have already made their appearance some of which very closely simulate plant alkaloids, besides they seriously interfere with the qualitative and physiological reactions and render quantitative analysis more or less a guess work.

For the proper administration of law it is necessary always to find out exactly the quantity of the poison administered. Barring Opium and Arsenic, former being taken by many people as a habit or as remedy for various pains and aches and the latter being present in very small quantities in a lot of things we eat and drink, other drugs usually administered for poisoning should not be present in the organs of a dead person who has died a natural death. If a person otherwise healthy dies suddenly and in his organs is detected say the alkaloid of Dhatura, it would be enough proof that the man did die of Dhatura poisoning. It should not be necessary in such case to actually prove that a lethal dose of the alkaloid of Dhatura had been separated. Of course it makes easy work for the judge, the prosecution and the Council for defence to prove, minimise or disprove the guilt of the acused, basing their findings on the quantitative reports of the analyst. This amounts to shooting the gun by keeping it on the analyst's shoulder. I have at some length explained to you the difficulties and the setbacks to be faced in analytical work of this type. It is most unjustifiable therefore that the balance of justice be pivoted on data which

With regard to chemical tests, as I have said before, if not impossible it is extremely risky to attempt getting alkaloids in a pure state. If the alkaloid is impure the typical chemical reactions described in books are somewhat modified but for qualitative analysis it does not affect the results very much. Still when you come to quantitative analysis,this presents almost unsurmountable difficulties. If you try to get your alkaloid in a pure state you lose some of it in the attempt and if you.do not purify it, you get exaggerated results. I will refer again to this question in a later part of this paper.

With regard to physiological tests, these consist mainly of experiments on animals, mostly frogs and rabbits. In a large number of cases these are very helpful in the identification of the poision, in others they give useful indications of the directions in which further investigations should be carried on.

In the Courts Judges and Lawyers, all; expect the analyst to give them the quantity of the poison detected and its lethal dose. From what I have said before I hope you have been able to appreciate that a definite statement to that effect is impossible. It has been already explained that the analyst gets some of the organs and not the whole body for analytical purposes Neither as yet has it been possible to infer exactly the total amount of poison administered from the quantity separated from any one organ say the liver. Some experiments were conducted in England I think on sheep some time back with Arsenic. Definite amounts of Arsenic were administered to these animals and quantitative analyses made from the livers, post mortum. Repeated experiments failed to give a fixed formula whereby the total quantity administered could be estimated from the amounts present in the liver. If such a thing could not be possible with a sub-tance like Arsenic, it is futile to make such deductions for other poisons usually used in India.

During this talk I have, I think, made the following points clear :—

On the Sari were found seminal stains which should not have been there, she being a widow. The spoon had been washed clean, so nothing could be found on it. On the plate there were a few grains of boiled rice sticking here and there. No Arsenic was detected and there was no chance of getting anything else by extraction, the material being so small. As a routine a slide was examined and luckily typical orange scales of the cantharadin fly (blister-fly) were detected. The man later confessed that he had been planning for some time for a sexual congress with the girl. To facilitate the act, he had administered Dhatura juice to the unsuspecting girl who thought this was a remedy against guinea worm disease she was suffering from. He as a precaution kept some pounded blister flies with him also to be administered if all did not go according to plan. Fearing lest the girl should split on him when she came to, he had fed her on rice in which he had mixed up the fly powder.

In another case an anglo Indian woman came to me one morning with a tea cup in her bag. It had a very slight amount of brownish material sticking to its bottom. She told me that she had severely taken to task her boyservant on some negligence of duty. This boy servant had been with her for the last 16 years. When he brought her her cup of Cocoa last night, she felt the taste and the colour slightly unusual, whereupon she threw away the contents of the cup and went to sleep. Thinking over, she questioned the boy the next morning who failed to give any satisfactory explanation. Thereupon her suspicions were roused and that is why she had come to see me. As a routine it was tested for Arsenic, which was absent. An extract of a small portion gave negative results also. The microscopic slide however showed typical spines bair characteristic of canabis indica leaves. The boy later confessed to his having mixed pounded canab s indica leaves with her mistress's Cocoa. In certain cases it may be helpful to look for alkaloid crystals under the microscope. But in Hyderabad there is not much application for the method.

poisons are Water, Alcohol Chloroform, Ether and Benzine. These solvents can and do dissolve out many other things besides the alkaloids. Purification is a question of solution and reprecipitation and every time this is undertaken some of the alkaloid is bound to be lost. Medico-legal analyst is not dealing with plant alkaloids for commercial purposes where even a considerable wastage is justifiable for purposes of purity. Here there is a question of parts of a grain. An enthusiatic analyst attempting absolute purification, may at the end be left with nothing else but aqua pura. With regard to detection of poisons we have to depend on

1. Microscopical,
2. Chemical and
3. Physiological examinations.

Microscopical Examinations should have a very important position in the detection of poisons in India, for barring Arsenic and Opium, they are usually administered in the form of pounded seeds, leaves and roots or powdered poisonous insects. I am afraid not enough work has been done yet to distinguish all poisonous Indian plants and insects in this way. In some very difficult cases this method has been very helpful to me. In one case, a young widowed sister of a child wife had died in suspicious circumstances The child wife with her parents had gone to a neighbouring village, leaving the young widow alone to look after the house. This young widow had gone delirious, had also had bloody vomiting, with severe pain in the abdomen and had died. The husband of the child wife had visited the house while the family was away. He admitted having administered to the girl some juice of Dhatura leaves to cure her of guinea worm disease of which she was suffering. Pure dhatura however could not have produced the above symptoms. The girl was cremated before the police arrived. The Sari the girl was wearing at the time of her death, spoon with which she had taken the dhatura leaves juice and the plate out of which she had taken her last meal of rice were sent to me.

There are many people who have had knowledge of the escapades of the loving wife and rumours of foul play soon get round. Sometimes the police come in time and an investigation starts, at other times the body has to be exhumed and if it has been cremated naturally all evidence of organic poisoning, any way, disappears with it. Fortunately the poisoner does not stint with regard to the quantity she administers. This is the only good help that the analyst gets. While some of the poison is ejected with the vomitted matter and the stools, some of it is oxidised in the body. It is this latter portion which actually kills. This is true of organic poisons only. The metallic poisons are unaffected in this way Some of the poison is left over so to say and it is this portion which the analyst detects.

With regard to stools, Indian country side near the populated areas is so much strewn over with all types of stools solid and liquid, fresh and in various stages of decomposition, that it should be hard for a man in full possession of his senses to point out later on which of it was the result of his efforts. With regard to vomitted matter, in the villages there is such a large number of hungry dogs prowling about, that whole corpses disappear in no time, leave alone a bit of a vomitted matter. Their menu is all inclusive. At times the police does send faeces and vomitted matters for analysis, but I believe more often this is just a matter of completing the story. If they are fairly quick about it, Post Mortum is performed two or three days after death, when the body has already undergone considerable decomposition. Out of this decomposing mass of human flesh and bone the analyst gets the Liver, Kidneys, the Spleen, Heart, Stomach and part of the intestines for the detection of poisons. By this time quite often animal alkaloids, popularly called ptomaines, have also made their appearance. It should be borne in mind that when a poison is administered it permeats all the tissues of the body, it is not confined only to the organs mentioned above.

The usual solvents used for the seperation of vegetable

true to-day as in the past that "when justice dies let the world be made a bonfire." I strongly feel for better cooperation and understanding between the two professions and I am sure such a thing when achieved should go a long way towards better administration of justice.

The other matter to which I want to refer to-day is a special aspect poisoning. Climatic conditions, substances used for poisoning, mode of poisoning and habits of the people, make the detection of poisoning in India a very difficult problem. The usual story is that of an unwary husband making ready for going to his fields. His wife who is on the quiet carrying on with somebody else, wants to get rid of this impediment in her pleasure, the husband. The lover gets hold of some Dhatura seeds which grow wild everywhere in this part of India, pounds them into a powder and hands them over to the wife, who quietly mixes them up with the husbands curry and rice. Now the curry as eaten in this part of India is heavily dosed with chillies, which easily hide the pungent taste of the Dhatura seeds. Besides people in the districts do not seem to chew their food at all. Rice and curry is made into small boluses, which are thrown into the month and swallowed like a pill. Big pieces of glass, usually pounded glass bangles I have often found in stomach contents, which have been swallowed without having been noticed. Having finished his meals the husband goes to his field and there after a while begins to feel that all is not well with him. His stomach is sore, he his sick and giddy. He vomits once or twice, may be he passes a stool also. Sooner or later he gets delirious, usually while in the fields and thus he is no more able to give any information on the matter. His condition is attributed to some affliction with devils or other viscious spirits. The dutiful wife promptly gets some priests to chant some hymns to drive away these evil spirits. The delierium however in spite of all the chants of these sacred people deepens into coma and the final episode, the death, ensues sooner or later. In the villages it is very difficult to keep any secrets.

4. What tests were employed? This question has also similar purpose.

I do not know whether this procedure is a matter of policy or conviction but about one thing I am certain that in general such questions fail to produce the desired effect, and always succeed in adversely affecting the attitude of the medical witness. I am sure it does no good to the cause of the accused, the council is paid for to defend. We as a profession are trained if I may say so to be sober and fair in our dealings, but we are also human, and human nature has its limits. Therefore I wonder if it is a sound policy to push the medical witness into the opposite camp. It appears this attitude is not confined to this country alone. I quote a case from Barnley, England, where a solicitor made the following remarks in a court of law.

"It will be a wicked day for England if on the unsupported evidence of a doctor, however well qualified, a man's defence is taken completely away from him and he is convicted. I say fearlessly that as a class, especially as they came to a witness box, there are no more unreliable people than professional medical men. We all suffer from it." I wonder how many of you share this opinion. The doctors of Barnley made the following rejoinder.

"Medical practitioners of Barnley and Districts regret that a member of the legal profession should abuse his position as an advocate by making for his own purpose, a general charge against the medical profession on an occasion and in a place where a reply is impossible. Judgement on the medical profession on this issue can safely be left to the many judges, magistrates and coroners who in their daily work of hearing medical evidence on all kinds of cases, are enabled fairly to assess the profession in an extremely difficult and responsible field."

We as medical men thoroughly appreciate the value of law and order, for what is life worth without it. It is as much

LAW AND MEDICINE

BY

Mr. Mian Muhammad Siddiq,

Chemical Examiner to Nizam's Govt., Hyderabad.

——::——

To begin with I thank the Council of this Association to have asked me to say a few words to this learned body on some qestions of common ground between Law and Medicine.

I do not for a moment want to pretend that this is going to be a very comprehensive paper, (if I may give it such a name) my position is like another coprofessionist who when confronted with a similar occasion started with the remarks "I feel I can tell you nothing you do not know already, so we had better all go home."

As Chemical Examiner to H.E.H. The Nizam's Government I have occasionally to appear as an expert witness in various Courts. I have often been asked many relevant but unfortunately many a time irrelevant questions also. One thing I have persistently noticed, the attitude of the council for defence has always been to discredit the medical witness in the eyes of the judge. For example the opening questions of the Councils for defence with irritating persistency have been somewhat like this.

1. What are your qualifications? This is an attempt at criticisim of the competency of the analyst.

When did you analyse it and where? This is intended to prove fraud and mischief.

3. Did you analyse it yourself entirely or were you assisted? This shows complete ignorance of the procedure of laboratory work and moreover is again directed against the competency and honesty of the analyst and his personnel.

search for the truth. The court by consent of parties, calls for a report from the expert on the matter of the dispute. The expert is expected not only to give his opinion, but also to state the basis of the opinion in a manner so as to be intelligible to the court as well as to the lawyers. Such reports are usually accepted by the contesting parties. If the expert cannot form a definite opinion, he is expected to state the pros and cons of the case so that the court may judge them in the light of other circumstances of the case.

Without the full cooperation of the practicing lawyers, it is impossible to create the atmosphere of a scientific inquiry. The spirit of the combat must be there. But the courts can use expert evidence without any danger of an abuse, if they searched expert evidence with a clear mind for two points only, viz. the facts which they can see, and their meanings which they can understand. Nothing can be gainsaid against the judicial attitude of caution towards the handwriting expert.

---

to a very great extent. In such cases experts contradicting each other rightly or wrongly from the different sides, become more useful than evidence led from one side only. It is not simply that such experts will reveal the pros and cons of a case for the consideration of the court, but more than that, there will be common acceptance of many facts and inferences. The court can take advantage of this common ground to judge the differences and arrive at its own conclusion.

It may also be noted that the standard of the profession of the handwriting expert will as a rule run parallel to the standard of the legal profession, for the handwriting expert is a cousin in profession to the lawyer. Experts get most of their work from the practicing lawyers. If members of the profession for the benefit of their clients demand dishonest opinions from experts, and are prepared to support only such experts as give the desired opinions, there will always be found experts who will give such opinions. Still it would be blasphemy against human nature to believe that no individual experts could be found who wished to rise above the current standards. The integrity or otherwise of a particular expert is best known to the members of the bar who have consulted him. The standard of the bar varies at different places. The standard of the bar at many places is a matter of pride to its members. The advocate or a solicitor at Bombay for instance can appreciate a consciencious opinion even though it is against the interests of his client. He can also appreciate an indefinite opinion where sufficient material is not available. It may be noted that the lawyer who accepts such indefinite opinions has to face the music of his client. A client may be able to appreciate a definite opinion even if it is against him, but he cannot understand an opinion hedged in by ifs and buts. What is a matter of absolute integrity from the professional point of view seems cheating to the client.

The atmosphere of a legally supervised scientific inquiry sometimes prevails in some courts. In such cases the lawyers from both the sides cooperate with the court in the spirit of the

spirit of the combat. On the other hand it has been deepened on account of the assistance of the trained intellectual athletes can be had on payment of fees. It is upto the legislation for and administration of justice to change this intellectual combat into a legally supervised scientific inquiry. The attitude of the handwriting expert is sometimes quite natural. Why should he not support his opinion when called upon to prove it in a court of law if he concienciously holds an opinion? There is nothing improper if he is wary against attack from the other side. It should not be forgotten that the present art of cross-examination which is regarded as the search-light of truth, has been developed not with a view to bringing out the whole truth but to bring out only that part of the truth which helps the cross-examining party and to black out the other part of the truth. It is for the Judiciary to see that the cross-examination is conducted in such a way that the expert feels that it is a scientific inquiry and not a challenge.

Another objectionable attitude is to connect the credit or discredit of an expert with the acceptance or non-acceptance of his opinion. The function of the expert is to make an analysis, to pick up pertinent facts, to place them before the court, and to suggest their meanings. To form general conclusions is the function of the court. Referring to the law of evidence, opinion of an expert is tolerated only because it is impossible for the judge to have a thorough knowledge of all the sciences and arts which flourish in the present age. The general principle of jurisprudence, however, is not to admit opinions of witnesses. Better atmosphere can be created if experts are asked to submit their analyses along with their suggestions only and not to specifically state their general conclusion. The expert will not then feel conscious or unconscious attachment towards definite conclusions. It would be safeguard against abuse of justice if the courts searched expert evidence with a clear mind for two points only viz. the facts which they can see, and their meanings which they can understand. This eliminates the personal factor of the expert

contradictions are not always justifiable. It is believed that the handwriting expert is not open to conviction.

Such expressions clothed in judicial language are so often repeated and are so widespread in judicial decisions, that they are accepted as depicting the correct behaviour of experts as a rule. There cannot be two opinions about the fact that such behaviour is absolutely reprehensible. If the profession of the handwriting expert is to command better respect at the hands of the judiciary, experts will have to revise their behaviour individually as well as collectively.

These expressions of judicial opinions are however at their best, sweeping generalisations. It is wrong on the part of the judiciary to accept them as guiding principles or to make inferences on their bases as if they were the immutable laws of nature. The generalisations show only a part of the pictures. It would be as incorrect and unjust to believe that all experts give opinions in favour of the parties which consult them as to believe that all practicing lawyers mislead courts and defeat the ends of justice. Many cases come to the offices of the experts in which opinions are given against the interests of the consulting parties. Many others are refused by an expert, because the consulting parties do not want to take the expert's honest opinion, but want to impose their own opinion on him. Courts rarely come to know of the case in which experts give opinions against the consulting parties....Experts appear in a court only after his opinion has been ascertained and he is produced to prove his opinion. Similarly, it is not usually possible for those who pronounce Judicial opinions to know the case in which different experts have given similar opinions though consulted by different parties.

Also, part of the abuses relating to expert testimony are inherent in our prevalent system of justice. Those who preside over a legal contest cannot forget that it is an evolution of the mode of settling disputes by a physical combat. Substitution of intellectual gymnastic for physical gymnastic has not altered the

cases a proper judicial attitude, because the science of detecting forgery still stands in need of much improvement. Occasionally however, the court draws its conclusions from other circumstancial evidence, and picks up isolated facts from the evidence regarding handwriting, to support these conclusions Here it sometimes errs, because it happens not infrequently, that a party which has a good case produces a wrong document in evidence, to improve it. The other circumstancial evidence, in such a case may be strong enough to prove the case although the particular document may be spurious. With a conscious or unconscious prejudice against expert evidence, and a definite opinion as inferred from other circumstancial evidence, the judicial mind sometimes refuses to see facts as facts and to accept interpretations which should be intelligible to it. This method of considering expert evidence seems unscientific. The attitude of interpreting almost all the evidence to support preformed conclusion, seems to be wrong All the evidence that a party tenders is usually neither right nor wrong although the case may be right or wrong. In life, as in a faithful photograph, there cannot be all high lights and shadows. Half-tones must also be present. The judicial mind occasionally refuses to depict half-tones in its pictures.

The judicial mind is usually prepared to consider the evidence regarding handwriting in its correct perspective only when other circumstances do not give clear indications. The judicial mind is however coming more and more to recognise the usefulness of modern methods for the detection of forgery. But, the general attitude towards the handwriting expert is still one of caution, for the judiciary has long-standing grievances against handwriting experts.

It is suspected that the handwriting expert gives opinion in favour of the party which pays him, and that his opinions are usually definite although the basic material may be insufficient for definite conclusions. Two handwriting experts sometimes give contrary opinions on the same documents, although such

is now being used against the forger, and is assisted by the devices and apparatus of modern science. The microscope and the camera have given added vision to the expert. The ultra violet rays and infra red rays have been utilised to detect marks which could not be visible by ordinary light. War time researches in photography and other sciences are expected to enrich the science of detecting forgery. At present, such discoveries are closely guarded military secrets, but they will be thrown open for study and application to the curious mind after the War.

Hidden and silent facts are being made visible to give eloquent testimony. The ink and paper which are silent witnesses of the workings of the forger, sometimes give undeniable and convincing testimony. Handwriting is now regarded, not as an outline of forms, but as a track in ink, of the movements of the writer, which betrays his conscious as well as sub-conscious mannerism The primary function of the handwriting expert today, is not to give opinions only. His special skill enables him to pick up pertinent facts from the material supplied to him. His special art helps him to put those facts before the deciding authority so that the deciding authority may be able to see them as visible facts. His special knowledge entitles him to suggest meanings to those visible facts in a manner intelligible to the deciding authority. The evidence thus provided becomes the evidence of the senses of those who are to decide the issues.

The judicial mind is beginning to reopen itself towards the science of detecting forgery but with clingings to old prejudices for the judicial mind takes longer than any other type of mind to forget the past Identification of handwriting is now being recognised as a useful science but not always a very reliable one. The judicial mind prefers to rely upon other circumstancial evidence, in the consideration of which it is a past adept. If the evidence on handwriting supports the conclusions drawn from other circumstances, it is usually accepted. If it does not, the judicial mind is usually disinclined to accept it. This is in many

JUDICIAL ATTITUDE TOWARDS THE HANDWRITING EXPERT.

BY

Mr. Parmeshwar Dayal, M. A.,

Document Expert, Medows House, Medows Street, Fort, Bombay.

The early judicial attitude was one of scepticism towards the mode of identifying by similitude of hands. The scepticism was justified as in those days handwriting was identified by picture formations only. The decrees of Justinian have rightly guided the judicial mind of Europe through the past fourteen centuries. With picture formations as the sole hazardous test for the identification of handwriting, there could be no proper safeguard against imitation.

A step forward was made in the recent past. It was shown that handwriting consists of something more than mere picture formations. Emphasis was laid on other handwriting characteristics which were less under the control of the conscious will, and were consequently less changeable and more difficult to imitate. The sub-conscious mind was tapped. The physiology of the hand was searched. Technical terms like the coordination of muscles, penscope, pen-pressure, penhold and so on came into vogue. Special study was required on the part of those who claimed to identify handwriting, The profession of handwriting expert developed. The Judicial mind looked up, but was disappointed, as it found in the technicalities, the empty cidatels, with the experts bolstered up their claims. And it was more of a confusion than an assistance to the judiciary to find two experts giving contrary opinions on the same material, and each maintaining his own opinion with the help of technical terminology.

The science of detecting forgery has now made further progress. It took up the heritage of past experiences, sifted it carefully, and applied to it the knowledge gained through modern scientific discoveries. Products of researches conducted primarily for the benefit of other sciences have been utilised for the detection of forgery. Funded and systematised knowledge

court has diposed of the case. And as for the cross-examination, have we not been told that it is a mere farce, that experts entrench themselves behind technical jargon and are not be moved from positions once taken.

Should the suggestion of appointing experts as arbitrators not find favour, there is another alternative method which will secure the same end. In the days of the Hon. East India Company the English judges sought assistance of Pandits and Moulvis for deciding Hindu and Muslim law cases. The position of the English judges who did not know Indian law was not much different from the position of judges to day who do not know the various subjects on which expert evidence is admitted. The experts can be made to fill the same role as was filled by the Pandits and the Moulvis.

Gentlemen, I have finished, I am afraid I have intruded too much on your time, and made a great call on your patience. The contribution which I can make to the proceedings of this learned conference can be, but little, and if I have made bold to throw out a suggestion or two, it is because, I share with you the desire to see a more perfect machinary for the administration of justice. Thank you.

---

their evidence being recorded and therefore give their opinions to suit the party calling them.

Then there is the question of the opposing experts. Two experts equally skilled, and equally honest and applying identical tests sometimes appear on different sides in the same case and on the same issue. This naturally puzzles lay and legal public alike. It sometimes happens that father and son, brother and brother, Guru and Chela appear in opposing camps as they did on the battle field of Khrukshetra in the days of Mahabharata. And the doubts which assailed Arjun, then on seeing them so ranged, stupify the public now.

The twin problems of the opposing and the partisan expert can be solved if my suggestion is adopted and the law is amended so that the expert is called to decide and not to opine. His status should be raised from that of being a witness to that of an arbitrator. He should be called on to decide whether a particular document is forged or not, a particular fire-arm was used or not and such other matters pertaining to his subject. This would at once make him a responsible officer of the court. His fees could be paid by both the sides to a case or they could be made payable by the losing side and be incorporated in the costs. There could also be made a provision for appeal from the award in which case the expert sitting in appeal would have to be a more experinced one.

I visualise two objections to this proposal. The first objection would be that my proposal seems to take away the jurisdiction of the judges and the second would be that the party loses the right of cross-examination. The answer to these objections is simple. Let us compare the expert to the Imperial Serologist. When the courts send clothes to him to find out if there is human blood, they accept his report as final He is also not cross examined. Further there is no appeal on his finding. Has he not in a sense usurped the function of the court ? In my scheme a provision for appeal has been made before the trial

the points made by experts or the reasons given by them. As there are no regular courses in the Universities which deal with these subjects, the judges are apt to treat all experts as charlatans. Not being themselves in a position of distinguishing the genuine article from a fake, they tar all experts with the same brush. The institution of proper courses will instill in the minds of the judges and the public a healthy respect for the profession of experts.

Would it be asking too much if I appeal to the Osmania University, through this conference, to start such courses? The Osmania University, a pioneer in many things, was and is the only University in India which imparts education, from the lowest to the highest standard through the medium of one of the country's major Languages Will the Osmania University, under the inspiration of its far-seeing Chancellor institute such courses?

It is not necessary for every University to start these courses as in these days of specialisation duplication is to be avoided. And there will not be enough students to study for them, if a high standard is set for admission

Another suggestion I would like to make is addressed primarily to the legistators. Lawyers and judges can also help by mobilising public opinion in its support. My suggesstion is that instead of being witness as they are at present, the experts should be made the referees or arbitrators to decide the points falling in their special competence.

Most of the present abuses arise from the fact that experts are witness for a party. There are a few Government or State experts but their number is limited For the rest, it does happen on rare occasions that he who pays the piper calls the tune. Judicial opinions make the most of a point of the fact that experts however fair are apt to be biassed in favour of the party calling them, and that once they have given their opinion they become dogmatic, wooden, and impervious to any new suggestions in the witness box. It is urged that they have a pecuniary interest in

Such a course should be post graduate one, and only those who have taken a science degree should be addmitted to it. The reason for this is simple. Students who have received their education in humanities and the liberal arts, generally find it very difficult to cultivate the scientific attitude of the mind, which sifts and weighs evidence, takes nothing for granted and arrives at its conclusions on observed facts alone. Besides a scientific education prepares the student for the advanced courses as no arts education can.

The institution of the course as suggested is all the more necessary in view of the fact that expert testimony which may forfeit the life of an accused, like that of a fire-arms expert is now admitted in evidence. A few years ago, almost any man with a good court presence and unlimited brass passed for a fire-arms expert. In india, fortunately, fire-arms cases are not as numerous as in the West, but like all wars, the end of this war will also see a wave of crime by violence and it behaves us therefore to be prepared for it. It is absolutely necessary that a fire-arms expert should be a duly qualified person and that he should pass the most rigid tests. If all legal practitioners have to pass an examination, if all the doctors have to do the same, if attorneys, engineers, actuaries and accountants have to go through a prescribed course extending over a number of years and take a stiff examination at the end of it, I see no reason why experts, who fill a very important role in the legal system of the country should not be expected to do the same.

It is only when they have passed such an examination that experts will be trained microscopists, adept photographers, skilled chemical analysers, and fire-arms experts in the truest sense of the term. They will then deserve the attention and respect which they feel is lacking today.

It is a fact that courts do not generally possess the necessary technical knowledge whether of handwriting or finger-prints, fire. arms or examination of blood and are unable to appreciate fully

I have dealt at some length with this subject as graphology had already become entrenched in some countries of Central Europe as far back as 1920 and had become a real danger to the public. In some quarters, no marriage could be contracted, no application for a post entertained without first submitting the handwriting of the canditate to the graphologist. I leave the evils of the system to your imagination.

There is yet another type of experts who play Dr. Jakyll and Mr. Hyde with great adroitness. When witnesses they extol the merit of the science of handwriting, dwell on the values of penhold and penpressure, pronounce solomonly on the virtues of the graphic averages and the angle value test, but when they are cross-examiners they excell themselves in decrying the very tests they swore by in their other role. No wonder the lawyer and the judge looks with scepticism on these tight rope walkers.

It is no uncharitable or carping spirit that has promoted me to discuss some of the defects of my profession and if I have been frank, perhaps brutally frank, it is solety with a desire to find out with your help ways and means to remedy the existing state of affairs.

Are there no remedies then by which this very useful and honourable profession of experts can be raised to its full status and stature? There certainly are. And with your leave, I make bold to offer a few sugestions for the consideration of the Law Conference.

In the first place I would suggest that there should be regular courses in the different Universities, where the subjects of handwriting and finger-print identification, medico-legal examination of hairs, application of the serological tests, spectroscopy in medico-legal work, the use of Ultra-Violet and the Infra Red Rays, photography in all its forms etc. should be taught. Student should be examined in them and a regular degree or diploma awarded. The course may be of two or three years and the standard set for passing the examinatien should be of the highest possible.

In such an atmosphere the expert can not give his best with the result that both the dignity of the courts aud the cause of justice suffer.

I do not say that the experts themselves are not partly to blame for this state of affairs. In the past there have been a few incompetent experts. There are also some who without proper training call themselves experts. There are chemical analysers without being trained chemists, forensic ballisticians without ever handling a gun. There are also a few who are willing to oblige a zealous advocate. In this the legal profession must share the blame equally with the experts. There are some lawyers who seek out a witness who will support their case whether it be right or wrong. In one case retainers were paid to most of the expert in India so that their sevices may not be available to the other party with a true case, but a lean purse.

There is still another type of expert who belong to the category of palmists, astrologers, face-readers and numeralogists. They call themselves graphologists and read character from handwriting.

Some of them are no doubt very sincere and have deluded themselves into believing in graphology. Some of them are very learned but their learning is the learning of an old gypsy who tells fortune from the tea leaves and future from the ripples on the unfathomable sea.

In one of the conferences of these graphalogists, the reader of this paper had an occasien to submit his writings in four different scripts for study. Of course the graphologists did not know that the writer of the four scripts was one. The reading they gave was flattering and condemnatory in the extreme. The writer was a man of generous impulses said one, he was miserly asserted another. He had a great capacity for taking pains, he was artistic, a lover of music and the muses, but averred another graphologist, the writer was crude, selfish and incapable of finer feelings.

judgements become so wraped by regarding the subject from one point of view that even when consciensiously disposed, they are incapable of forming an independent opinon. Being zealous partisans, their belief becomes synonymous with faith as defined by the apostles, and it too often is but the substance of things, hoped for, the evidence of things not seen."

Sir Shadilal has it in one of his judgements 12. P. L. R. 1921. :—

'The mere fact of opposition on the part of the other side is apt to create a spirit of partisanship and rivalry, so that an expert witness is unconsciously impelled to support the view taken by his side. Besides it must be remembered that an expert is often called by one side simply and solely because it has been ascertained that he holds views favourable to its interests.'

Such are, or were the views held by the jurists and the judges till almost yesterday. But I see no reason why an expert who is a scientific man not being a witness of one or more or all the parties into a case. To him it little matters who calls him. What matters to him are the facts of the case irrespective of the consequences to this or that party. So long as he is accurate, so long as his opinion is based on observed and demonstrable facts, he is entitled to a respectful hearing no matter what party calls him.

Because of an almost unbroken series of judgements where expert testimony is made light of, the expert starts with a disadvantage not realised by the members of the legal profession. From the moment he enters the witness box to the time the judgement is written, his position is unenviable. Like the gladiator who risked his life to make a Roman holiday, he is baited by all and sundry, The opposing council starts with the conviction that the expert is wrong if not actually speaking the untruth. Most judges allow with an unususal tolerance the most virulent of questions.

that he was forwarding certain reports. These related to military information regarding the French army.

The letter and the specimen writing of Dreyfus which consisted of barely a few lines was submitted to Bertillion of the anthropometric test fame for opinion. He opined that the letter was written by Captain Dreyfus. The atmosphere in France was surcharged with suspicion in those days and a mere suspicion of espionage was tantamount to proof. Dreyfus was tried in camera and was awarded life sentence.

Madame Dreyfus thereupon sent the photographs of the disputed and specimen writing to David. N. Cavalno of America who gave his opinion that the letter was forged. We are not concerned here with the heroic efforts of Zola to secure the acquittal of the innocent Dreyfus. This long drawn out tragedy was ended in 1906 or twelve years after his conviction, by the supreme court's verdict that Dreyfus was innocent, and it was not before the real culprits, Col Henry and Major Esterhazy were found out.

If Experts have sometimes made mistakes they have also greatly aided the cause of justice. In the Lindberg baby murder case, it was an handwriting expert who supplied the clue by examing the ransome note.

It is due to the mistakes made in the past that the trend of judgements has been to belittle the testimony of the handwriting experts. I will content myself with quoting two extracts, one from a celebrated Jurist and the other from a judgement of an Indian court. Taylor in his work 'Law of Evidence' Vol. 1 page 59 says, "Perhaps the testimony which least deserves credit with a jury is that of skilled witnesses. These witnesses are usually required to speak, not to facts, but to opinions; and when this is the case, it is often quite surprising to see with what facility, and to what extent, their views can be made to correspond with the wishes or the interests of the parties who call them. They do not indeed wilfully misrepresent what they think, but their

can be differentiated, secret writing revealed and these rays can be made to serve industry in a variety of ways.

Chemistry is also fighting the falsifier in a relentless fashion. The case of Colonel Pilcher occurs to the mind in this connection. Col. Pilcher was the exucutor of the will of a Miss Kerferd who died in 1909. Col. Pilcher received only a small annuity from her unsigned will. Soon afterwards he produced a will which according to him was found in the deceased's papers. This will was signed and bore the date of 1898.

On an action being brought by Miss Kerferd's relations Dr. Ainsworth Mitchell examined the ink chemically and found that it could not be as old as alleged. Col. Pilcher was convicted.

X–Rays also play an important part in crime detection. In a recent case in which I had been called in as a Fire-arms Expert it was the use of the X-Rays that brought the guilt home to the accused. It was an attempt to murder case. The doctor who examined the wounded man found the wound of entry to be bigger than the wound of exit. This was something of an impossibility. And the expert was summoned to resolve the Doctor's dilemma. I was allowed to read the medical report and had no difficulty in coming to the conclusion that the pellet was still embedded in the body and the so-called wound of exit was caused by a secondary missile. A piece of bone which was chipped off one of the ribs due to the impact of the pellet had been responsible for the smaller wound. The X-ray photograph confirmed this opinion.

I am not claiming such perfection to the science of handwriting identification. It is not as perfect as say mathematics, physics or chemistry. That mistakes, sometimes grievous mistakes have been made by the handwriting experts cannot be denied. You will all recall the lamentable case of Captain Alfred Dreyfus of the French army in this connection. Dreyfus was charged in 1894 of having written a letter to Major Schwartzkoppen, the German Military attache in Paris, informing him

anti-social tendencies by their series of films called " Crime does not pay."

I will touch but briefly on the part played by Science in the deduction of crime, as I understand there are others who are devoting themselves more fully to it. I will concern myself with a more general cosideration of the subject, but before I do so, it would be worth while to pass in brief review the contribution made by Science.

Before the system of identification by finger prints was fully established, identification was done by the Bertillion system of measurements which consisted of 12 measuremens, of height, the length and width of head, the length of middle-finger the length of foot and other measurements of the comparatively more stable parts of the body. This was introduced in 1882 and held the field for quite a long period. The value of finger print was first realized in 1856 by Sir William Herschel an Officer in Bengal and about the same time by Dr. Faulds in Japan. In India finger prints were used from immemorial times but alas, due to the absence of a scientific attitude of mind no one had systematically worked on them and the credit for this revolutionary discovery must go to Sir William Herchel, Dr. Faulds and Sir Francis Galton. This system of identification was first put to test in the case of Will West, a negro of Leavensworth, Kansas, U. S. A. This Will West was identical in every respect, in measurements, in similarity of face and even name to another negro of the same prison. Only the finger prins differed.

Then there is the grear discovery of the Ultra-Violet Rays. The phenomenon which these rays produced is called " Fluorescenc " These rays are selective. By reason of their peculiar effect, one is enabled to differentiate between two different things which appear similar in ordinary light. This sometime does away with a necessity of chemically analysing certain objects and has the added advantage of quickness. Objects are also not altered as they are altered if chemical tests are applied. Paper

thus makes she her great P's." He further identifies her writing by the soft wax, the seal and the phrases. Shakespeare besides being the England's greatest poet has undoubtedly the makings of a great hand-writing expert in him.

Though the importance of hand-writing identification has been recognised from very early times, the Science is of recent growth. A hundred years ago its methods were crude and the experts relied on inspiration and first impressions rather than on systematic observation and study. Great strides have since been made and many sciences have been pressed in the service of this newest of them all.

Microscopes, various lenses, Cameras, ultraviolet and Infra-red Rays, mathematical instruments, chemical reagents and other apparatuses all help the examiner of the documents in un-revelling the mysteries of a complicated case.

Each age has its peculiar problems to solve. Science and Crime follow closely on each others heels. Taking advantage of the condition prevalent in unscientific society, crime thrives and has its day. Society then awakes and counters crime by new technical devices.

In the Mogul and Maratha Times, the forger flourished by forging Sanads and bogus letters purporting to come from the authorities. I may here cite the well-known instance from Indian History. The murder of Peshva Narayan Rao was due to the alteration of the letter 'Dha' into 'Ma' by Anandibai so that it read 'Mara' instead of 'Dhara', it is a curious irony that while the criminal of old had to rely on his unaided skill and deftness of hand, his modern successor has the use of the type-writer, the camera and a thousand and one other ingenious devices, themselves the product of Seience, to further his nefarious end.

But Science has now far outstripped the methods employed by the falsifier, and the forger of today is pitted against the accumulated knowledge of a century. As is well-known the shrewed Americans are using this fact to over-awe individuals with

selection Boards, who enquires into the state of the candidate's mind. Would not the Administrate of Justice be much more humane if every delinquent is examined similarly? Law must be based on Science. As Oliver Wendell Holmes says "An ideal system of law should draw its postulates and its legislative justification from Science. As it is now we rely upon tradition, or vague sentiment, or the fact that we never thought of any other way of doing things, as our only warrant for rules which we enforce with as much confidence as if they embodied revealed wisdom."

The Science or art of hand-writing identification has been recognised for comparatively long time. As far back as A. D. 88 we find the following in the Institutio Oratorio of Quintilian :—

"It is therefore necessary to examine all the writings relating to a case ; it is not sufficient to inspect ; they must be read through ; for very frequently they are either not at all such as they are asserted to be, or they contain less than was stated, or they are mixed with matters that may injure the clients' cause, or they say too much and lose all credit from appearing to be exaggerated. We may often too find a thread broken, or wax disturbed, or signatures without attestation ; all which points, unless we settled them at home, would embarass us unexpectedly in the forum ; and evidence which we are obliged to give up will damage our cause more than it would have suffered from none having been tendered."

Recognition of the Art of Hand-writing has, let alone law, found a place in literature as well. In spite of reams of papers and oceans of ink used up by critics, Shakespeare still continues to surprise us in nowel ways. Would it surprise this learned gathering too much to know that the immortal bard had enunciated the principles of comparison of letters.

In the 12th night when Malvolio receives the love letter sent on purpose to fool him, he says :— "By my life, this is my lady's hand : these be her very C's her U's and her T's ; and

SCIENCE AND JUSTICE

BY

Mr. M. B. Dixit, M. A., LL.. B., F. R. M. S. (London)

Government Examiner of Questioned Documents for C. P. and Berar and Finger Prints, Fire Arms and Currency Notes Experts of NAGPUR & Hyderabad-Dn.

I deem it a great honour and privilege to be invited to this first session of the 'All India Law Conference' and to read a paper to this distinguished assembly.

I see, before me in the person of Sir Maurice Gwyer an eminent jurist, who as a Chief Justice of the Federal Court of India, was a worthy custodian of peoples' rights and a stout defender of their liberties. I see many other brilliant exponent of the law, who as Advocates, Judges, or administrators have earned undying renown.

You will appreciate, therefore, if I find myself a little out of place in this August gathering, and if you have been so kind as to invite me here, it is because I am sure, of the growing recognisition of the service that Science can render to the cause of the Justice.

As is well-known, law is conservative. It is averse to change and suspicious of every thing new. It lags behind the advances made in socoilogical or scientific fields. It gives tardy recognition to new methods of proof. Time was when certain type of testimony was not admitted in evidence. It is only lately realised that the Fire Arms Expert can aid justice by his examination of the evidence-bullet and its comparison with the test ones. Evidence of Engineers, Textile Experts, Finger-print Experts and Doctors is admitted but the evidence of Psycho-analysts is ruled out.

I do not see any reason why this should be so. Great are the advances made in that subject and the Army has been quicker to take anvantage of this comparatively new Science than the legal profession. They have a trained Psychiat attached to their

the 19th century scientist, who thought that his knowledge was complete, has been entirely shattered. The one thing of which the modern scientist is sure is that he is but on the fringe of vast discoveries. In the same way criminology can go forward with science in a direction it would be impossible to prophesy.

I think it would not be out of place to discuss one or two points on which research is proceeding, and if any of them sounds rather impracticable, let it be remembered that the impossibility of to-day becomes common place to-morrow.

Starting from Bertillon's dictum that no two human beings have exactly similar bones, an American research worker is working on a new system of identification by the use of whole skeleton as means of identification as infallible, as fingerprint system. Photographs are taken of entire human skeleton and means are being sought whereby these characteristics can be referred to in a basic formula.

Another interesting research work is being carried on by Mr. R. F. G. Greller who is devoting his whole time to the problem of medical jurisprudence with special reference to a device called " Retinascope ". Mr. Greller believes that the eye of murdered person who dies from a sudden shock or in violent circumstances retains an image of last visual experience. In other words he claims that the eye of such a person functions as a camera.

The perfection of scientific criminology means the complete conquest of crime with the advancement of the various branches of sciences The chances of success for the criminal are minimised in the inverse ratio of the progress The vast organized machinery of Scientific detection must always be superior to the efforts of individuals. Only when criminology has become so perfect that no one will dare challenge it, can science consider the conquest of crime complete and that day will come.

This case is one of the finest examples in the British records of perfect application of a new and inherently intricate science.

The examination of documents forms a very important part of the work of scientific criminologist. As our every day experience in law Courts shows hardly a day passes when a legal inquiry in which there is some dispute of the document about its geunineness or otherwise does not arise. Thus the document-expert frequently appears in Courts and is called upon to give his technical assistance in the interest of justice.

The inquiries which may arise in this field are many and of a great variety. The expert may be called upon to give an opinion of the genuineness of the signature, the age of document. about the alteration, or inks being same or not, identification of two pencil writings etc.

Time has now come when due to the advancement in the various branches of sciences a Fool Proof forgery is almost impossible. When the detection of forgery was primarily dependant on the pure opinion of the handwriting Expert, Judgment could always be questioned. But today not only the science of graphology and caliography have been much improved but also the scientific aid of the chemist, photographer, and microscopist, has come to the help of detecting a forgery.

In short I have tried to show how science is fundamental to criminal investigation. Some of the cases quoted above will show that there is no branch of science which does not play part in actual practical enquiry. Probably it may appear that scientific criminology has almost reached a point beyond which no progress could be made.

Science itself has still an illimitable horizon before it and no man can forecast its future. Scientific criminology must follow the unending march of science, for it is nothing more nor less than the application of all scientific knowledge to the purposes of the criminal law. The self-complacency which characterised

When subsequently a man was arrested in the Hertfordshire on charges of larceny and housebreaking, it was found that his finger prints were those of the man who had left behind so striking a trail in the 8 apparently unconnected burgalaries. This case is probably unique in having provided Scotland Yard with a complete history of a criminal's acts and movements without being known to the records.

The evidence of finger prints is very positive and unalterable leaving behind a positive identification. The indications of permanance of the ridge patterns to the individuals were provided by the experience of the notorious American Criminal John Dillinger, who in his attempt to avoid arrest had tried to alter his finger tips by plastic surgery. His idea being that, that would completely eradicate the ridge patterns and would not help his identity. But the comparison of the two tips before and after the plastic surgery proved its failure.

The identification of the firearms from the ammunition fired therein is one of most important additions of the science to the criminological work. Just as the identification of the finger impression is based on the principle that the nature of patterns on the finger tips identifies the human being so also the various marking produced by the fire arms on the amunation fired through it relates or connects one another. This identification has proved of immense use in some of the sensational cases. Mention could be made of the Gutteridge case. The police constable Gutteridge was shot at by revolver and Brown and Kennedy stood the trial for the charge of murder. The investigations were undertaken by war office whose experts showed truly outstanding skill in establishing the identity of the bullet and the cartridge case with the revolver of Brown. Another and in many ways even more remarkable was a case in which a man was arrested for the murder of a Dr. Cypriot in London. There what might have been a grave mis-carriage of justice was averted through the skill of Major Gerald Burrard the famous ballistic expert who appeared for the defence.

In a stream 4 bundles were discovered containing remains of human body. These consisted of various bones and pieces of flesh all of which were intentionally mutilated to avoid identification and the identifying characteristic marks were very skillfully removed from the body. However an examination of the remains showed that the remains must have been of two bodies. But it was not possible to completely build up two bodies. In spite of odd difficulties the experts did reconstruct those bodies to such an extent that the Jury was able to accept the identificating of the remains as those of Isabella Ruxton.

The most interesting part from the identification point of view was the super-imposition of the skull of Mrs. Ruxton over her photograph taken in a studio during her life time. From this point of view this case was first of its kind. In addition to this, identification of blood stains, finger impressions and palm impressions were also used for identification. The whole case was a triumph for the scientific investigation including the subjects like medicine, photography, finger prints, textiles etc.

Great Britain was one of the first Western countries to adopt the finger-print method and the identification by this means has played an important part in many criminal cases. Following is the most interesting case and unique of its kind for the purposes of identification by finger prints known as the two Willam West a reference to which is already made. In this case two persons had the same Bertillon measurements but it was due to their finger impressions that they could be identified. These two persons were very similar to each other in all respects but their finger prints could only identify them separately.

Another interesting case of finger prints was, the detection of 8 burgalries which were committed at different places between summer of 1928 and of 1929. The prints were not known to the police but scientific examination showed that the points of resemblance indicated that they were all made by the same man.

persons had the same name almost the same anthropometrical measurements etc. But it was only the finger prints which distinguished them.

Probably the first systematic use of science in criminal investigation was medical evidence. ***The Crippen case.*** One of the most famous cases in which medico-legal science has played a vital part was the trial of Crippen for the murder of his wife. One special point may be mentioned which will be of interest, and will go to show how far the medico-legal inquiry can go to establish identity even from the most fragmentary data.

In the house occupied by Crippen the remains of a human body were discovered in a much mutilated condition, and it became important to prove, if possible, their identity. The task almost seemed hopeless but a piece of the abdomenal wall measuring about 11 × 9 inches was in the remains and there was also another piece of abdomenal wall measuring by about 7 × 8 inches on which was a mark, some 4 inches in length and wedge-shaped, its dimensions being 7 × 8 inches at the bottom, half inch in the middle and 1/4th at the top. The mark, which was darker than its surroundings was characterised by a number of fine transverse lines.

The opinion of the expert who made the examination was that, this mark was the scar, left by an operation, this evidence being based not only on general appearance, but on microscopical examination. At the trial, it was proved that the deceased woman some years back, had undergone an abdominal operation that would leave a scar of exactly this same kind described by the expert witness.

Ruxton Case. The trial of Dr. Buck Ruxton in March 1936 for the murder of Isabella Ruxton and the maid servant Mary Rogerson in the previous September is one of the most striking examples of the immense potentialities of medical Jurisprudence. Indeed it is one of the major triumphs of scientific investigation of crime. The evidence was intricate and the questions involved were of very complicated nature.

Courts which are based on scientific evidence, of the most abstruse type will show that it is not lagging behind. The most famous cases which could be mentioned where the scientific Criminology was at its best are the "Ruxton Case" and the "Gutteridge" Case (Brown and Kennedy).

With the growth of these various branches and the effective results produced by the help of the laboratories the stablishment of the various police laboratories in England has progressed. Mention could be made of the Forensic Science Laboratory at Bristol, Hendon etc. and the various medico-legal departments, such as of the University of Glassgo etc. Here it may be worthwhile to mention the remark expressed by Henry T. F. Rhodes when we compared the diflerent police workings. "Experts are extensively employed in this country but many are not officially attached to the police. It is our want of organisation and not our use of science which is at fault. The policeman does not understand the seientific man, nor the scientific man the policeman. Nor they will ever understand each other until they work together."

India. It is to be much regretted that in spite of the heavy crimes there should be no scientific criminological laboratory working in India. No doubt whenever the ocassion arises the police do like to have the assistance of expert knowledge but there is no co-ordinated organisation working hand in hand with the police and the Expert.

We may now deal, with some of the subjects, which arise in law Courts from time to time. Handwriting, Fingerprints and Medicine have more or less become known widely. The identification of handwriting and fingerprints have almost been accepted by the law Courts. The identification of fingerprints has assumed a great importance and there are many cases in which the identification of individuals have been established beyond doubt by this process. The famous case of identification by fingerprints is that which is known as the Will–West. These two

integral part of the French police System. In these laboratories not only the actual practical enquiries are undertaken but a great deal of reasearch work is also going on with a view to apply newer methods for the detection of crime. Unlike other Countries French detective has fullest scietific backing from the start of the investigation as the part of the ordinary routine. This not only aids the practical investigation but also gives the laboratoties the greatest chance of being helpful for it. It can examine all clues within its field and sometimes gives the largest amount of information which otherwise would not have become available. Examples may be given that the analysis of the tobacco ash, the traces of the lipsticks have helped in the detection of murders Amongst the very able and talented Scientists, Dr. Edmond Locard of Police Laboratory at Lyons tops The literature of the scientific criminology has been greatly enriched by his writings on many different aspects of the detection of crime.

U. S. A. In the U. S. A. also as must be expected the parctical use of the scientific criminology has reached an advanced stage. One of the chief centres is the Crime Laboratory of the National Bureau where some remarkable work has been carried out notably in the fields of forgery and ballistics.

The enthusiastic American Police are known for quick utilising every new advance in the scientific criminology. The employment of the lie detector etc., which is the latest devices can be an evidence of it.

The Laboratory working with detectives solved the murder of Mrs Tilloptoa of New York in 1936. John Florenza an upholsterers Assistant was tried and convicted of the crime, (known as Tub bath murder). His arrest being made after a brilliant investigation in which a piece of twine left on the scence of crime was found to have come from the shop where Flroenza was employed.

England. We have seen that U. S. A. and France are using scientific methods yet as the numerous cases come to British

the field of Criminology, the specialisation in and the application of such branches are ever on the increase.

Physics, Chemistry, Medicine etc., are being applied in the respective fields. In the West recently there are being established regular laboratories for the criminological works. The object of which has been to demonstrate the various aspects of crime and their detection purely from the scientific point of view.

2. About 30 or 40 years back a misroscope or a camera was almost unknown to the law Court in spite of its utility in the interest of justice. But in these days of scientific advancement instruments such as spectroscope, Ultra Violet Rays, Infra Red Rays, are being used. In short the various developments in the different branches of sciences can go in the questioning of each and every inanimate clues.

To what extent this knowledge is utilised in actual inquiries? Does it form part of the detectives' equipment or is it merely employed in abnormal cases only when all other methods have failed? No general answer can be given to these questions though it may be said unhesitatingly that scientific Criminology is widely used. A great deal depends on the national outlook. Some countries, in crime investigation as in other spheres of known activities, seem eager to adopt every aid and assistance that science can supply. And others use scientific methods more sparingly as an adjunct to routine enquires rather than as formal part of it. Here it would be of interest to know which of the countries have given great lead in the matter.

France. There can be no doubt that for many years past, France had held the lead in the application of the scientific methods to the fight against crime. The Bertillon system the first scientific system of identification was developed in that country, and the bureau of identification set up in 1882 was the first of its kind in the world. To-day police laboratories headed by men of the highest scientific qualifications are an

FORENSIC CRIMINOLOGY.

BY

C. T. Bhanagay, B.A., L.L. B., F. R. M. S., (London)

Examiner of Questioned Documents & Consulting Criminologist
to C. P. Police NAGPUR (C. P.)

1. In the story of progress Art always precedes science. Man meets his problems first by learning from Experience and the understanding of the various forces which are necessary and a science is developed. This is generally the experience of every observer.

Natural science began to develop by leaps and bounds in the middle of the ninenteenth century. This introduced exactness and wide spread knowledge of things.

Justice which had been trying for centuries to solve problems and search for truth turned to science. The light of science clarified the matters and change became apparent in the criminal investigation and the Forensic criminology. Bertilloion, Galton, Henry, Locard, Osborn, Wentworth, Lucas, Mitchell and other scientists built this foundation of police work and the methods of Natural and related Sciences as aids to criminology.

Science is not a short-cut in the investigation of crime, nor is it intended to supply the normal duties of the detective. The Scientist and the C. I. D. officer are inter-dependant. The investigating officer in the examination of sciences of crime, looks for and preserves material for the scientist, who too in turn is able to supply useful evidence and frequently to provide information as to the perpetrators of offences. It will be observed that in some materials by the examination of prisoner's clothing and other materials by the expert, a new line of investigation has resulted.

The science of crime particularly from the forensic point of view forms a vast and comprehensive subject of study. Studied from its theoretical and practical aspects it gives material for the study of various branches of the subjects with the progress in

International Law, a growing Science.

It has to be remembered that International Law is a growing Science. The principles which are recognised in one State are not exactly the same as those recognised in another State. As stated by Dicey in his Conflict of Laws, "the list given of the cases in which foreign Courts are, or may be courts of competent jurisdiction, is not necessarily exhaustive. The Law or the authority to be ascribed to the decisions of foreign tribunals is still uncertain and still liable to undergo further development by means of Judicial Legislation."

In this connection, I have not overlooked the fact that there are various decisions both in British India as well as in Indian States in which the view has been held that such foreign judgments are nullities but I venture to say that they have overlooked the points that I have tried to make out in my address.

Finally, whatever may be the case with regard to the application of International Law as between England and France or England and Germany, the application of International Law as between British India and Indian States has to be interpreted in a realistic and reasonable sense and the spectacle of a person going to a place which is a mile off from his place into a foreign territory incurring obligations in that territory and then running back to his place and absenting himself when a suit is filed against him and eventually when a suit is actually brought against him in the territory in which he is living to plead that the foreign decree is a nullity has to be put an end to. If it cannot be put an end to by an equitable and reasonable construction of the statute, it is only Legislation that must come to the aid of honest creditors in order to protect them from the fraud perpetrated on them by dishonest debtors.

in force was passed in the year 1908 long after the judgment in the Faridkote case.

Any other view would lead injustice.

The interpretation by which, while a foreign judgment obtained after contest can be regarded as a basis for a suit in a domestic Court, the same judgment if obtained ex-parte is a nullity and cannot afford a basis for a suit in the domestic Court, is, I think, productive of the greatest mischief. Is it not putting a premium on a person absenting himself from the foreign Court and thereby taking advantage of his own wrong? Is he not in a better position than one who has appeared and contested the suit? Is it in consonance with justice and equity that a person should be permitted with impunity to come into the jurisdiction, make contracts and have dealings and then walk out and again come in and walk out and repeat the process ***ad infinitem*** but absent himself when a suit is brought against him? The injustice of that position is pointed out very clearly in a case decided by the Allahabad High Court in 49 Allahabad, page 669.

Special Provision regarding ex-parte decrees in Hyderabad.

It is a matter of great satisfaction that in so far as the Hyderabad State is concerned, there is a sub-section added to Sec. 8 corresponding to Sec. 13 of the British Indian Civil Procedure Code whereby in the case of ***ex parte*** decrees, the Court is not precluded from an enquiry into the merits of the case and where the defendant wants it, it is bound to make such an enquiry. This, in my opinion, is a very salutory provision. It reproduces in a different form a provision which existed in the earlier British Indian Code of Civil Procedure of 1882 where such a provision was enacted in regard to suits instituted in British India on the judgment of a foreign Court in Asia or Africa except certain specified courts.

British Indian Court on a judgment of a foreign Court, the judgment and decree of the foreign Court cannot be deemed to have merged in the decree passed by the British Indian Court.

The view expressed above is supported by later judgments of the Privy Council, namely the cases in 30 Indian Appeals, 220 and 38 Indian Appeals, 129.

These decisions cannot be explained away as regulating only the question of a jurisdiction of a British Indian Court to pass a decree against non-resident foreigners. The above discussion will make it clear that if a Court is according to the Law by which it is governed, entitled to pass a decree against a non-resident and absent foreigner, such a decree cannot be challenged as incompetent when a suit is filed in a domestic Court on the said judgment.

Exclusion of decrees under a reciprocal arrangement is analogous.

That there is no real difference in principle between cases where a suit is filed on the strength of a foreign judgment and case where a foreign decree is sent to a Domestic Court for execution in accordance with reciprocal arrangement for execution of decrees, and in Hyderabad there are two judgments of the Judicial Committee which have adopted the above principle in regard to execution of decrees passed by the Secunderabad Court.

It need not be stated that for purposes of the Civil Procedure Code, the Secunderabad Court is a foreign Court.

Bearing of the Limitation Act on this question.

The Limitation Act both in British India and in Hyderabad while enacting Article 117 (corresponding with Article 103 of the local Limitation Act), merely refers to "a suit on a foreign judgment as defined in the Civil Procedure Code". It does not make any reservation or exception as regards judgment against non-resident foreigners; and here again, the limitation Act now

cable to the place where the judgment was pronounced can be regarded as incompetent.

(ii) In the second place, clause 'C' takes in the question of the confirmity of the judgment to the rules of International Law. That being the case, it would not be correct to interpret clause (a) as referring to competence in the international sense.

(iii) In the third place, everybody admits that the expression "court of competent jurisdiction" in Section 14 corresponding to Section 9 of the Hyderabad Civil Procedure Code refers to competence in the domestic sense; and this view has been upheld by a recent judgment of our Judicial Committee. (34 Deccan Law Reports 326.)

(iv) In the fourth place, Act No. V of 1908 which was enacted long after the passing of the judgment in the Faridkote case, while enacting Section 20, did not exclude non-resident foreigners from its operation in cases where jurisdiction is conferred on Courts within whose limits the cause of action arose wholly or in part. Nor has any alteration been made as regards non-resident foreigners in the Letters Patent of the several High Courts which have been constituted since the decision in the Faridkote case.

The conclusion therefore is irresistible that in cases where the absent Defendant is a person who owes allegiance not only to the State of which he is the subject but also to the power that has enacted the legislation for the Court in which the Decree is passed, the Decree of the foreign Court is certainly binding especially where the ground of jurisdiction is the arising of the cause of action.

The foreign decree itself creates an obligation.

Apart from the effect of a foreign decree by a competent Court in such foreign State, the Decree itself creates an obligation which is binding on the Defendent and which he has got to discharge. It has been held very recently by the Lahore High Court that even in cases where a decree is obtained from a

the forum of that country, then, such judgment is not a mere nullity and the Defendant would be under an obligation to obey such a decree. In as much as under the Civil Procedure Code enacted for British India, the local Legislature has prescribed that the accrual of the cause of action is as much a ground for conferring jurisdiction as the residence of the Defendant himself, an ex-parte decree pronounced *in absentum* by a foreign Court is not an absolute nullity.

(c) It will be noticed that an important factor has been overlooked in the cases that have followed the Faridkote case without considering all the implications that flow from that case. That was a case that was decided in the year 1894 when the Code of 1908 had not come into force. It is only in the Code of 1908 that clause (a) to sec. 13 was, for the first time, introduced whereas the previous section 14 which corresponded with Section 13 did not contain anything similar to clause (a). That clause runs as follows :— (I here reproduce just the relevant portion of the section for elucidating my point.)

> "A foreign judgment shall be conclusive as to any matter thereby directly adjudicated upon.........................except,
>
> (a) where it has not been pronounced by a Court of competent jurisdiction."

From the above recital, it follows that if the Court which pronounces the foreign judgment was a Court of competent jurisdiction, then, the conclusiveness of the judgment is assured. The question then arises, "what is meant by competent jurisdictition"? Is it competent jurisdiction under the domestic Law or under International Law? There has been a lot of confusion created in regard to this point. Some cases hold that it is only in the domestic sense that the expression is used and some others that it is in the International sense that the expression is used.

(i) In the first place, I fail to see how a judgment pronounced by a Court held to be competent under the Law appli-

State. But, certain observations that have been made in that Privy Council judgment have, in my opinion, escaped the notice of the Judges.

Exceptions to the rule that a decree pronounced in absentum by a foreign Court to the jurisdiction of which the Defendant has not submitted, is by International Law, a nullity.

I am not dealing in this address with cases in which the Defendant has submitted to the jurisdiction of the Court in one or other of the ways recognised as submissions under International Law.

(a) The first exception that you find mentioned in the said Privy Council decision is that even territorial legislation can give jurisdiction which a foreign Court would recognise against foreigners if such foreigners "owe allegiance or obedience to the power which so legislates". This aspect of the case was dealt with by their Lordships of the Allahabad High Court in the case of the Baroda State Railway in Indian Law Reports, 56 Allahabad, 828. The question that arose in that case was whether the District Court at Agra had jurisdiction to pass a decree against a party in an Indian State. The Judges Niyamatullah and Rachhpal Singh, held that the Agra Court had jurisdiction because the native Indian person owed allegiance not merely to the Indian State but also to the British power which had legislated regarding the jurisdiction of Courts.

In other words, they held that whatever may be the result in cases where the defendant does not owe allegiance to the legislating power, still, in so far as a Native Indian subject is concerned, it cannot be said that he owes no allegiance or obedience to the British power and that therefore the territorial jurisdiction of the British Indian Court ought to be recognised by the Foreign Court.

(b) The second exception that emerges from a perusal of the said judgment is that if the local legislation of the place which enacts the Law authorises the exercise of jurisdiction by

It will be seen from the change of language that the previous view was that a foreign judgment had not the effect of operating as a bar unless the decree conformed to certain conditions laid down in that section. The present section contemplates that a foreign judgment should be regarded as conclusive as to any matter adjudicated upon unless one or other of the circumstances mentioned in the several sub-sections to that section exists. In other words, while as regards domestic judgments the conclusiveness in not taken away if the conditions prescribed in Section 11 are fulfilled, as regards foreign judgments, the conclusiveness is taken away if the circumstances specified in the clauses 'A' to 'F' of Sec. 13 (corresponding to clauses Alif to 'Wav' of sub-section 1 of section 8 of Hyderabad code) exist in any given case.

The Faridkote Case.

The leading case on this subject is what is generally known as the Faridkote case, namely, Gurudayal Singh versus. The Raja of Faridkote decided by the Privy Council and reported on page 222 of Indian Law Reports, 22 Calcutta.

In that case, the Defendant who was a native of ths Indian State of Jhind and who was in the employ of the Raja of Faridkote as Paymaster, left his employment in the State and began to live in British India at a place in the Punjab. The Raja filed a suit against him in the Faridkote Court and obtained an *ex parte* decree. A suit was thereupon filed on this foreign judgment in Lahore. The question arose whether the judgment which had been obtained *in absentum* against the Defendant, can form the foundation of a suit thereon in British India. The Privy Council held that in as much as territorial jurisdiction only attaches upon persons either permanently or temporarily resident within the territory while they are within it, it does not follow them after they have withdrawn from it and when they are living in another independent country; and they held that such a decree was a nullity under International Law. This case has uniformly been followed both in British India as also in our

PRESIDENTIAL ADDRESS

BY

Diwan Bahadur Arvamudu Ayengar,

(Hyderabad Seinior Advocate of Faderal Court.)

LADIES AND GENTLEMEN,

The subject which I have chosen for addressing you is the Enforcement of Decrees of Foreign Courts in the Hyderabad State. The intimation to me to deliver an address was received too late for me to prepare any lengthy or exhaustive speech. Anyhow, during the short time that I was able to get, I had jotted down certain points in connection with the above question. The address may be scrappy and not as exhaustive as I would have wished it to be; but I believe, under the circumstances mentioned by me above, you would forgive me for the short-comings of this address. In fact, I wanted to deliver it *ex-tempore* but I have been suddenly called away to Delhi on urgent official business. I have jotted a few ideas in this address.

Conclusive Nature of Foreign Judgments.

Just as Section 11 of the British Civil Procedure Code corresponding to Sec. 7 of the Hyderabad Civil Procedure Code deals with ***Res judicata*** for the conclusive nature of domestic judgments, similarly, Sec. 13 corresponding to Sec. 8 of the Hyderabad, Civil Procedure Code deals with the conclusive nature of Foreign Judgments. In this connection, I would refer to the difference in language between Sec. 14 of the Code of Civil Procedure, Act 10 of 1877 as also of Act XIV of 1882 and the language of Sec. 13 of Act V of 1908. While the Codes of 1877 and 1882 begin with the words, "***no foreign judgment shall operate as a bar*** to a suit in British India, Sec. 13 of the Code of 1908 begins with the words " a foreign judgment ***shall be conclusive*** as to any matter thereby directly adjudicated upon etc. ..

Muhammadan Sayyid Mahmud, no legal doctrine can be too refined, no legal machinery can be too elaborate". The Supreme International Court, which will beset up after the War, will soon find that the Indian Lawyer is the toughest specimen of the species found in any country of the world.

(*b*) what facts have been disproved, and

(*c*) what facts are not proved;

(2) and base its judgment on only proved facts and no others.

I have already pointed out that the Act does not attempt to lay down any rules on the weight to be attached to any proved fact. It leaves that to the judicial discretion of the Court. The principal defect of the present Indian Evidence Act lies mainly in the arrangement of its sections. I venture to believe that my arrangement of its section makes it less difficult to understand and apply. It will be observed that the re-arrangement of the sections of the Act on the above lines avoids first of all backward and forward references that confuse the student, and secondly, the sections are grouped under definite principles which help the understanding materially.

There is not much to say about the Acts minor defects or about some omissions in it. They have been clearly pointed out in the second of the two excellently annotated volumes of the Anglo-Indian Codes by Dr. Whitley Stokes, who was author of several important Bills which became law in the remarkable "legislative year", as I call the year 1882. Published as those volumes were in the years 1887 and 1888 (the years when I was a law student) much of them is now out of date. But Dr. Stoke's introductions to several Acts are still masterpieces of brevity and clarity. I refer to his Introduction to the Indian Evidence Act in vol. II pp. 811-842 for defects and omissions in the Act. These should be removed and supplied when the Act is revised or amended by the Legislature of either India or Hyderabad.

I conclude this paper with a sentence from Dr. Stoke's General Introduction, which pays a high compliment to the legal acumen of the Indian peoples:—"For the subtle races that produce such lawyers as the Hindu Muttuswamy Iyer and the

3rd. Re-examination; at which other than explanatory questions should not be put without the permission of the Court.

Under this chapter come the rules as to the competency and compellability of witnesses. The principle that underlies this chapter is that a witness should be allowed to make his statements in his own way so far as possible and give him an opportunity to explain ambiguities or inconsistencies in his statements as well as in replies to the opposite party's searching or even misleading questions.

Part IV. Function of Court.

Chapter 7. What should a Court do in the course of a trial or hearing before it?

(1) Put or prevent any question.

(2) Admit or reject any piece of evidence.

(3) Shift the burden of proof from one party to another :-

(*a*) by presumptions of fact: sec. 114. Definition of "*may* presume"

(*b*) by presumptions of law according to the definition of "*shall* presume" and sections, 79-90.

"Presumption of facts" is the most important function of the Court.

The effect of a presumption of a fact is to shift the burden of proof of the inferred fact from one party to another.

Chapter 8. What should the Court *do* at the close of a trial or hearing?

(1) Sift evidence i. e. find out from the evidence already produced before it :—

(*a*) what facts have been proved.

(3) The person who felt a feeling, or was conscious of a mental state, which is either in issue or relevant.

The principle is that that party should shoulder the burden of proof who would lose his case if *no* proof be produced of the fact in question.

Chapter 6. How should a fact be proved?

By production of the *best* and the most *direct* evidence which should be done:—

(1) by the production of the material thing to which any relevant fact relates: (Except in sec. 32 (b) 2nd proviso to sec. 60, and sec. 65, the Act is silent as to material evidence such as instruments and other material things.)

(2) by the production and proof of (the execution, genuineness &c of) documents — whether "public" or "private": sec. 74-78.

(*a*) Primary evidence of documents (i. e. production of documents themselves) sec. 61-68

(*b* Secondary evidence when primary evidence is not available or when its production would be impossible, unreasonably costly, or extremely troublesome,

(3) by the production of witnesses, i. e. persons who actually saw or heard or felt the fact to be proved (sec 60)

Their oral testimony should be recorded at the three stages of each witness's examination:—

1st. Examination-in-Chief at which the witness may be allowed to refresh his memory (sec. 135-166) but no "leading question" can be put without the permission of the court. (Definition of "leading question".)

2nd. Cross examination at which other than explanatory questions should be allowed to be put and answered.

This is the most important chapter. The principal underlying all the sections to be arranged under this chapter, may be stated briefly thus: The fact B may be considered as relevant to the fact A, if B is connected with A as its part, or its effect, in some way or other.

Note the word "relevant" has two meanings. It means "has a probative force" and also "admissible in evidence". "When we have said" writes Dr. Thayer, "(1) that, without any exception, nothing which is or is not supposed to be, logically relevant is admissible, and (2) that, subject to many exceptions and qualifications, whatever is logically relevant is admissible, it is obvious that in reality there are tests of admissibility, other than logical relevancy. These tests are:—

(a) Somethings are rejected as being of too slight a significance, or as having too conjectural or remote a connection,

(b) others as being dangerous on their effect on the jury and likely to be misused or over-estimated by that body,

(c) others as being impolitic or unsafe on public grounds,

(d) others on the bare ground of precedent. "(Thayer, p. 226) It may be said generally that all "admissible facts" must be "relevant" i. e. must have some probative force, but all relevant facts are not admissible by reason of their probative force being too remote or too slight.

Part III: Method of Proof.

Chapter 5: Who should prove any fact of the above nature?

(1) The person on whom the *onus* or burden of proof lies—generally the person who wishes the Court to believe in the existence of a certain fact or the happening of a certain event: sections 101–114.

(2) The person who is peculiarly cognizant of a fact in issue or relevant fact. Those who are called "experts" and their "opinions" come under this chapter: sections 45–51.

and other parts and chapters may well be arranged as answers to seven main questions pertaining to the production and admission of evidence as follows. I may here mention that the Act does not lay down any rules concerning how to weigh evidence.

Part I: Preliminary.

Chapter 1. Extent and application of the Act and Repeals.

Part II: Proof.

Chapter 2. what ***need not be*** proved ?

(1) Facts to be judicially noticed : Sections 56 & 57 of the Act come under this heading.

(2) Facts admitted or confessed : Sections 17–31 and sec. 58. The object of the chapter is to savs the public time of the Court by taking as proved what is, or should be, known publicity, and by dispensing with the proof of what the party most interested confesses or admits. Note the difference between "admission" and "confession" the condition of their admissibility or non-admissibility are either expressed or implied in several sections.

Capter 3. What facts ***cannot be*** denied or disproved ?

(1) Facts proved conclusively : sec, 112–113 sec. 41–42.

(2) Estoppel : sec. 115–117.

The principle underlying prohibition of proof of matters conclusively proved is public interest; and that underlying estoppel is that no one should be allowed to say one thing at one time and the opposite at another time, after some other person has already acted or altered his position on the belief that the former statement was true. Note the difference between "conclusive proof" and "estoppel". Some commentators like Dr. Field, would transfer the Res Judicata section of the Civil Procedure Code to this Act under this chapter, because it is a variety of Estoppel.

Chapter 4. What ***must be*** proved ?

(1) Facts in issue : Definition

(2) Facts relevant to facts in issue, sec. 3

(3) Facts relevant to relevant facts : sec. 5–16

Sir Bhashiyam Iyengar, a serious looking and somewhat taciturn man, used to make fun of the arrangement, ambiguities, and omissions. He nevertheless acknowledged the Act to be a very useful piece of legislation, ably digested and carefully worded.

It is a pity that the Hyderabad Legislature, newly set up by the late Nizam, failed to remedy the difficulties and defects of the Act when copying it bodily for the Courts and the people of these Dominions. It could have re-arranged its chapters and sections in a simple and logical order. This does not detract from the great credit due to Sir James F. Stephens for compressing a vast subject into 167 " cut and dry " sections of ordinary dimensions.

In the first or preliminary Part, the Act declares that it is concerned with the methods of proof of facts in a Court to determine the rights and liabilities of parties to the judicial proceedings in a suit or prosecution or any other law case. But after stating the Act's extent and application, and defining what is meant by "Court", "facts", "proof", "disproof", "not proved" and "rights", *et cetera*, ", the Act should have been divided altogether into four Parts embracing eight Chapters thus:- Part I, entitled *Preliminary*, containing one chapter, *viz*, Chapter I. Part II, entitled simply *Proof*, containing three Chapters, *viz*. Chapters 2, 3, 4 – all chapters to be numbered consecutively to prevent confusion of numbers of parts with numbers of chapters.

Part III, entitied *Method of Proof*, containing two Chapters *viz*. Chapters 5 & 6.

Part IV, entitled *Function of Court*, containing two Chapters *viz*. 7 & 8. As I have said, Part I and Chapter 1 will be Preliminary devoted to definitions and other introductory matter as mentioned in sections 1 to 4 of the Act itself. There is some difference in the numbers of sections in the Indian Act and the Hyderabad Act. I quote sections according to the numbers of the British India Act Part II is the most essential part of the Act. It answers three important questions concerning facts. It

an indication, mark, or trace which makes "evident" or manifest something else; but in its legal sense it means, a statement or proof admissible as testimony in a Court of Law. There are courts and courts, but a court of law is indispensible for the protection of rights and enforcement of duties of the individuals inhabiting a country.

The Hyderabad Evidence Act is but a translated copy of the Indian Evidence Act; the Bill of which Sir James Fitzjames Stephens, Law Member of the Government of India, drew up in the early "seventies" of 19th Century. He based it on his Digest of Pitt Taylor's two bulky volumes on the Law of Evidence—which work, in its turn, owed much to the American work, Greenleaf's Law of Evidence in four volumes. The best book I have ever read on the subject is "A Preliminary Treatise on Evidence at Common Law" by the Weld Professor at the Havard University, Dr. James B. Thayer. He shews how the law of Evidence developed out of the exigencies of trials before juries in England and the United States of America. But the necessity for saving the public time of the Court is one — an important one — of the main reasons for inculcation of certain rules of evidence in order to prevent admission of not only irrelevant facts but also such relevant facts as have too slight or too remote a bearing on the question under investigation.

Of all the Codes, published in the second half of the 19th Century, the Indian Evidence Act is the most useful of the laws to the Profession and the Public, as it is the most difficult of the codes to read and understand. That is because of the difficulties, not only intrinsic in the subject but also extrinsic in the arrangement of its sections, involving as it does several forward and backward references, which cause no small confusion—to beginners specially. There are also some ambiguities defects and omissions in it. No "Anglo-Indian Code" as the Acts of British Indian Legislature are named, has been the subject of relatively more judicial decisions and judicial pronouncements than the Indian Evidence Act No 1 of 1872. Even

at the time or became so, soon after. For example the great Educationist of Southern India the Rev. Dr. William Miller C.I E., Moderator of the Church of Scotland, in his home introduced my son Mahmood to everybody as his "grandson". I read law in the Chambers of a hereditary lawyer, Mr. Eardly Norton who was called "the Lion of the Bar". I was enrolled as the first Muhammadan High Court Vakil before Justice Sir Muttusawamy Iyer who rose from an acting Patwari to be the Acting Chief Justice of Madras.

I have adverted to some biographical details at the request of one of the enthusiastic promoters of this Conference—not to "boast" myself, which would be foolish at my age, but serve as an example to those young people who though qualified as lawyers have no opportunity of practising. They should continue the study of law as a hobby. All other hobbies pale into insignificance before this mind-expanding and tolerance-teaching hobby. The most precious gift of God to Man is law. According to Lord Buddha, to know Law is to walk the way to salvation. That is the spirit in which I read Law Books even now when I am 81 years old. I commend it to you earnestly and strongly.

I have witten this paper from notes of two lectures I delivered in the historical building "Sir Thomas Munro's Katchery" at Anantapur in the year 1891. I particularise the occasion and the year in order to obviate any objection as to this paper being stale or out of date. None the less, I trust, would a short and simple study of the Indian Law of Evidence be of perennial interest and importance to both lawyers and laymen in and out of Courts. "The art of ascertaining that which is unknown from the known," wrote Thomas Starkie, one of the earliest text book writers, "has occupied the attention and constituted the pleasure as well as the business of the reflecting part of the mankind in every civilized age and country". In everyday life every one has to sift and sort what is called "evidence" for various purposes both grave and gay. The word ***evidence***, in its broadest sense means,

PRESIDENTIAL ADDRESS

BY

Sir Ahmad Husain, Nawab Amin Jung Bahadur,

K. C. I. E., C. S. I., LL. D.,

(former Law & Peshi Member to Nizam's Govt.)

THE INDIAN EVIDENCE ACT.

(Act I of 1872 from a student's point of view)

LAWYERS & GENTLEMEN,

My predecessor at the late Nizam's Court, the famous savant Nawab Imadul Mulk Bilgrami C. S. I., the first Indian Member of the India Council at London, when elected as President of an All-India Conference, instead of thanking that body for the honour, humourously asked it for an explanation why they elected an old fogey as President when there were younger and better men to fill the chair with distinction. I am in a similar position to-day standing before you, a fogey placed in a chair which could be better filled by a younger up-to-date Lawyer. But instead of asking you to explain as did one of the most talented Bilgrami family of India, I would myself submit an explanation why I accepted the honour with thanks at my age of 81 years. It was because of my hereditary interest in law. My forebears were entitled "Faqihs" or Jurists by the Kings of Bijapur and I, being the fifth in the line of legal practitioners, have been a student of law all my life, although I had no opportunity of practising law for more than a couple of years. I endeavoured to follow the example of my Professor of Law at the Presidency College, Madras. Mr. (afterwards Sir) V. Bhashyam Iyengar—the first Indian Vakil to be appointed Advovocate General who when he became Judge insisted on a anncient custom of Indian Sovereigns and received a Jagir along with his Knighthood. He in a case of literary libel answering a question as a witness confessed in cross-examination that he read only statutes and law reports and not novels or other light literature except newspapers. I am very grateful to Providence that I had as my teachers and Professors a dozen men who were famous either

those at the Bar who deserved and stood in need of assistance. In inaugurating the fund, I adverted not to those who have deliberately thrown away their chances or by their habits and ways forfeited the possibility of success, but to those who, given a helping hand at the psychological moment, may be enabled to surmount the hurdles before which they stood helpless. It is hoped that this Conference will bestow some consideration on this topic as well as on organised measures to be adopted for securing legal advice and appearance on behalf of poor persons. If these and other topics which will undoubtedly occur to the minds of the organisers of this gathering are adequately dealt with, there is no ground for pessimism. It should then be impossible for the lawyer to merit the appellation of a cynical author that he is "a self-serving parasite of society". We should be able on the other hand justly to clain with Cicero that all the arts which concern the civilising and humanising of man are linked with that training and that habit of mind which ought to be part of the lawyers' equipment.

---

issued by the General Council of the Bar by way of summary and answers to specific questions, all topics of professional welfare and etiquette are dealt with by Bar Councils. Opinion is practically unanimous throughout the world that such Associations of lawyers should be brought not so much under the supervision of the Courts as under the control of their own domestic tribunals.

In order to produce the best results, it is imperative that there should be a single and uniform system of recruitment to the Bar throughout the country and the enforcement of the doctrine that recruitment to the judiciary should be from those with actual experience of and practice in the Courts. Legal education and the proper equipment of the lawyer so as to fit him for the practice of the profession should also be vested in the profession itself, and we have to undertake a re-modelling of our law examinations so as to secure not only a general knowledge of principles and an acquaintance with Indian jurisprudence but also a grasp of Constitutional and Administrative Law and of legal draftsmanship and interpretation.

It is not my object to deal with any controversial subject, but I cannot, on this occasion, omit to say that there is no longer any justification for the continuance in far away England of the present-day jurisdiction of the Judicial Committee of the Privy Council. Few can deny the remarkable contributions made by the great judges and jurists of England to the evolution of legal doctrine in India; but there are many reasons, both professional and otherwise, that now demand that the ultimate decision of Indian cases, civil and criminal, should be vested in Indian tribunals.

I have reserved to the end, a matter to which I attach very great importance. Law is a jealous mistress, and also a capricious one. The race is not always to the swift nor the battle to the strong. Some illness or infirmity, some misfortune, some lack of timely encouragement or some judicial or professional unkindness has often proved an insuperable obstacle to the young aspirant. Co-operative and other institutions for the benefit of legal men in distress must be part of the Bar's organisation. Not long ago, I attempted to bring into existance in Madras a fund for helping

thorough and careful work with reference to the laying of sure foundations in such matters as pleading, discovery, inspection, interrogatories, admissions and other preliminary but most useful tasks. It enables the senior to concentrate with detachment and the right perspective on the presentation of the facts gathered and collated by his junior who is in direct contact with the client. Such direct contact is of paramount value when the case is being built up; but may be somewhat of a handicap to the counsel arguing in court. Apart from such aspects, the insistence on the arrangement of two or more lawyers in every case of more than trivial importance is one of the best means of removing the sense of frustration in the mind of the junior Bar. Some statutory provision is certainly called for, in this direction. The Madras conference referred to above accepted a resolution suggesting to Vakils practising in the city of Madras that a practitioner of ten years' standing should not accept an engagement in any suit or appeal of the value of over Rs. 5000 without another practitioner of less than ten years' standing appearing in the case. The resolution also laid down what was a rule of practice on the original side, namely, that no practitioner should accept an engagement from a client who had already engaged another practitioner unless the written consent of the latter had been previously obtained. Such a rule is necessary not only for the protection of the junior against victimisation but of the senior himself, who may find it difficult to prevent the snatching of junior briefs by his own entourage.

Sir Bashyam Aiyangar, one of the foremost of Indian lawyers and jurists, as early as 1893, in a University Convocation Address, pleaded for periodical provincial Conferences of lawyers and an all-India organisation on the ground that on questions of professional morality and etiquette little can be done excepting by unanimity of sentiment and that no good will come out of abstract codes of ethical perfection. In America there is a Central Bar Association consisting of representatives from all Bar Associations which hold annual gatherings extending over several days, which receives and reads papers on such subjects as Law-reform, Procedure and necessary political or legislative changes and according to English tradition, beyond the annual statements

In so far as the Government of the country has to be carried on by discussion, the supremacy of the law and the just place of the lawyer in the scheme of our polity should be preserved and safeguarded. The history of England and of the United States is to no small extent the history of their great lawyers and judges; and a similar remark would not be out of place in the case of India. But to win and to occupy such a place, both the Bench and the Bar have to be constantly on the alert. The members of the profession, in order to vindicate its ideals, have not only to be brought together but to act together. The efforts of the various professional organisations in the great cities and in the outlying districts should be co-ordinated instead of being disparate or even sometimes conflicting. We, in India, moreover, have not paid adequate attention to the scientific study of the law so as to bring it abreast of the present needs of society notwithstanding the pioneer work of great men like Sir Rash Behari Ghose, Sir Abdul Rahim and the distinguished series of Tagore lecturers and writers on the Hindu Law. Attention is too often concentrated on advocacy and verdict-getting as the sole tests of a lawyer's merits. The arts of conveyancing and the drafting of pleadings and the pursuit of specialised knowledge in certain important and rapidly developing branches of the law have not received as much attention as forensic dexterity and the up-to-date knowledge of the bewildering catena of divergent decisions.

Equally important with such considerations is the imperative and urgent need to set our house in order. The steady increase in the number of practising lawyers, the extremely unsatisfactory relations that exist between the seniors and the juniors practising in each court or in each jurisdiction and the desparate struggle for maintenance amongst the members of the junior Bar, driving them out of sheer need to rash or foolish departures from professional standards, are phenomena to which we cannot afford to turn a blind eye. There may be reasons why, in a poor country like India, the European scales of payment and the minutiae of attorney's bills of cost may be inappropriate. But there is no doubt that the much discussed and often derided system of dual agency has its undoubted advantages. It produces a more

too soon. We have been passing through a critical period in the history of our great profession. The lawyer has until recently occupied a unique place in Indian society. In public affairs, in legislation and in administration as well as in the courts, he led the van. Not only in the interpretation and application of the law did the lawyer take a predominant part but he was, for many decades, the main spring of the political and even of the industrial, economic and other movements in the country. He, in fact, represented the spear point of educated India. That pride of place is no longer his. Other departments of human activity and other professions have rightly begun to claim their place in the Sun. To be by their side is an honour, but it would be a dishonour to forfeit a place by the side of the foremost on account of apathy, inefficiency or by reason of mutual jealousies leading to internal disruption. May I be allowed to quote from the address to which I have already referred ?

> "The very magnitude of the lawyer's achievements and even his versatility have provoked opposition. Should we surmount these obstacles, there yet remains a tremendous obligation on our part of shaping the legislative, judicial and political future of our land at a time when each experiment is a trial of strength".

In this discussion it may not be out of place to remember that after all politics and Government, whether on a provincial or continental scale and even when concerned with the affairs of a Municipality or a District Board, are largely bound up with legislation and rule-making, and it is no exaggeration to say that much confusion and trouble have been caused by ignoring the lawyer and also, alas ! by reason of the lawyer not adequately specialising in the theory and practice of draftsmanship. The lawyers of India are also not exempt from the charge which the great Jurist Bentham levelled against the society of his day, namely, of tolerating or acquiescing in a condition of lack of harmony between changing social conditions and a practically unchanging law. The lawyer is conservative by instinct but he cannot be content always to expound and to interpret and to be neglectful of the claims of legal reform especially in the matter of personal laws that have outlived their vitality and usefulness.

gathering I took the liberty of reminding the audience that I was the only Vakil amongst the Advocates-General then functioning in India. These distinctions and certain disabilities relating to the holding of judicial and other offices that put a premium on legal education outside the country have now almost wholly vanished. Professional etiquette and the rules of professional conduct have been formulated and are being enforced through the agency of Bar Councils, statutorily constituted in 1926. The number of High Courts and of judicial officers is on the increase. The Federal Court has come into being, and, both by its personnel and its output, has assumed a dominant place in Indian polity and bids fair to occupy a position no wise different from that of the Supreme Court of America not only as the expounder of the rights and obligations of the citizens and of administrative units but as the custodian and vigilant guardian of the Constitution. The law colleges in the country are helping to augment the numbers of lawyers who are being enrolled in every court in the land. Not only is every part of British India under the jurisdiction of well-organised courts but many important Indian States have established High Courts with plenary jurisdiction within their territories, manned by an efficient judiciary and assisted by well-trained lawyers. The Travancore State in which I am now working has a judiciary constituted on up-to-date lines and its High Court is more than a century old. Local courts were established in Travancore in 1811 and the High Court which was originally named the Sadr Court came into existence in 1834. The judgments of this High Court have been, like many judgments of British Indian Courts, quoted and cited with approval by the Judicial Committee of the Privy Council. I need not narrate to this gathering the progress made in the matter of judicial administration in Hyderabad.

It is needless to dilate on the steps taken to codify the laws and to revise the Statute law from time to time and it may be claimed with justice that a perceptible and definite improvement in the status of the courts and the lawyers has taken place without a halt during many years. Nevertheless, it cannot be denied that this Conference is meeting not a moment

PRESIDENTIAL ADDRESS
BY
SACHIVOTTAMA SIR C. P. RAMASWAMI AIYAR,
AT THE
ALL-INDIA LAW CONFERENCE HELD AT HYDERABAD (DECCAN)
on Tuesday the 18th July 1944.

In 1920 a Lawyers' Conference, initiated in Madras at the instance of Mr. S. Srinivasa Aiyangar, outlined the objects of such a professional gathering as is now meeting in Hyderabad under distinguished auspices and in the presence of a distinguished constitutional lawyer who has been also a great Judge. Those objects were to promote *esprit de corps* amongst all sections of the legal profession, to regulate professional ethics and etiquette, to consider and suggest improvements in the practice and procedure of courts, to suggest measures in the interests of the litigant public, to consider legislation and statutory rules on matters in which expert opinion may be of help to the public and Government, and, finally, to protect and promote the common interests of all sections of the Bar. These objects remain as valid and timely now as they did then, and it fell to me to re-emphasise them on the 26th March 1921 when I had the honour of presiding over what, I believe, was the first All-India Conference organised by members of the legal profession. That conference owed its inception to Sir Tej Bahadur Sapru, a consummate lawyer, whose anxiety and preoccupation has ever been to reorganise our profession and to win for it its proper place in national life.

A great deal has happened between then and now and a vast amount of legislation and rule-making has come into being in relation to problems affecting our profession. Designedly I use the expression "our profession", for, it is absolutely true to say "once a lawyer always a lawyer."

In 1920, the distinctions between Vakils, Barristers and Attorneys, although being gradually obliterated, were yet in evidence, and in my presidential address to the Allahabad

heading: "Islamic Notion of Conflct of Laws". Another interesting paper which is announced is on "Similar conceptions of Hindu and Muslim Law with particular reference to their respective sources," by Mr. B. N. Chobe. I am looking forward very much to listening to these papers.

We have before us the prospect of two very busy days and of an intellectual feast of high order. I hope the disinterested efforts of the organisers of this Conference will be rewarded with the success which they deserve so well, and that all of us who have travelled from long distances, will go back richer in knowledge and filled with zeal to improve the efficiency and the integrity of the legal profession wherever we are. I pray also that the work done at this Conference may justify its foundation to such an extent that it may be followed by equally useful gatherngs in other seats of learning in the years to come.

Some years ago I had the privilege of watching a case being argued before a Division Bench of the High Court at Hyderabad. I was impressed by the ability with which the counsel on both sides were advocating their cause and with the ease with which the Hon'ble judges were taking full notes of the arguments. It confirmed my belief that Urdu was capable of expressing satisfoctorily the legal phraseology, which has come into use in English Courts through centuries of practice.

This experiment, though valuable in itself, is an illustration of the fact that such innovations will depend on the needs of each Province or State and the conditions prevailing in the locality. No general rule can be laid down about them.

This conference should devote special attention to the development of a spirit of Research. I am glad to see in the list of subjects for discussion at the Conference that notice has been given to the Secretary of the Committee of about two dozen interesting papers which will be read at the Conference if time permits. I must congratulate my esteemed friend Dr. Nazir Yar Jung and his co-workers on the Committee on the work they have put in for securing so many papers from so many able men. I am sure they will constitute a worthy contribution to the study of different branches of law, if they are collected and published in book form.

It has given me great pleasure to notice a number of papers on Muhammadan law and Hindu law in the list that will be placed before you. A good deal of work has been done in these two fields by distinguished scholars, European and Indian, but a great deal yet remains to be done. If the professors and students of the Osmania University devote themselves to covering some ground not yet covered by their predecessors, they would earn the gratitude of all lovers of learning. One of the scholars on staff of this University, Dr. Hamidullah, has given to the public a number of instructive papers on Islamic law and one of his papers coming before the Conference has the following

a decent income cares to work as a full time lecturer on a modest pay, and, therefore, the colleges are forced to employ some men with good practical knowledge of law as part time lecturers. An obvious remedy may be higher salaries for more efficient full time professors if the Institutions can secure the necessary financial resources. It would be for you in the course of your deliberations to suggest what improvements in the method of teaching law are necessary and how they can be effected.

A subject intimately connected with the question of the improvement of the standard of teaching is the question of its coordination. There are advantages in coordination but if this means the introduction of one hard and fast system in the law colleges of all the Universities in India it may not necessarily be an unmixed blessing, for the scope for the individual capability of each teacher will be restricted. I hope this aspect of the question will receive your hands the consideration it deserves and you will take all the aspects of the question into consideration before arriving at a conclusion.

One innovation in the medium of the study of law, which has been introduced by the Osmania University, deserves notice in this connection. This University when it started the bold experiment of adopting Urdu as the medium of instruction in all subjects, adopted it for the study of law as well. I have had several opportunities of examining the answer papers of the students of this University in its law examinations and have been struck with the ease with which they express what they know and the grasp they show of the subjects they have studied. That is the result of the medium being ther own language. The Osmania University has had many of the standard books of law orginally written in English, translated into Urdu, but still there are many books which students study in English, because their translations are not available. I hope that good books on all branches of law, written in Urdu, will be available before long to facilitate the study of law through the medium that has been adopted.

Among the aims and objects which the Conference has placed before its eyes, numbers 3 and 4 call for special notice. No. 3 desire to have the co-ordination of the teaching and of the profession of law and number 4 wishes to find out how to improve the standard of Legal Education. The latter is the more important of the two. I have not had an opportunity of seeing how well the teaching of law is conducted in the Osmania University, but I have seen it in some other centres, and I venture to express the opinion that there is room for improvement in the arrangements for teaching law in several places. In recent years improvements have been introduced in Law Colleges, but they do not come to the standard of colleges for Arts and Science. Not long ago there were some colleges in which the teaching of law was conducted on an antiquated system, in which a lawyer, whose knowledge of his subject was out of date, came to lecture to his class armed with on old manuscript of his lectures and began to read it out sleeply to his more sleeply hearers, late in the afternoon. The basis of this practice was that most of the students would conduct their main studies in the Libraries of law and the lecturers would supplement with their notes the knowledge so acquired by the students. Some brilliant students used to do well, in spite of the defective system, by dint of their own labours, but a large number of them came out of their colleges without a firm grasp of the principles of law. After passing their examinations they learnt more in the school of experience and if they had real talent they did well in practice. Things have considerably improved of late, but they are still not quite upto the mark. Now there are regular lectures in the Law Colleges of India and attendance at the lectures or at least at a large percentage of them is compulsory. There is regular teaching and there are house examinations. There are law societies and debates and moots. Still a part of the old system remains. In many law colleges there are part time lecturers, who come to lecture before court hours or after court work, as suits their convenience. One reason for this is that no practising lawyer with

his country, if he is scrupulous while trying to dispense justice to the best of his ability.

I think one of the principal objects of this Conference should be to bring home to all the members of this learned profession its dignity and its responsibilities and privileges Under the strain and stress of economic needs and the increasing difficulties of the struggle for existence, a tendency towards making money by fair means or foul is observed among legal practitioners in many places. This tendency has resulted in lowering the prestige of the profession in general and the reputation of legal practitioners as a class has thereby suffered. Efforts have been made by our High Courts to discourage this tendency by enforcing rules of discipline and by punishing some delinquents, but Reform is more effective when it comes from within, than when it is imposed from without. Wherever Bar Associations have felt the need of reform and wherever the opinion of the members of the profession has brought its pressure to bear on those breaking the rules of professional decorum, the results have been more satisfactory. If this All-India Organisation of Lawyers succeeds in making its voice heard in all the Bar Associations of the country and in quickening the conscience of the Bar everywhere to raise the standard of professional conduct to the high level expected of it, it will be rendering a signal service to the country as a whole, the value of which can hardly be over-estimated.

You aim at holding such Conferences periodically, and it is proposed to arrange one in every two years. The Conference will go to any centre of learning to which it is invited. It is an All-India Conference in the sense that members from distant parts of India have come together here in response to your invitation, but naturally the representatives of the South of India predominate at the present gathering and those of the North will be in large numbers when you meet in any town in Upper India. Strenuous efforts will be needed to give the Conference its full All-India status.

The functions mentioned above are not the only useful functions which the members of the profession of law perform. From ancient times lawyers have been the honorary guardians of the liberty of the subjects. When serving as legislators, for drafting the laws of a country, they are expected to take the highest possible care that by any mistake in the wording of an Act or a Code, or in framing a rule or order, loopholes are not left which may go against the principles of equity and good conscience or which may unduly infringe the liberty of the subject. As critics of a proposed legislation they can similarly render valuable help. Work of this nature is ordinarily done by lawyers of experience and reputation, but can be done with considerable success even by the younger and the humbler members of the profession, if they devote time and thought to a consideration of the merits and demerits of a proposed measure. Similarly the assistance, which all lawyers, old and young, are expected to give to the proper conduct of judicial administration, does not necessarily depend on their standing in the profession or to the amount of their monthly income, but on their sense of duty and responsibility and their honesty and integrity.

The notions that exist in some quarters regarding service to one's motherland require a little correction and adjustment. I am one of those who believe that every citizen of a country, who performs faithfully and with due care, the duty which he has undertaken or which is assigned to him, is rendering a valuable service to his country, however restricted the sphere of his duty may be. A lawyer, who honestly advises a client to desist from fighting a case in which there is no chance of success, or who fights a good case and helps an injured man to get justice, without minding whether his own compensation for the work done by him is adequate or not, is rendering a service not only to his client, but to his country, as he is helping the course of justice and minimising the chances of injustice. Similarly a lawyer called upon to preside over a Court is serving the interests of

It is hardly necessary for me, before an audience such as this, which consists mostly of those who have devoted their lives to the study of law or to its practice as a profession, to dwell on the importance of Law as a subject of study or on its immense value to the peace and prosperity of a country. Suffice it to say that since the beginning of the history of civilised mankind, the progress of man in arts and science and the good administration of state have depended on the existence of law and the willingness of the people to obey its commands. It is for this reason that individuals having a mastery of this subject and the capacity to interpret it correctly or to apply its rules justly and equitably, to all concerned, have always commanded great influence. Lawyers have occupied positions of eminence in ancient times in the States under which they lived and continue to do so till now. Many of the most advanced States in Europe and America have had distinguished lawyers as their administrators and law-givers and the same has been the case in our own country. Ever since the establishment of British Rule in India, the department of law and justice is the one department which has gained in importance. It was the first department to be thrown open to qualified Indians and it is in this that they first made their mark. During the latter half of the last century and since the beginning of the present century, India has produced a galaxy of advocates and Judges of whom any country may justly feel proud. There is nothing which can help the existence and continuance of a stable Government in a country or State than the establishment of a system of even-handed justice between man and man. The more strictly and independently the Judges of a country enforce the rule of law, the greater is the confidence which is placed in the Government by people who live under it. Those who practise the law in the Courts of a country are as potent a factor in the proper discharge of their duties by the Courts and in the success of the judicial department, as those who preside over the Courts and decide the fates of the seekers of justice.

sovereign His Exalted Highness the Nizam, a benefactor whose generous gifts to the cause of learning have won for him the richly deserved title of Sultan-ul-Ulum i. e. "the King of Learning". Hyderabad has also been fortunate in having had a succession of wise and cultured Prime Ministers from the great Sir Salar Jung downwards. Among the last of its great administrators may be mentioned the names of the late Maharaja Sir Kishen Pershad and the late Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari. You have in your present Sadr-i-Azam, H. E. Nawab Col. Sir Mohammed Ahmed Syeed Khan of Chhatari, one who has won laurels as an Administrator in British India and has now the honour of being at the helm of the administration in Hyderabad. He is successfully carrying on the traditions of his distinguished predecessors and is ready to help every good cause. It is under auspices such as these that this first All-India Law Conference has come into being and this augurs well for its future and permanence. The fact that the Indian States are as keen as the Government in the British Provinces on maintaining a high standard of Judicial administration is noteworthy, as the contentment of the citizens rests more on this one factor than on any other. A task that this Conference may set before itself may be the publication of some of the best pronouncements of the judges of the High Courts of big Indian States. So far as Hyderabad is concerned the judgements will have to be translated into English and there is no reason why the judgements of your High Court should not add to the record of the judge-made law in India. From an excellent chart in your Exhibition by Mr. Mir Basit Ali it can be seen how great is the progress made by the judicial administration during the reign of H. E. H. the Nizam, a reign of which you all have reason to be proud. I am working at present in Baghdadul-Jadid in Upper India and I have found the Government of H. H the Nawab Ruler Bahadur of Bahawalpur as keen as any other Government on improving its judicial administration.

The first invitation which the Conference had kindly extended to me was to take the chair at one of the sectional meetings of the Conference. The prospect thus placed before me was that of being an interested listener to the papers on various branches of law, which have been written for this Conference by persons highly qualified to speak on the subjects chosen by them. I was, therefore, dreaming of a fairly comfortable time in the chair, when your second telegraphic invitation disturbed that dream. Considering it a call of duty, to which would be improper to say " No ", I am here.

I wish first of all to congratulate the founders of this Conference on their endeavour to bring together members of the Legal profession from different parts of India, with the object of strengthening this noble profession, of co-ordinating the study of law at different centres of learning and of encouraging a spirit of research in various departments. It is gratifying to see that this step has been taken by Hyderabad. This is by no means the only Conference organised here, though it is the first of its kind. This beautiful capital of the Premier State of India has been recently the venue of a Conference of the Universities of India. It has accommodated Conferences and Congresses of Science, History and Philosophy. I think these activities, coupled with other reforms, entitle Hyderabad to be regarded as one of the most progressive States in India. The lead it has given to other parts of the country by making the most widely spoken language in India the, medium of instruction in the Osmania University has shown the foresight and wisdom characterising its outlook on questions affecting the good of our motherland.

You in Hyderabad are lucky in being able to secure valuable help for any useful object from your Government, which is willing to befriend any laudable cause. The rulers of Hyderabad have long enjoyed the reputation of being the patrons of learning and literature and you have in the august person of your present

PRESIDENTIAL ADDRESS

By

The Hon'ble Sir Shaikh Abdul Qadir

General President of the Conference.

While sincerely grateful for the honour that the All-India Law Conference has done me by asking me to preside over this Conference, I have to express deep regret that the unfortunate cause which has prevented a distinguished leader of the legal profession like Sir Maurice Gwyer from being with us on this important occasion is his illness. He was coming to inaugurate the proceedings of this Conference and to help us in starting our work on right lines. We pray for his speedy recovery. He is one of the select few who have shed lustre on the profession to which most of us in this conference have the honour to belong. During his sojourn in India Sir Maurice has not only laid the foundations of the Federal Court, but he has also taken a keen interest in the development of higher education in this country. The Indian Universities have attracted him more than any other institutions. The Delhi University has made rapid progress under his fostering care and guidance. I was eagerly looking forward to being associated with him in wishing you God-speed in the work you have set before yourself. I share with all of you the disappointment which has been caused by his unavoidable absence, but we will have his written advice in his address which we expect to receive. We know that we have his blessings and can count on his support.

I am afraid in asking me to take the chair, your choice has fallen upon one who has served in a comparatively humble way, as a member of the Bar and the Bench. You must not entertain any expectations of having from me a learned address. I can only say a few words as to what I feel about this conference.

realised fully that circumstances will in the future make a demand not so much upon their critical, as upon their creative and constructive powers. I have already mentioned constitution making; but there is going to be much other constructive work of the highest order to be done, in which their countrymen will not easily dispense with the services of men who have submitted themselves to the severe mental discipline of a legal training and who have learned how to express their thoughts in clear and perspicuous language. In these great and vital tasks which lie before you I shall myself have no share; but knowing something of their difficulty and magnitude I shall watch your labours with great and sympathetic interest, confident that the results will be such as to bring honour to the profession and immense benefits to your country. And so, invoking God's blessings upon your deliberations, let me now conclude this inaugural address.

—:x:—

This address has become longer than I had intended, and I must bring it to an end; but before doing so perhaps you will permit me to strike a more personal note. It has been a real grief to me that I have not been able, as I had hoped, to take the presidential chair which the Committee had so kindly invited me to occupy; but I have had to submit to the orders of my doctor, the only dictator to whom even a lawyer need not be ashamed to submit. I had looked forward to coming for many reasons. First, because I have long known and admired the city of Hyderabad, where I have many friends; next, because I once occupied a position of some responsibility in the legal world in India and though I am now retired, I deem it my duty to do all in my power to promote the interests and welfare of the profession to which I still have the honour to belong; and lastly, because the lawyers of India have always treated me since I first arrived in this country with such kindness and consideration and I have formed so many friendships with members of the different Indian Bars, that I should have rejoiced to be among you all again and renewed the pleasant associations of the past. But if I am not with you in person, I can assure you that I shall be with you in spirit, and that I shall follow your discussions with interest and look forward to receiving a full report of them from my friend Nawab Nazir Yar Jung Bahadur and from the energetic Secretary of the Conference.

I hope, indeed I am sure, that much good will result from your labours. Lawyers, whatever their faults, and their critics certainly do not allow them to forget that they possess no inconsiderable number, do at any rate have it in their power, if they act with wisdom and understanding, to render great services to their country. The profession of the law was, up to a very short time ago, almost the only avenue to public life in India, and in the nature of things the great majority of lawyers were in opposition to the Government It has sometimes seemed to me that in this way their critical faculties have been developed at the expense of others: and that they may not yet have

of you and who did a great work for legal education in England founded the Society of Public Teachers of Law, which very soon embraced practically all those engaged in legal teaching in the Universities and the Law schools elsewhere. I was myself a teacher of law at that time and I was one of the original members of the Society, which at a later period in my life did me the honour of electing me one of its Honorary Members. The Society has for many years past become a very influential body and the value of its advice and counsel on a great variety of legal topics is recognized by the highest legal authorities and indeed by the Government itself. It so happens that I received a letter only a few days ago from an old friend of mine, a teacher of law at Oxford and a member of the Society, telling me how the Committee of the Society had taken up with the War Office the question of helping students in the Forces to keep up their studies, and how this initiative eventually developed inio a very extensive educational scheme conducted by the War Office for all the three Services. My friend is Chairman of Committee which deals with the legal side of this scheme, on which not only the Society but also the Council of Legal Education (representing the Bar), the Law Society (representing the solicitors branch of the profession), and the Director of Army Education are all rpresented. I mention this as an example of the service which a Society of this kind is able to perform, if it goes about its work in the right way and is able to secure the confidence of the puplic authorities. Is a similar organization mpossible in India? I am fully conscious of the difficulties presented by the immense distances in India and the cost of travel; but the possibilities implicit in the conception of such a Society or organization are, I believe, so important that those difficulties ought to be faced. Let me recall an answer attributed to the head of one of the great organizations at present engaged in England in solvin question of war supply and similar matters. He was asked about his problems, and his answer was: "If a thing is only difficult, we do it at once; if it is impossible, it takes us a little longer".

as a means of expression", to adopt a phrase from one of the resolutions passed at the Fifth Quinquennial Conference of Indian Universities in December last, should be included; because I have received testimony from all sides of the imperfect equipment of so many LL.B. candidates in the matter of English at the present time. I am not led to say this from any natural bias in favour of my own language; but because, so long as English remains the language of the higher courts and so long as all Indian reports are in English, it is even more important for a law student to have a thorough working knowledge of that tongue than for students in most other walks of life. I believe that a young man who had taken a course of this kind and had passed well in his two examinations (and I should insist upon a high pass standard) would not only have had a sound liberal education but be properly equipped for his profession afterwards. I think it not impossible that students who do not intend to make the law their profession might also be tempted to take a course of this kind; it is not so very long ago that a sound knowledge of the law was regarded in my own country as part of the intellectual equipment of every educated man. There are indeed few better instruments of education than the study of law; and if that study is combined with what some people might regard as a more liberal elements, then I think that you have a mental training which would fit a young man for a successful career in many walks of life besides the profession of the law.

For the purpose of dealing with this difficult subject of legal education it might be desirable for the Conference to set up a small standing committee which could meet from time to time and thrash out matters referred to it, reporting to a larger body afterwards; and indeed much might be done by means of correspondence and the exchange of memoranda on particular topics, so as to minimize the need for many meetings, which are not so easy to arrange in these difficult times. I have a further suggestion to make. Between thirty and forty years ago, the late Dr. Edward Jenks, whose books are doubtless known to all

would be willing to advise in the early stages of the discussions which I have suggested; and after all it must be remembered that no body of men is more likely to welcome a general raising of standards in the case of new admissions to the Bar than the High Courts themselves, and I have no doubt that any action taken with this end in view would have their warm support and approval.

I have only indicated in very general terms the lines on which I believe that discussion migh usefully proceed. But there are one or two practical suggestions which rather diffidently I venture to lay before you.

I agree that young men should not be encouraged to read law unless they already have laid the foundations of a sound general education. Unfortunately, the mere possesion of an arts degree does not always guarantee the latter; and it has occured to me that some university might perhaps try the experiment of a course which combined elements of a more general education with the study of law. At the present time a young man takes four years (in one University three years) over his B.A. and then for his LL.B. another two or three as the case may be. Suppose he were given the opportunity of obtaining a degree (which might be called B.A., LL.B., as at Cambridge) after a course of four years in all, which would be essentially one of legal studies, but with a strong element of history and political science in their more general aspects. The examination for this degree might be in two parts, the first taken after two years study, the second at the conclusion of the course. The first part would stress mainly, though certainly not entirely, the historical and political science elements in the course, the second would be mainly, but again not exclusively, legal; and the candidate would begin his legal studies from the commencement of the course. I think it should be an Honours course and I would not allow any one to enter for it unless he were at least 17 years of ago. I should also insist that "a general course of English

whole of his course. In these circumstances can he ever learn how to make use of his authorities or obtain even an elementary grasp of the nature of a legal principle? And how can it possibly be claimed that he is fit to assume the responsibilities of an advocate?

There is also a considerable variation in the LL.B. requirements in different Provinces. In two cases at least the course is one of three years, while elsewhere it is only two. In two cases a student may begin an LL.B. course after having passed his intermediate; elsewhere the possession of a B.A., degree is a condition precedent. The courses of study also vary. Certainly in one case, possibly in others also, there are papers on procedure and allied subjects, which it seems to me it is not the business of a University to teach. Often the subject for study appear to be arraged in no logical or scientific way, and are not always in my opinion judiciously selected. There ought to be agreement on what should be the elements common to all courses, though of course there may have to be special papers dealing with the local law of particular Provinces; and there ought also I think, to be agreement on the number of examinations which the unhappy student is required to pass before he completes his course. More attention should also be given to what I may call the academic and scientific aspects of the law, though I am well aware that there are teachers in India today whose labours in this direction are worthy of all praise.

I do not of course forget that, so long as the LL.B. degree is a passport to the Provincial Bar, the High Courts must, so far as regards courses of study and certain other matters, have the last word. But it seems to me that if the teachers of law, who include in their number men of great experience, could achieve some measure of agreement on the things which I have mentioned, discussions with the different High Courts would be greatly facilitated. Perhaps those High Court Judges who are known to have a special interest in the subject of legal education

throat competition that an unhealthy state of things has arisen, with an inevitable deterioration in standards of conduct, since in the struggle for existence the weaker brethern are not always able to withstand temptation. Any diminution in the respect and regard felt by the people generally for the legal profession must be prejudicial to the administration of justice; and thus the public interest is affected as well as those of the profession itself. I remember very vividly giving an address on a legal subject some years ago to a lay audience, at the conclusion of which one of those present asked me how I reconciled my description of the Law as a noble profession with the reputation for chicanery and sharp practice which lawyers so commonly possessed. To this devastating question I could only reply that there were black sheep in every profession; but I did not feel that the answer entirely satisfied my questioner any more than it did myself.

I submit therefore that it is well worthy of the consideration of this Conference whether the time has not come for raising the standards of those examinations, the passing of which carries with it the right to be admitted to the roll of advocates But a step of this kind is hardly practicable, and in any case it might operate unfairly as between candidates in one part of India and another, if there were not some general agreement between the law schools of the country both with regard to the courses of study for law examinations and for the standard which must be reached in order to secure a pass. There are other allied topics, which might usefully be considered at the same time There is the question of whole-time and part-time Lecturers. There is the multiplicity of lectures which I cannot but think might be substantially reduced to the great advantage of all concerned. There is the need for much more class-work and tutorial instruction. I believe that I am speaking no less than the truth when I assert that it is possible in more than one place in India today for a law student to pass the LL.B. examination merely by attending a certain number of lectures and wtthout ever having opened a volume of reports during the

our profession can, and I would venture to say must, play in the constitutional developments of the future.

Perhaps, however, I have gone far enough in talking of this fascinating subject, and I must not be tempted to tread upon dangerous ground. Let me therefore turn to the other subject on which I would like to say something, the subject of Legal Educatton.

I think that I shall have your general concurrence if I express the view that, notwithstanding the existence of a great body of devoted teachers, there is much that is unsatisfactory in the present system and that it will be greatly to the advantage of the profession if lawyers and especially teachers of law from all over India could meet here this week, to discuss legal education generally and to try and arrive at some measure of agreement with regard to it.

I said earlier in this address that the subject of legal education was not without a bearing on some of the problems and difficulties which the profession are now experiencing. I believe that to be profoundly true, and for this reason. The overcrowding of the profession in India admits, I think, of no doubt whatsoever; and I think it will also be generally agreed that many persons have been admitted to it who are singularly ill equipped for the responsibilities which members of the profession have to assume. Many suggestions have been made for remedying this state of things, some of which have only to be mentioned to be rejected. No one, I am sure, would desire that there should be any artificial or mechanical restriction upon our numbers, or anything which would convert the profession of the law into a limited and privileged caste. It has always been the pride of the profession that it opens its doors to merit alone. But there is merit and merit; and if the standards of the test imposed are too low, the result is as harmful to the entrant as to the profession itself. I have no doubt that entrance to tha profession for some years past has been too easy, and that this has brought very unhappy consequences in its train. There is such cut-

Why should not preliminary work on these lines be begun? Even a general survey of the ground to be covered would be productive of nothing but good; and, speaking with all respect, it seems to me that much would be gained if even points of difference could be ascertained and defined with reasonable precision. Suppose that a small group of men were gathered together and began this preliminary work; is it inconceivable that they might not hammer out a workable plan fit to be submitted later on to some representative body? In my judgment, a small number is essential, doing its business in private, for a workable constitution cannot be drafted by a public meeting. It does not seem to me a matter of great importance how the members of the group are selected provided that they are honest and capable men, respected for their high character, and known to represent different points of view; but of course their work would, as I have said, have to be submitted later on to a representative body who would have full powers of examination, criticism and amendment. The revised and amended draft, after this body had completed its labours, might, if thought desirable, be submitted to some form of general vote or referendum by a larger body still, but with power only to accept or reject; but in a country as vast as India, with a population in which unhappily the number of educated persons bears only too small a proportion to the whole, there are obvious objections which could be advanced against this last suggestion. A group of men such as I have described, strengthened by the presence of distinguished Indian lawyers, with political prepossessions for the moment laid aside and inspired by a firm determination to produce results fit to be submitted to the representative body, however elected or appointed, to which I have referred, might render service of incalculable value to their country. A lawyer ought from the nature of his training to be able to view political problems from a more detached standpoint than a man immersed in the day to day political struggle; and it is for that reason that I cannot doubt the immense importance of the part which members of

most vital of all the forces which have welded the American people into a great and mighty nation. You will find that lawyers played no less a part in framing the constitutional instruments of all the British Dominions, that Commonwealth of Nations which owes allegiance to the Crown. I cannot doubt therefore that lawyers will be found indispensable for the like purpose in India too; and it is in my judgment of great importance not only that this circumstance should be realised but that the reasons for it should also be known. I say this because from time to time I read things that are written and I hear things that are said from which it might be thought that constitution making is a comparatively easy task, if two or three leading personages met and found themselves more in agreement than they had hitherto supposed. I should like to think that this was so; bul I have had some experience of constitution making myself and I can assure you that it is a very hard and difficult task, requiring much intellectual labour and effort, a thorough grasp of constitutional history and principles, a certain ingenuity and flexibility of mind and, as important as anything else, infinite patience and a willingness to compromise when occasion requires. I hope that I am not putting my claims for the profession too high, if I say that many of these qualities, perhaps all of them, ought to distinguish the lawyer who hopes to attain eminence in the law; and some of them, if I may respectfully say so, are qualities more readily found among lawyers than among politicians. You will not, I hope, think me so foolish as to suppose that men who are lawyers, however eminent, and nothing more, could create a successful and workable constitution; it must be the work of statesmen also, skilled to interpret public opinion but capable also ot instructing public opinion and of leading it wisely. Lawyers are to be found among statesmen, as statesmen, are to be found among lawyers; and it is from a combination of all that is best in the qualities of both that a successful result is most likely to emerge.

the problems and difficulties which now affect the profession as a whole.

I regret greatly that I shall not be present to listen to Dr. Yousuf Hussain's paper on the "Government of India Act, 1935, and subsequent constitutional changes". I think that I should have asked for permission to join in the discussion which no doubt will follow the paper, because the subject is one in which I have a personal, and indeed I might almost say, a melancholy, interest. If the opportunity had offered itself I should also have been among the audience When Mr. Ram Lal Kishen's paper on "Modern Tendencies in English Law" was read as well as that of Mr. Ghouse on the "Evolution of the Basic Principles of Justice"; and I admire the latter's courage in attempting to compress within the limits of a paper a subject of such profound and far-reaching importance.

I have said that I neither desire nor intend to touch upon current politics, which would indeed be quite out of place in a conference of this kind. It does not seem to me, however, that I should be departing from that wholesome principle if I referred to the part which those of our profession will have to play in formulating and drafting any new constitution for India. I do not believe it possible to draft a successful constitution of Government without the aid of lawyers; and indeed I would go further than this and say that the aid which lawyers can give is not, and ought not to be, limited to the technical skill required to put a complicated legal instrument into clear and precise language. The part played by lawyers in the evolution of constitutional principles is a matter of historical record. The great constitutional struggles throughout thehistory of my own country were sustained and nourished by lawyers who brought to them not merely the readiness or rhetoric of the briefed advocate, but the passionate conviction of the jurist and the statesman. Lawyers played an important part in the drafting of that great instrument, the constitution of the United States, which, with the English language and the principles of the Common Law, is the

trines of which I have spoken is part of every lawyers's confession of faith; for we believe that they are a menace to civilization, a bar to all human progress and an insult to the dignity of man. By the very fact of our meeting here today we assert and vindicate the majesty and supremacy of the law, whose humble ministers and instruments we are. We testify to the unity of our profession and to the bond which unites us. And lastly, we come together, not for the purpose of boasting or vain-glory, but, recognizing the imperfection of all man's handiwork, to strive so far as lies within the power of each one of us to improve our knowledge of the Law, and to better its administration.

The list of papers which are to be discussed at the Conference is an impressive and formidable one and covers a wide range of topics. Some of them will appeal mainly to experts in particular branches of law; others are of a more general interest. I have examined the list with care, for the purpose of seeing whether I could not make one or two of the subjects selected the text, as it were, of this address; for I take it that you would prefer that I should deal within the limited time at my disposal rather with concrete issues than with those generalizations to which I have listened too often in my life at legal gatherings and which are apt to have, if my own experience is any guide, something of an irritant effect upon those who listen to them. I observe among the papers that there are one or two which deal with very important constitutional questions and, with your permission, I should like to say a word upon these, without invading that territory which politicians claim as their own. Then I observe too that the subject of Legal Education figures prominently in the list, and among the five professed aims and objects of this Conference no less than three have reference to this important subject. I shall therefore have no hesitation in saying something upon it, and I am the more ready to do because of the very strong opinion I have formed upon the relation between the subject of Legal Education in India and certain of

the attribute of character also. The profession of the law, we are told, attracts a greater number to its ranks than any other profession in India; why then should it lag behind the other professions in the promotion of mutual intercourse and those other advantages which only personal contact can give? The lawyers of each Province have no doubt their own organization; but it has often seemed to me that the autonomy of the Provinces, though doubtless productive of many benefits, has in some respects tended to provincialise men's point of view, if I may say so without offence; to concentrate attention upon the domestic character of this problem or that to the exclusion sometimes of their all-India aspect. Such a tendency is to be found among lawyers no less than among others; and there is no better antidote to it than gatherings such as we are inaugurating today.

There is another reason too why the idea of this Conference is to be welcomed, and especially at this moment in the march of human affairs. Today the war which has engulfed the greater part of the nations of the world seems at last to be approaching its crisis and to be drawing to its inexorable end, though we can see before us, alas, many months yet of blood and tears. The Allied Nations are fighting to destroy once and for all those evil doctrines, propagated in their own interests by a conspiracy of wicked men, that there is no law between nation and nation save that of brute force, and that the relations between citizen and citizen or citizen and State must be subject always to the caprice or tyranny of self-appointed dictators and their partners in crime. To these men law as we understand it and the rule of law, the determination of men's rights and duties according to known and settled principles, are abhorrent, to be destroyed and extirpated with every circumstance of indignity that malice or hatred can suggest. Force there must always be! at the disposal even of civilized States for the restraint of wrong-doers; but it must be the servant of justice, not its master. But to wage a truceless war against the doc-

ADDRESS

By

Sir Maurice Gwyer.

MR. CHAIRMAN AND BRETHREN IN THE LAW,

It is my first and very agreeable duty to express our thanks to His Exalted Highness the Chancellor and the authorities of the Osmania University for their invitation to this All-India Law Conference to hold its first session in this place, and to express our gratitude for all the arrangements which have been made for our comfort and well being. It is not the first time that I have delivered an address in this University, and I am no stranger to its generous hospitality; and there is only one thing which could mar my pleasure in speaking here once more, and that is the absence of my old friend Sir Akbar Hydari, who gave to this University and to this State such devoted service for so many years and who since my last visit has been gathered to his fathers, full of years and honours.

It is a most excellent thing that the lawyers in India should gather together from time to time to take counsel with one another and to encourage social relations with their fellow lawyers from all parts of the sub-continent. I confess to some surprise that there has never been an all-India gathering of this kind before; but I observe with pleasure and satisfaction that you contemplate regular biennial meetings hereafter. Those who are distinguished in other professions and sciences have long been accustomed to meet for the advancement not only of learning but of the common interests of the profession or body to which they belong. Law is both a science and a profession; and advocacy, which is one branch of the law, is unique among the arts in as much as it demands from those who practise it ot only the highest degree of skill and technical knowledge but

learned legal personality and I am sure that under his Presidentship the Conference will be able to arrive at results useful to the whole of the profession.

I thank you all for taking the trouble of coming over here from distant parts of India, and also from distant parts of this State. The difficulties imposed by war conditions have naturally resulted in many shortcomings for which I hope you will excuse the organization if, in enjoying its hospitality, you experience some inconveniences. Nothing, however, comes in the way of our extending to you all our heartiest welcome and I trust that our association in the work of this Conference, while it may have brought many friends together, will also create friendships which will endure.

I do not wish to stay any longer between you and your work, and request Nawab Sir Ahmad Sa'id Khan kindly to open the Conference, the patronage of which has been graciously accepted by His Exalted Highness. May he live long.

[Though printed after, this welcome address was read before H. E. the President, conveyed the Royal Message and delivered his own opening speech.]

The Deccan has been the abode of great lawyers and jurist in the past, during the Hindu period, the Muslim period and during modern times. I need only mention the names of ***Mitakshara*** and ***Tatarkhania***. We are in advance of the whole of India in the complete separation which His Exalted Highness has effected between the executive and the judiciary from the lowest up to the highest stages. Our University has been encouraging legal studies and the production of legal literature in the principal language of India, an important factor in any movement, to ensure a popular study of law. The Dairat-ul-Ma'arif has been publishing rare manuscripts of legal classics, and the work has won the recognition of Orientalists all over the world. The Majlis-e-Ihya-ul-Ma'arif an-nu'maniah has also acquired an honoured name in its endeavour to collect and edit the rare works of Muslim jurists, long considered lost to the world.

The Conference was fortunate in enlisting at the very outest the sympathies of eminent members of the profession from Peshawar, Lahore, Baghdad-ul-Jadid, Karachi, Bombay, Delhi, Allahabad, Patna, Calcutta, Dacca, Nagpur, Madras and Trivandrum. Leading Lights like Sir Maurice Gwyer, Sir C. P. Ramaswamy Ayar, Sir Abdul Qadir, Sir Tej Bahadur Sapru and others have been good enough to collaborate not to speak of a large number of others who have similarly helped and encouraged the idea of the Conference. Urgent engagements have prevented some from attending it, and we particularly regret the unavoidable absence of Sir Maurice Gwyer and Sir C P. Ramaswamy Ayar. The former was to deliver the inaugural address but has been prevented due to illness. We have, however his Address which we will have the privilege of hearing a little later. Sir C. P. Ramaswamy Ayar has similarly sent his Sectional Address which we will have the pleasure of hearing this afternoon. In Sir Abdul Kadir we have a charming and

WELCOME ADDRESS

By

Hon. Nawab 'Alam Yar Jung Bahadur,

Law Member, Executive Council, Hyderabad-Dn.

Your Excellency, Mr. President, Members of the Conference!

It is a matter of great pleasure to me to welcome the members of the All-India Law Conference on behalf of the Osmania University. I must also thank Nawab Sir Ahmad Said Khan for having agreed to open the Conference, and I am sure that I am speaking for all of you in extending to him also a hearty welcome in our midst. In view of the importance of the subject itself, not to mention prominent part which the profession has taken in public affairs, it is surprising that no serious effort was so far made to organize a Confercnce on an All-India scale. There have been some attempts, during the last four or five years, to convene a Law Teachers' Conference or a Lawyer's Conference in British India. Early in 1929, our own Law Union in the Un versity thought of having a local Law Conference on a modest scale wtth an intention gradually to raise it to an All-India body. Even the details of the programme were decided upon, but it did not materialise until this day.

We are at a most critical junctnre in the history of the world, and, with the contributions already made in so many fields by men belonging to the profession of law, it may well be expected of them that, in the making of a better world order for the future, they will make a substantial contribution. The aim and object of the Conference is to provide a venue for such allied and at the same time separate activities as the legislature and the class room, the bench and the bar. The more often they meet the more useful would it be for all.

adjustments, that there cae be more than one side to a question and that each side has something more than debating points to its credit. I attribute to this mental training the constructive part played by the profession not only in its own confined sphere but in larger fields of activity, whether political or social, which go to the making of public life. In these respects, India in particular owes much of its advance to the contributions made by lawyers. In our own State, the legal community forms part of that intelligentsia on which the public life of the State could increasingly depend for serving the public interests.

His Exalted Highness has aptly stressed the fundamental idea of a reign of law which must underly both the administration and the study of law and which must be the foundation of every Administration. The majesty of a conception which provides for the determination of the rights and obligations of every individual and of society as such before independent and impartial tribunals, exempting none, no matter of what class or community, from their scope or jurisdiction, is one indeed to be borne in mind equally by the administrator as well as the citizen. The duty devolves both on the Bench and the Bar to collaborate in the maintenance of this conception, while the full appreciation of its significance must be a task to be performed increasingly by those entrusted with the teaching of Law in the different Universities and Colleges in the country. The Osmania University has done much in the field of legal studies but much more remains to be done, and I have little doubt that the authorities of the University will give increasing attention to the needs of a Department of knowledge which touches so closely the public weal.

I have much pleasure in declaring this Conference open and wish all success to its deliberations.

———:x:———

I must thank the Chairman of your Reception Committee for the warm welcome that he has extended to me, it is a great pleasure being in your midst. The idea of having a law Conference on an All-India scale is a very happy one, and the selection of the venue has been equally suitable in that the Judiciary here has come into its own by the complete separation that it enjoys from the Executive.

To you who belong to the profession of Law, whether on the Bench or in the Bar or devoted to the teaching or study of Law in the class-room, I need say nothing of the importance of the subject or of the indispensability of a profession which administers or interprets a written code of human rights and obligations, governing the conduct of individuals or groups in a civilised society. From the point of view of a layman, however, or as an average citizen or as one with some experience of administration, it strikes me that the greatest function of law is to keep society and citizens together, to define, determine and maintain their relationship to each other and between themselves and, above all, to reflect the different needs of different times and the transformations that they undergo. Law is, thus, no static, but must, if it is to be an effective instrument in the governance of society, be a fundamentally dynamic conception. Administered and interpreted in that manner and legislated under that conception, and it can be the best means of social progress.

A popular misconception associates law with a species of pedantry which depends upon a jugglery of words, or with a mystery which only those can divine who form a caste for that specific purpose. Yet, unless legislators have themselves gone wrong, law is as much dependent upon, indeed, as much derived from common sense as any other subject, bearing in mind of course the necessity of a knowledge of its technique which also exists in other professions that are practised. It thus appears to me that legal training would, if at all, sharpen common sense and inculcate the invaluable lesson, so necessary for human

OPENING ADDRESS

BY

H. E. Nawab Ahmed Sa'id Khan Bahadur

President, Executive Council, Hyderabad—Dn.

GENTLEMEN,

It is my privilege at the outset to read out to you the gracious Message sent by His Exalted Highness on this occasion. Let us all receive it standing.

Message of H. E. H.

"I send my greetings to this first session of the All-India Law Conference. There exists in my Dominions the complete separation of the executive from the judiciary, and this separation is one of the basic features of my Administration. The High Court, endowed with my Charter, enjoys a position of dignity and independence as the highest Court in the State. A special Department for the study and teaching of Law has been created in the Osmania University and has been contributing not only to the personnel of my Judicial Service but also the Bar, the relations between which and the Bench have remained cordial.

"Underlying both the administration and the study of law is the fundamental idea of a reign of law which must be the foundation of every Administration. I trust that, in promoting a study of law and of its different aspects and in affording a medium for exchange of ideas, this Conference will not only succeed in creating popular interest in an academic study of law but also result in a full appreciation of its place in the life of a community."

H. E. the President Continued.

A very inspiring message indeed. Let us send, on behalf of this Conference, our grateful acknowledgment to our Patron for the guidance and encouragement that it gives. Let us also pray for his long life and prosperity.

GROUP PHOTO OF THE

Garden Party by H. E. the President of the Executive Council.

First All-India Law Conference, July, 1944, Hyderabad-Dn.

———:o:———

Seated from left :— 1. S. Sa'adatullah Hussaini, *(Vice Pres. Osmania Law Union.)* 2. C. T. Bhanagay, Nagpur. 3. Justice Khaliluzzaman. 4. Dr. Nazir Yar Jung Bdr. 5. Principal Siva Subramanian, Benares, (*Sec. Pres*). 6. Justice Husain Ahmed Beg. 7. Dr. Sir Amin Jung Bdr., (*Sec. Pres.*) 8. H. E. Sir Ahmed Sa'id Khan, *(President Executive Council)*. 9. Chief Justice Sir Abdul Qadir, Baghdadul-Jadid, (*General President of Law Conference*). 10. Hon. Alam Yar Jung Bdr., (*Law Member, President Reception Committee*). 11. Hon. Ghulam Muhamad, (*Finance Member*). 12. Chief Justice Bisheshwarnath. 13. Shaikh Hyder, (*Local Secretary, Law Conference*). 14. Dr. Hamid Ali, Madras. 15. Prof. Husain Ali Mirza, (*Head, Osmania Law Faculty*. 16. Bashiruddin, (*Secretary, Osmania Law Union*).

Standing from left :—1. Ghulam Hasan Ali, 2. Mustansir Ali, (*Vakil*). 3. Shaikh Muhiuddin, (*Vakil*). 4. Laxmi Narayan Prashad, (*Vakil*). 5. Razzaq Ali Khan, (*Vakil*). 6. Nazeer Ali, (*Advocate*) 7. Bala Prashad, (*Advocate*). 8. Prof. Latif Ahmad Faruqi 9. Sulaiman Muizzuddin, (*A. D. C.*) 10. Sadiq Husein, (*A. D. C.*) 11. Mahmud Abdul Qadeer, (*Secy. Salar Jung State*). 12. Abdullah Pasha, (*Advocate*). 13. Anwarullah Pasha, (*Vakil*). 14. Khaja Muhammad Ahmad. 15. Nawab Mir Akbar Ali Khan, (*Sec. Pres.*) 16. M. Abdur Raoof, (*Advocate*). 17. Raja Grudas Bdr. 18. Akhleq Husain Zubairi, (*Advocate*). 19. M. B. Dixit, Nagpur. 20. Prof. Akbar Ali Moosavi. 21. Dr. Mir Siyadat Ali Khan.
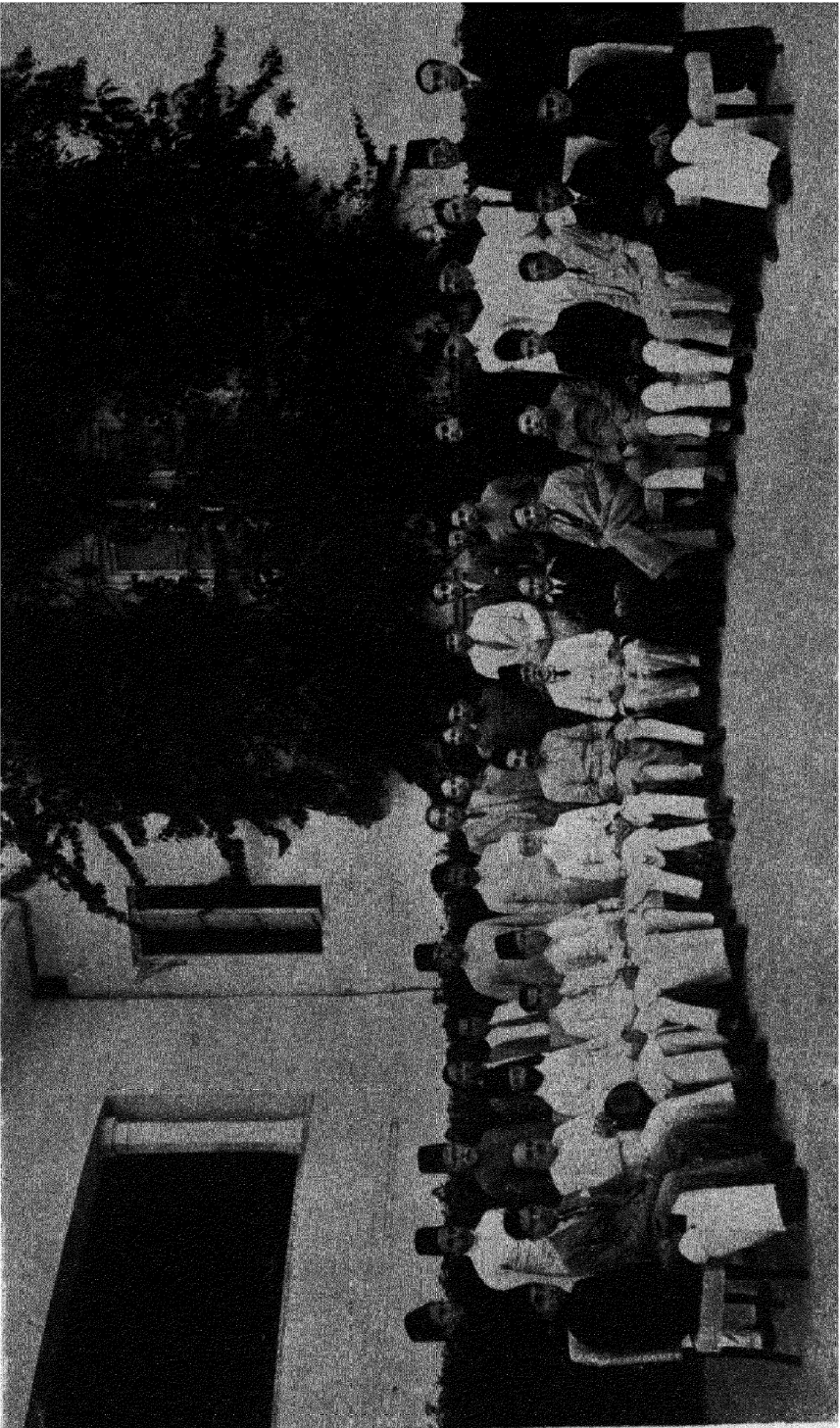
Part III.

25. General Scheme of Law Exhibition. 107
26. Welcome Address, by Hon. Bisheshwarnath, C. J. 168
27. Brief description of the Law Exhibition 170
28. List of Swiney Prize Books. 175
29. List of Tagore Law Lectures. 176

Part IV.

Urdu Section

Page.
1. 1
2. 1
3. 4
4. 7
5. 21
6. 31
7. 39
8. 48
9. 57
10. 66
11. ...rt,
.... 79
12. 86
13. ...iah 97
14. ...ompari-
.... 107
15. ...rincipal
.... 111
16. ...Dr. M.
Hamidullah 113
17. List of other papers contributed to the Conference.... 129

PART II.

18. Proceedings of the first All-India Law Conference.... 130
19. List of Donors and Members 135
20. Constitution & Fundamental Rules of the Conference. 150
21, Elections of Working Committee and Council 153
22. Programme of the Conference 155
23. Resolutions 157
24. Address on Certain Resolutions, by Dr. Nazir Yar Jung 160
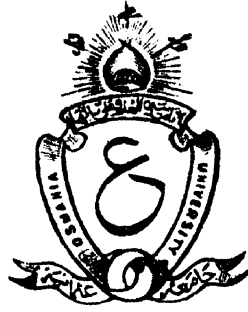
Proceedings

OF THE

First All-India Law Conference

Hyderabad-Deccan.

1944

Printed at
NIZAM SILVER JUBILEE PRESS
1945-6/1363-5